تحفۃ الطالب

شرح اردو

مؤطا امام مالکؒ

از کتاب الاشربة تا کتاب اجرة الحجام

شرح اردو

موطا امام مالکؒ

"از کتاب الاشربہ تا باب اجرۃ الحجام"

مرتب

مولانا محمد عباس قاسمی

ناشر

مکتبہ مدنیہ دیوبند

تحفۃ الطالب

شرح اردو

مؤطا امام مالکؒ

مرتب

مولانا محمد عباس قاسمی

سن طباعت ۲۰۲۲ء

صفحات ۳۶۰

باہتمام زبیر عبدالحق مدنی

کمپوزنگ محمد محسن دیوبند 9045237896

مطبع مدنی پرنٹرس اینڈ پبلشرز، دیوبند موبائل: 9897915323

قیمت:

المکتبۃ المدنیۃ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین

كِتَابُ الْجَامِعِ ۵۱

تقریظ

حضرت اقدس مولانا ومفتی راشد صاحب اعظمی

نائب مہتمم واستاذِ حدیث دار العلوم دیو بند

نحمدہٗ ونصلي علیٰ رسوله الکریم

مؤطا امام مالکؒ حدیث پاک کی اہم کتاب ہے، ہر دور میں امت نے اس کی اہمیت اور افادیت کو تسلیم کیا ہے، دار العلوم دیو بند میں صحاحِ ستہ کے ساتھ دورۂ حدیث شریف میں یہ کتاب بھی داخل ہے۔

اب مجلسِ شوریٰ نے اس کے سابقہ نصاب کو بدل کر بعض اہم ابواب نصاب میں شامل کیے ہیں، جو کتاب کے آخری حصہ میں ہیں۔ اکثر شروحات وہاں تک نہیں پہنچ سکی ہیں۔

بڑی خوشی کی بات ہے، مولانا محمد عباس صاحب بدایونی نے موجودہ نصاب کے مطابق اس کی شرح لکھی ہے، شرح میں الفاظ کی تحقیق، مطالب کی وضاحت، مسالک کی تفصیل اور ان کے دلائل وترجیحات وغیرہ کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کیا ہے، جو ان شاء اللہ شائقین حدیث اور خاص طور پر طلبائے حدیث کے لیے کار آمد اور مفید ثابت ہوگی۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ عزیز موصوف کی اس خدمتِ حدیث پاک کو شرفِ قبولیت سے نوازے۔ آمین

محمد راشد اعظمی
دار العلوم دیو بند
۹/۲/۱۴۳۶ھ

تقریظ

حضرت مولانا ومفتی عبداللہ معروفی صاحب

استاذِ حدیث ونگراں شعبۂ تخصص فی الحدیث دارالعلوم دیوبند

حامداً ومصلیًا ومسلّمًا وبعد: پیش نظر کتاب مؤطا امام مالکؒ بروایت یحییٰ اندلسی کے اس حصہ کی شرح ہے جو فی الحال اُمّ المدارس دارالعلوم دیوبند کے نصابِ تعلیم میں شامل ہے، مؤطا امام مالکؒ ان کتبِ حدیث میں ہے جو ابتدائی دَورِ تدوینِ حدیث میں تصنیف کی گئی ہیں، احادیثِ مرفوعہ کے علاوہ آثارِ صحابہؓ وتابعینؒ اور خود امام مالکؒ کی فقہی آراء کا ایک معتد بہ مجموعہ اس کتاب میں موجود ہے، جس کی وجہ سے اس کتاب کو دیگر کتبِ حدیث پر امتیاز حاصل ہے اور کسی بھی منتہی نصاب تعلیم میں اس کی شمولیت ضروری قرار دی جاتی ہے، اس کے بغیر وہ نصاب اُدھورا مانا جاتا ہے۔

عزیزم جناب مولانا محمد عباس بدایونی زید مجدہٗ دارالعلوم دیوبند کے نئے ہونہار فضلاء میں ہیں، انہوں نے حالیہ لاک ڈاؤن کے زمانۂ فترت کو غنیمت جانتے ہوئے مؤطا شریف کے اس حصہ کی اُردو زبان میں شرح لکھ دی جو اس وقت دارالعلوم دیوبند میں پڑھایا جاتا ہے، بندہ نے مختلف مقامات پر نظر ڈالی، ماشاء اللہ مواد، اسلوبِ بیان اور زبان وادب ہر لحاظ سے کتاب قابلِ قدر نظر آئی، اللہ تعالیٰ اپنی بارگاہ میں قبولیت کے ساتھ طبقہ علماء وطلبہ میں بھی اس کو مقبولیت عطا فرمائے اور مؤلف سلّمہٗ اللہ کو مزید علمی کاموں کی توفیق مرحمت فرمائے۔ فقط

عبداللہ معروفی غفرلہٗ

۱۳/۵/۱۴۴۳ھ

مُقَدِّمَۃ

حضرت مولانا و مفتی محمد مزمل صاحب بدایونی

استاذِ تفسیر و فقہ دار العلوم دیوبند

امام دار الہجرت حضرت امام مالک ابنِ انس اصبحی رحمہ اللہ تعالیٰ عظیم فقہاء و محدثین میں سے ہیں، فن حدیث میں آپ کی عظمتِ شان کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ آپ کے اساتذہ و شیوخ کی تعداد نو سو بیان کی جاتی ہے، جن میں تین سو تابعین اور چھ سو تبع تابعین ہیں، لیثؒ، ابنِ مبارکؒ، امام شافعیؒ اور امام محمدؒ جیسے مشاہیر امت و اساطین علم و اجتہاد آپ کے تلامذہ میں سے ہیں، صحت سند فن حدیث میں بنیاد اور کلید ہے، جس قدر سنت اوصاف صحت کی حامل ہوگی، اتنا ہی اس کا مقام عالی و بالا ہوگا، اس اعتبار سے بھی امام مالکؒ کا اسمِ گرامی سرفہرست ہے اور مشہور قول کے مطابق اصح الاسانید "مالك عن نافع عن ابن عمر" ہی ہے، اگرچہ اصح الاسانید کے مصداق میں اختلاف ہے۔

یوں تو حضرت الامام نے کئی کتابیں تصنیف فرمائی ہیں اور آپؒ کی ہر کتاب مضبوط و معتبر؛ بلکہ کتبِ حدیث و فقہ میں بنیاد مانی جاتی ہے، تاہم جو قبول و احترام حضرت کی کتاب "الموطا" کو حاصل ہوا اس کی شان تو الگ ہی ہے، موطا کی وجہِ تسمیہ میں کئی باتیں کہی گئی ہیں، ایک اہم وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ آپ نے یہ کتاب لکھنے کے بعد ستر فقہاءِ کرام کے سامنے پیش کی اور سب نے اس سے مواطات (موافقت) ظاہر کی، اس وجہ سے اس کا نام موطا رکھا گیا۔

از روئے فن حدیث موطا پر نظر ڈالی جائے تو اس میں مرفوع احادیث کے ساتھ مرسل احادیث بھی ہیں، اقوالِ صحابہؓ و تابعین بھی لے آتے ہیں، حافظ ابنِ حجر عسقلانی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''مزجه بأقوال الصحابة وفتاوىٰ التابعين ومن بعدهم''.

(مقدمہ فتح الباری: ص/ ۴)

جہاں تک اس کی اسانید کا تعلق ہے تو اس حوالے سے حضرت شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:

''ليس فيه مرسل ولا منقطع إلا وقد اتصل السند به من طرق أخرىٰ''.

(حجۃ اللہ البالغہ: ص/ ۱۳۳ جلد اوّل)

کہ اس میں کوئی مرسل اور منقطع روایت ایسی نہیں ہے جو دوسرے طرق سے متصل نہ ہو چکی ہو۔

صحت کے اعتبار سے حضرت امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے موطا کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''ما علىٰ ظهر الأرض كتاب بعد كتاب الله أصح من كتاب مالكؒ''.

(مقدمہ شرح الزرقانی علی الموطا)

روئے زمین پر کوئی کتاب قرآنِ کریم کے بعد موطا سے زیادہ صحیح نہیں ہے۔ اگرچہ علماء نے اس کے بارے میں فرمایا ہے کہ: حضرت امام شافعیؒ کا یہ قول صحیحین کے لکھے جانے سے پہلے کا ہے، صحیحین کی تصنیف کے بعد کتبِ حدیث میں اعلیٰ مقام پر یہی فائز ہیں، یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت امام شافعیؒ نے یہ بات اقدم ہونے کے لحاظ سے فرمائی ہے؛ لیکن حضرت کا یہ قول موطا کی عظمتِ شان پر بہر حال سند ہے۔

ایک دو سال قبل دار العلوم دیو بند کے اربابِ انتظام نے یہ تجویز فرمایا کہ دار العلوم کے دَورۂ حدیث شریف میں بعض کتبِ حدیث تو روایت و درایت دونوں اعتبار سے بالتفصیل مکمل پڑھائی جاتی ہیں؛ لیکن جو کتب مکمل نہیں پڑھائی جاتیں اُن میں تمام کتابوں سے ابواب کا انتخاب اِس طرح کیا جائے کہ طلبہ کی نظر میں تمام ابواب بالتفصیل کسی نہ کسی کتاب میں آجائیں، اس سلسلے میں موطا امام میں سے ''از کتاب الاشربہ تا باب اجرۃ الحجام'' کا انتخاب کیا گیا۔

اُردو زبان میں ان منتخب ابواب کی تشریح وتوضیح کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے دار العلوم دیوبند کے باصلاحیت وہونہار فاضل مولوی محمد عباس بدایونی سلّمہٗ نے ایک اچھی شرح تالیف کی ہے، بندہ نے کتاب کا اکثر حصہ دیکھا ہے، بندہ کا احساس ہے کہ موصوف نے خاصی محنت سے کام کیا ہے، ہر باب کے شروع میں باب سے متعلق ضروری اُمور ذکر کیے ہیں، مسالکِ ائمہ، مستدلات اور راجح کے وجوہِ ترجیح کو معتبر کتب وشروحِ حدیث سے جمع کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ موصوف کی یہ کاوش طلبہ وعلماء کے لیے مفید ہو اور عنداللہ شرفِ قبول حاصل کرکے ذخیرۂ آخرت بنے۔ آمین یارب العالمین

محمد مزمل بدایونی غفرلہٗ
خادم تدریس دار العلوم دیوبند
۱۶/ ۳/ ۱۴۴۲ھ - ۳/ ۱۱/ ۲۰۲۰ء

پیشِ لفظ

امام دار الہجرت ابوعبداللہ مالک ابنِ انس رحمہ اللہ کی کتاب ''موطا'' حدیث کی نہایت اہم کتاب شمار کی جاتی ہے، قدمائے محققین اور بعض ائمہ متاخرین نے ''موطا'' کو بخاری شریف سے بھی مقدم اور اہم قرار دیا ہے؛ اس لیے مادرِ علمی دار العلوم دیو بند کے دَورہ حدیث میں موطا داخلِ نصاب ہے۔

دَورہ حدیث کے نصاب میں متعدد کتب صرف ''ابواب الطہارۃ'' تک ہوتی تھی اور بقیہ ابواب باقی رہ جاتے تھے: اس لیے مجلسِ شوریٰ نے دو سال قبل انتہائی اہم فیصلہ لیتے ہوئے نصاب میں جزوی تبدیلی فرمائی، جس میں مختلف کتب کے مختلف ابواب کو منتخب کر کے شاملِ نصاب کیا گیا، جس میں ''موطا امام مالکؒ'' کا نصاب ''کتاب الاشربہ'' تا ''باب اجرۃ الحجام'' طے پایا، یہ حصہ چونکہ ماقبل میں داخلِ نصاب نہیں تھا؛ اس لیے اس کی کوئی مناسب اُردو شرح دستیاب نہیں تھی۔ رفیق محترم مولانا شعیب عالم قاسمی سکندر پوری اور بعض دوستوں نے اس طرف توجہ دلائی تو بندہ نے زمانۂ فترت (لاک ڈاؤن) کو غنیمت جانتے ہوئے بسم اللہ کردی اور خدا کے فضل وکرم سے موطا کے منتخب ابواب کی یہ شرح آج آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

شرح کی ترتیب میں عبارت بااعراب تحریر کرنے کے بعد سلیس اُردو میں بامحاورہ ترجمہ کیا گیا ہے، پھر حدیث کی جامع تشریح کے بعد مسائل کو تفصیل سے قلم بند کیا ہے، بعدۂ مختلف فیہ مسائل میں مذاہبِ ائمہ مع الدلائل نقل کرنے کے بعد حنفی نقطۂ نظر کی وجہ ترجیح کو مدلل پیش کیا گیا ہے، حدیث کے مشکل الفاظ کے لغوی اور مرادی معنیٰ کو بھی واضح کیا ہے؛ نیز جابجا احادیث کے ذیل میں فوائد کے عنوان سے بہت سی قیمتی نصیحتیں بھی ذکر کی گئی ہیں۔

اللہ رب العزت جزائے خیر عطا فرمائے اُن مصنفین ومؤلفین کو جن کی کتب اِس شرح

میں معاون بنیں، شکر گزار ہوں اُن اساتذہ کا جنھوں نے اپنے قیمتی اوقات سے وقت نکال کر شرح پر نظر فرمائی اور حوصلہ افزا کلمات تحریر فرما کر کتاب کے اعتبار میں اضافہ فرمایا۔

ممنون کرم ہوں اُن تمام حضرات کا جنھوں نے کسی بھی قسم کے تعاون سے نوازا، خصوصاً میرے برادر مکرم راغب علی خان صاحب کا، جنھوں نے کتب کی فراہمی کے لیے قیمتی لیپ ٹاپ بطور ہدیہ عنایت فرمایا نیز برادرم ضیاء الرحمٰن، برادرم طلحہ اور برادرم عاطف کا مشکور ہوں، جو کتاب کی طباعت کا تقاضا کرتے رہے۔

خدائے بزرگ و برتر تمام حضرات کو خیرِ کثیر سے نوازے اور بندہ کی اس ادنیٰ کاوش کو شرفِ قبولیت عطا فرما کر قارئین کے لیے نفع بخش بنائے اور میرے لیے ذریعۂ آخرت بنائے۔ آمین

مفتی محمد عباس قاسمی

۱۹/ جمادی الاوّل ۱۴۴۳ھ مطابق ۲۴/ دسمبر ۲۰۲۱ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حیات امام مالکؒ

فقیہ اعظم، محدث کبیر مذہبِ مالکیہ کے بانی وروحِ رواں، ابوعبداللہ حضرت امام مالک بن انس ۹۳ھ میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے، آپؒ کا سلسلۂ نسبت مالک بن انس بن مالک بن ابی عامر سے خالص عرب تھے، آپ کا خاندان جاہلیت اور اسلام دونوں معزز ومحترم سمجھا جاتا تھا، آپ کے جدامجد ابو عامر کا شماران جاں باز صحابہ کرام میں ہوتا ہے جنہوں نے جنگِ بدر کے علاوہ بقیہ غزوات میں آپؐ کے ہمراہ شرکت کی تھی۔

امام مالکؒ کی پیدائش ایک علمی گھرانے میں ہوئی اور مدینہ منورہ اس وقت علماء وفضلاء کا مسکن اور گہوارہ تھا؛ اسی لیے بچپن ہی سے امام صاحب کو کبار محدثین وعلماء کے سامنے تلمذ کا شرف حاصل ہوا، آپؒ کے اساتذہ کی فہرست میں سب سے نمایاں نام نافع مولیٰ ابنِ عمر کا ہے، جن سے آپ ابتدائی تعلیم سے لے کر علمِ حدیث کا درس بھی لیا؛ چونکہ مدینہ میں علماء اور محدثین کی ایک بڑی تعداد موجود تھی اور جگہ جگہ ماہرینِ فن کی مجلسیں قائم تھیں، بس آپ کو تحصیلِ علم کے سلسلہ میں مدینہ سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہ آئی۔

امام مالکؒ کے مشہور شیوخ واساتذہ کی فہرست میں یہ نام آتے ہیں: ربیعۃ الرائے، زید بن اسلم، نافع مولیٰ ابنِ عمر، ابنِ شہاب زہری، ابوالزناد، مالک بن عبداللہ حمید الطویل، سعید بن ابی سعید المقبری۔

مجلسِ درس:

اپنے شیوخ واساتذہ کے علم وفضل کے جس نور سے امام صاحب نے اپنے قلب کو منور کیا تھا اب اس کی روشنی کو چہار دانگ عالم میں پھیلانے کا ارادہ فرمایا اور ۱۱۷ھ میں

آپ نے اپنی مجلسِ درس قائم کی، آپؒ کی درس گاہ ایک امتیازی شان رکھتی، جہاں قیمتی قالین اور تکلف فرش بچھائے جاتے، عود اور لوبان جلانے کا اہتمام کیا جاتا تھا اور صفائی کا اہتمام اِس قدر ہوتا کہ ایک تنکا بھی بارِ خاطر ہوتا تھا، جب آپ درس گاہ تشریف لاتے تو وضو یا غسل کر کے عمدہ لباس زیبِ تن فرماتے اور خوشبو استعمال فرماتے اور درمیان میں بیٹھ کر حدیث کا املاء کراتے، جب آپ گویا ہوتے تو مجلس پر سکوت طاری ہوجاتا اور تمام تلامذہ سرنگوں ہوکر انتہائی ادب کے ساتھ علمی موتیوں کو چننا شروع کر دیتے۔

تلامذہ:

آپ کے تلامذہ کی صحیح تعداد کا اندازہ لگانا تو مشکل ہے؛ لیکن آپ کے شاگردان کی فہرست میں چند ایسی نمایاں شخصیات ہیں جن کو بعد میں ساری دنیا نے قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا اور امام، مقتدا اور رہنما تسلیم کیا، ان میں سے بعض کے اسماء درج ذیل ہیں:

امام شافعیؒ، امام محمد بن حسن شیبانیؒ، عبداللہ بن وہبؒ۔

آپ کے بعض رفقاء اور معاصرین نے بھی آپ سے کسبِ فیض کیا ہے، مثلاً امام اوزاعیؒ، سفیان بن عیینہ، ابنِ جُریج، امام ثوریؒ، لیث بن سعدؒ۔

تالیفات:

مؤطا امام مالکؒ آپ کی جلیل القدر تالیف ہے، جسے اقدم الکتب فی الحدیث کا درجہ حاصل ہے، اس کے علاوہ آپ کی تصنیفات یہ ہیں:

''الرد علی القدریہ''

''الرسالہ إلی الرشید''

''المدونۃ الکبریٰ''

آپ کے بارے میں علماء کی شہادت:

امام فنِ رجال وحدیث کے امام یحییٰ ابنِ معینؒ فرماتے ہیں کہ: مالکؒ امیر المؤمنین فی

الحدیث ہیں۔ سفیان بن عیینہؒ کہتے ہیں: ہم لوگ امام مالکت کے سامنے کوئی چیز نہیں، ہم تو سب ان کے پیرو ہیں۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ: جب حدیث آئے تو امام مالکؒ ستارہ ہیں۔

وفات:

آخر عمر میں آپ بہت زیادہ ضعیف اور ناتواں ہو گئے تھے، مسجد میں حاضری دشوار ہوگئی؛ لیکن مجلسِ درس وافتاء قائم رہی؛ لیکن موت سے تین ہفتے پہلے ضعف مزید بڑھ گیا اور ۱۱ ربیع الاوّل ۱۷۹ھ علمِ حدیث کا ایک روشن ستارہ ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا، آپ نے چھیاسی برس کی عمر پائی۔ ۱۱۷ھ ہجری میں مسندِ درس پر قائم ہوئے، ۶۲ سال خدمتِ علم دین میں مصروف رہ کر خلدیں بریں کے مکیں ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ.

كِتَابُ الْأَشْرِبَةِ

الأشربة: جمع شراب، وهو مايشرب من ماء وغيره من المائعات.

اشربہ: شراب کی جمع ہے، شراب عربی میں ہر اس مشروب کو کہتے ہیں جسے پیا جائے خواہ مائی ہو یا کوئی دوسری چیز، خواہ حلال ہو یا حرام اور اُردو میں شراب سے مراد حرام مشروب ہوتا ہے اور یہاں امام مالکؒ نے شراب حرام کو ہی مراد لیا ہے۔

کھانے پینے کی چیزوں میں شریعت کا ایک بنیادی اُصول ہے جسے قرآن میں بیان کیا گیا ہے: ﴿وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ﴾ اس بناء پر مشروبات میں جو طیبات ہیں یعنی پاکیزہ مرغوب، خوشگوار اور نفع بخش چیزیں مثلاً حلال چوپایوں کا دودھ، پھلوں کا رس، نفیس عرقیات یہ سب حلال قرار دیئے گئے ہیں، اس کے برعکس جو مشروبات خبیث اور انسانیت کے لیے مضر ہیں وہ حرام قرار دیئے گئے ہیں، مذکورہ کتاب میں انہیں خبیث مشروبات کی تفصیل، ان کے احکام، وعیدیں اور حدود وغیرہ کے متعلق احادیث وآثار بیان کیے گئے ہیں۔

وضاحت: امام مالکؒ نے اوّلاً حدخمر، اور اس کے بعد خمر کی تفصیل سے متعلق حدیثوں کی تخریج کی ہے؛ لیکن ذیل میں سہولت کے پیش نظر ترتیب مذکور کے خلاف مسائل کو ذکر کیا جارہا ہے، کتاب الاشربہ میں چند مسائل تحقیق طلب ہیں:

(۱) خمر وغیر خمر کی تحقیق (۲) حد خمر (۳) دو چیزیں جمع کر کے نبیذ بنانے کا حکم (۴) نبیذ بنانے والے برتن

خمر اور غیر خمر کی تحقیق اور اختلافِ فقہاء

حرام شرابیں چار ہیں:

(۱) **خمر:** انگور کا کچا شیرہ جب وہ جوش مارنے لگے اور جھاگ آنے لگیں (البتہ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک جھاگ آنا شرط نہیں) اور یہی حقیقتِ خمر ہے، اس کا حکم یہ ہے کہ اس کا قلیل وکثیر سب بالاجماع حرام ہے، اس کی حرمت قرآن اور متعدد احادیث سے ثابت ہے، اس کی ذات حرام ہے، نشہ ہونے پر موقوف نہیں، یہ ناپاک بہ نجاستِ غلیظہ ہے، اس کو حلال قرار دینے والا کافر ہے؛ کیوں کہ اس کی حرمت نصِ قطعی سے ثابت ہے، خمر مسلمان کے حق میں مالِ متقوم نہیں ہے، پس اس کو ضائع یا غصب کرنے کی صورت میں کوئی ضمان نہیں ہوگا، اس کو پینے والے کو حد لگائی جائے گی خواہ نشہ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔

(۲) **طلاء:** یعنی شیرۂ انگور جب پکایا جائے یہاں تک کہ دو تہائی سے کم اُڑ جائے۔

(۳) **نقیع التمر:** یعنی چھوارے پانی میں بھگو دیئے جائیں اور ان کی شیرینی اس میں نکل آئے اور اتنی دیر تک چھوڑ دیا جائے کہ اس میں اُبھان آجائے اور تند ہو کر مسکر ہو جائے، اس کو سکر بھی کہتے ہیں۔

(۴) **نقیع الزبیب:** کشمش یا منقی پانی میں بھگو دیا جائے، پھر جب وہ گل جائے اور اس میں جوش پیدا ہو جائے اور اس میں نشہ آجائے۔

مذکورہ تینوں شرابوں کا حکم ائمہ ثلاثہؒ اور احنافؒ میں سے امام محمدؒ کے نزدیک بعینہٖ خمر کا حکم ہے، اس کے قلیل وکثیر پینے والے پر حد جاری کی جائے گی۔

اور شیخینؒ کے نزدیک بھی مذکورہ تینوں چیزوں کا قلیل وکثیر حرام ہے؛ مگر ان کی حرمت درجہ دوم میں ہے بعینہٖ خمر عنب کی طرح نہیں ہے؛ چنانچہ اس کے حلال کہنے والے کو کافر نہیں کہا جائے گا، اور ان کے پینے پر حد اس وقت لگائی جائے گی جب نشہ آجائے، ان کی بیع درست ہے اور ہلاک کرنے والے پر امام اعظمؒ کے نزدیک ضمان واجب ہے، صاحبینؒ کے نزدیک نہیں ہے۔

ان کے علاوہ نشہ آور نبیذوں کا حکم:

مذکورہ چاروں قسم کی شراب کے علاوہ گیہوں، جو، شہد، مکئی وغیرہ کی شراب امام اعظمؒ کے نزدیک حلال ہے، اور اس کی تھوڑی مقدار پینے والے کو حد نہیں ماری جائے گی جبکہ اس کی غرض عبادت پر قوت حاصل کرنا ہو، اور جو شخص ان شرابوں سے مست ہو کر بیوی کو طلاق دے تو وہ طلاق واقع نمی شود؛ لیکن جمہورؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک مذکورہ تمام نبیذیں بھی حرام اور خمر کے حکم میں ہیں۔

جمہور کے دلائل:

عن ابن عمر رضي الله عنهما قال سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقول: كل مسكر حرام. (ترمذی:۲)

عن عائشة رضِي الله عنها أن النبي صلى الله عليه وسلم سئل عن البتع، فقال: كل شراب أسكر فهو حرام. (ترمذی)

بتع شرابِ عسل کو کہتے ہیں۔

عن جابر بن عبدالله رضي الله عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: ما أسكر كثيره فقليله حرام. (ترمذی)

ان احادیث سے صراحۃً ہر نشہ آور چیز کی قلیل و کثیر مقدار حرام معلوم ہوتی ہے۔

عن النعمان بن بشير قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم إن من العنب خمرًا وإن من التمر خمرًا وإن من العسل خمرًا وإن من البر خمرًا وإن من الشعير خمرًا.

اس حدیث میں تمام قسم کی نبیذیں اور شرابیں خمر قرار دی گئی ہیں۔

نیز جمہورؒ نے لغت سے بھی استدلال کیا ہے کہ خمر مخامرۃ العقل سے مشتق ہے جس کے معنیٰ عقل کو چھپا لینا ہے، اور یہ بات ہر مسکر میں پائی جاتی ہے؛ لہٰذا ہر مسکر بلا تفصیل و تفریق حرام ہوگا۔

امام اعظمؒ کے دلائل:

(۱) احنافؒ اہلِ لغت کے اقوال سے دلیل پیش کرتے ہیں؛ کیونکہ کسی چیز کی حقیقت لغت ہی سے معلوم کی جاسکتی ہے اور تمام اہلِ لغت کا اتفاق ہے کہ خمر ایک خاص شراب کا نام ہے؛ چنانچہ حكى ابن منظور في اللسان عن أبي سيدة أنه عرفه: الخمر ما أسكر من عصير العنب والجمع خمور؛ اسی لیے عام استعمال میں خمر بولنے سے خاص شراب مراد ہوتی ہے، جبکہ دوسری شرابوں کے لیے دوسرے ناموں کا اطلاق ہوتا ہے جیسے نبیذ، نقیع، سکر وغیرہ۔

أخرج عبدالرزاق في مصنفه عن ابن مسيب مرسلًا قال قال النبي صلى الله عليه وسلم: الخمر من العنب، والسكر من التمر والمِزر من الذرة والغبيراء من الحنطة والبتع من العسل، كل مسكر حرام.

(مصنف عبدالرزاقؒ: ۹/ ۲۳۴)

(۳) واخرج عبدالرزاق أيضا عن ابن عمر في قصة قال: أما الخمر فحرام لاسبيل إليها وأما سواها من الأشربة فكل مسكر حرام.

اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے تمام اشربۂ مسکرہ کو خمر نہیں کہا جاتا ہے۔

اوپر کے دلائل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ خمر کی ایک جدا حقیقت ہے اور وہ ایک مخصوص مشروب کو کہتے ہیں۔

اعتراض:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم الخمر من هاتين الشجرتين النخلة العنبة.

(أخرجه الجماعة إلا البخاري)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ طلاء، نقیع، تمر، نقیع ذبیب بھی خمر ہیں، پس حرمتِ شُرب اور نجاست میں ان تینوں کا حکم خمر کی طرح ہوگا، ان کا قلیل وکثیر سب حرام ہوگا اور ناپاک سمجھا

جائے گا، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ہمارے نزدیک بھی ان شرابوں کا یہی حکم ہے؛ لیکن ان کی حلت کے قائل کو کافر نہیں کہا جائے گا اور اس کے پینے پر نشہ نہ آنے کی صورت میں حد نہیں لگائی جائے؛ کیونکہ ان کی حرمت خبرِ واحد ظنی سے ثابت ہے یعنی اس میں ایک گونہ شبہ ہے اور شبہات حدود کو ختم کر دیتے ہیں، اسی طرح دلیلِ ظنی کا منکر کافر نہیں ہے؛ بلکہ فاسق ہے۔

البتہ ان چاروں اشربہ کے علاوہ باقی اشربہ محرمہ کو خمر کہنا بطورِ مجاز ہے؛ چونکہ علتِ جامعہ سکر ہے، پس ان کی قدر غیر مسکر حرام نہیں ہوگی، اس کی دلیل ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

عن ابن عباس (رضي الله عنهما) قال: حرمت الخمر بعينها قليلها وكثيرها والسكر من كل شراب وفي رواية عن ابن عباس (رضي الله عنهما) بلفظ حرمت الخمر قليلها وكثيرها وما اسكر من كل شراب.

(رواه النسائي)

اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں: (۱) جمیع اشربہ مسکرہ کو خمر نہیں کہا جاتا؛ ورنہ خمر کو دوسرے اشربہ محرمہ سے الگ ذکر کرنے کا کوئی معنیٰ نہیں ہے (۲) حرام لعینہٖ جس کا قلیل کثیر حرام ہے، وہ صرف خمر ہے، دیگر اشربہ لعینہٖ حرام نہیں؛ بلکہ سکر پائے جانے پر حرام ہوں گے، یہی امام ابوحنیفہؒ کا مذہب ہے، تاہم حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا ہے اگر قلیل غیر مسکر سے تقوی علی العبادۃ کی نیت نہ ہو تو یہ قلیل مفضی الی الکثیر ہوگا اور یہ حرام کا سبب بن جائے گا، پس سبب الحرام حرام کی بناء پر اس قلیل کو حرام بھی کہیں گے۔

جمہورؒ کے دلائل کی توجیہ:

جمہورؒ نے جن روایات کی بنیاد پر ہر شراب کو خمر قرار دیا ہے: وہ سب روایات بیانِ الحاق کے لیے ہیں؛ کیونکہ اگر تمام شرابیں لغۃً خمر ہوتیں تو ان روایات کی ضرورت کیا تھی؟ صحابہ رضی اللہ عنہم اہلِ لسان تھے، وہ خمر کے معنیٰ جانتے تھے، لہٰذا تمام چیزوں کو الگ الگ

ذکر کرنے کا مقصد یہی ہے کہ اصل خمر صرف شیرۂ انگور ہے اور بقیہ مشروبات نشہ پائے جانے کے وقت خمر کے حکم میں ہوں گے۔

تنبیہ: لیکن احناف کے نزدیک بھی فتویٰ امام محمدؒ کے قول پر ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ملت کی تنظیم کا یہی تقاضا ہے کہ تمام نشہ آور اشیاء کو ممنوع قرار دیا جائے؛ کیونکہ نشہ آور اشیاء کی خاصیت یہ ہے کہ ان کا تھوڑا زیادہ کی دعوت دیتا ہے، نیز لوگ اصل شراب کو دیگر نام دے کر استعمال کرنے لگے ہیں، لہٰذا معاشرتی اصلاح کا تقاضا ہے کہ حرمت کا مدار بالقوۃ نشہ آور ہونے پر رکھا جائے۔

بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ احنافؒ کے نزدیک اصل خمر صرف ماء العنب ہے، بقیہ مسکرات کو خمر کہنا بطورِ مجاز ہے اور ان میں ظنیت کے شبہ سے سقوط حد ہوتا ہے۔
(تکملہ فتح الملہم، الکوکب الدری، تحفۃ الالمعی، مبسوط سرخسی، اعلاء السنن)

حدِ خمر کا بیان

گزشتہ بحث میں خمر، اس کے اقسام اور ان کے احکام تفصیل سے آچکے ہیں، اب حدِ خمر کو بیان کیا جا رہا ہے۔

جاننا چاہیے کہ شارِبِ خمر پر حد لگائے جانے کے بارے میں علماء کا اتفاق اور اجماع ہے جیسا کہ علامہ ابنِ دقیق العیدؒ، امام نوویؒ، قاضی عیاضؒ وغیرہ سے نقل کیا گیا ہے؛ لیکن حدِ خمر کی مقدار کے بارے میں اختلاف ہے۔

امام ابوحنیفہؒ، سفیان ثوریؒ، امام مالکؒ اور امام احمدؒ کی ایک روایت کے مطابق حدِ خمر کی مقدار اَسّی کوڑے ہیں، مرداویؒ نے "الانصاف" میں فرمایا ہے: یہی مسلک تمام صحابہؓ، امام اوزاعیؒ، عبید اللہ بن حسنؒ اور حسن بصریؒ کا ہے۔

اور امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کی ایک روایت میں حدِ خمر کی مقدار چالیس کوڑے ہے۔

امام شافعیؒ کا استدلال مسلم شریف کی روایت سے ہے: عن أنس بن مالك أن

النبي صلى الله عليه وسلم أتي برجل قد شرب الخمر، فجَلَدَه بجريدتين، نحو أربعين. (مسلم شريف:۱۲)

جمہورؒ کا استدلال عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے ہے: عن عبدالله بن عمرو أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: من شرب بسقة خمر فاجلدوه ثمانين. لیکن امام طحاویؒ کو اس کی سند کے بارے میں تردد ہے، نیز مصنف عبدالرزاق میں ایک مرسل روایت بیان کی گئی ہے: عن الحسن مرسلاً أن النبي صلى الله عليه وسلم ضرب في الخمر ثمانين. (۳۷۹/۷)

امام شافعیؒ کی مستدل روایت کا جواب ہے کہ اس روایت سے خود یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کی مقدار اَسّی ہے؛ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو شاخوں سے چالیس مرتبہ مارا تو یہ اَسّی ہو گئے۔

وضاحت: تکملہ میں مفتی تقی عثمانیؒ نے فرمایا ہے کہ: صحیح بات یہ ہے کہ ابتداءِ عہد میں شربِ خمر کے سلسلہ میں سزا کی کوئی حد مقرر نہیں تھی؛ کیونکہ مختلف روایات میں مختلف سزاؤں کا حکم ہے، کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شاخ سے مارا، کبھی دو شاخوں، کبھی کپڑے سے اور کبھی جوتے سے، اسی طرح مقدارِ ضرب بھی مختلف تھی، پھر جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے بھی دو جوتے سے چالیس مرتبہ ضرب لگائی؛ لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو شبہ یہ ہو گیا تھا کہ آیا یہ چالیس ہے یا اَسّی؛ کیونکہ آلۂ ضرب دو تھے، پھر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دَورِ خلافت آیا، جس وقت شراب نوش لوگوں کی تعداد میں کچھ اضافہ ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا تو آپ رضی اللہ عنہ نے حدِ خمر کی مقدار کے بارے میں صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا تو عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اَسّی کوڑوں کا مشورہ دیا؛ کیوکہ یہ اقلِ حد یعنی قذف کی مقدار کے برابر ہے اور یہی مشورہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دیا اور وجہ یہ بتائی کہ جب آدمی شراب پیتا ہے تو اپنے جوہرِ عقل کو کھو بیٹھتا ہے اور اِدھر اُدھر کی بکواس کرنے لگتا ہے، اسی سبب کبھی کسی پر الزام تراشی بھی

کردیتا ہے، اور الزام بغیر الشہود کی سزا اَسّی کوڑے ہے، لہٰذا اس کو بھی اَسّی کوڑے لگائے جائیں گے، گویا کہ یہ اجماعی مسئلہ ہے، اب اس میں کوئی اختلاف نہیں رہا۔
(اختصار از: فتح الملہم: ۸/ ۴۳۳، اوجز المسالک: ۱۵، عمدۃ القاری)

غلام کے سلسلہ میں حدِ خمر کی مقدار

صاحبِ "المحلی" فرماتے ہیں کہ: غلام کی حد آزاد کی حد سے نصف ہے یہی ائمہ اربعہؒ اور جمہور فقہاءؒ کا مسلک ہے، پس امام شافعیؒ کے نزدیک غلام کی حد بیس کوڑے اور جمہورؒ کے نزدیک چالیس کوڑے ہیں؛ البتہ اہلِ ظاہر کے نزدیک آزاد و غلام کی حد برابر ہے۔

قال ابن الهمام: إن كان عبداً فحده أربعون سوطًا؛ لأن الرق منصف على ما عرف، قال ابن الهمام: من أن الرق مؤثر في تنصيف النعمة والعقوبة فإذا قلنا: حد الخمر ثمانون قلنا: حد العبد أربعون، ومن قال أربعون قال: حد العبد عشرون، انتهىٰ

اب اس بارے میں اختلاف ہے کہ آقا خود اپنے غلام پر حد جاری کرسکتا ہے؟ تو امام شافعیؒ کے نزدیک آقا اپنے غلام پر حد لگانے کا اختیار رکھتا ہے، یہی قول امام مالکؒ کا ہے، ان کا استدلال مصنف عبدالرزاق کی ایک روایت سے ہے:

عن ابن عمر (رضي الله عنهما) في الأمة إذا زنت، ولازوج لها يحدها سيدها. اور مسلم شریف میں ہے: أقيموا الحدود على ارقائكم. (مسلم شریف: ۲) نیز حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اپنی باندی پر حد جاری کی تھی اور حنفیہؒ کے نزدیک حدود وغیرہ کے نفاذ کا حکم امام المسلمین یا اس کے نائب کو ہے، تاہم اگر خود امام آقا کو غلام پر حد لگانے کو کہے تو اسے نائب ہی قرار دیا جائے گا۔

ہمارا استدلال اس روایت سے ہے جس میں یہ صراحت ہے کہ چند چیزوں کا اختیار صرف امام کو ہے:

كان أبو عبدالله رجل من الصحابة يقول: الزكاة والحدود والفيئ والجمعة إلى السلطان، قال الطحاوي: لانعلم له مخالفا من الصحابة.

اور فریقِ مخالف کے استدلال کا جواب شیخ نے بذل میں یہ دیا ہے کہ حدیث میں آقاؤں کو حد جاری کرنے کا حکم دینے کے معنیٰ یہ ہیں کہ اگر غلام باندیوں سے قابلِ حد گناہ ہو جائے تو اس کو چھپاؤ مت؛ بلکہ بذاتِ خود ان کا معاملہ خلیفہ کے پاس لے جاؤ ۱۲

اور جن روایتوں میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے بذاتِ خود حد جاری کرنے کا ذکر ہے تو اس کی توجیہ یہ ہے کہ ان کو خلیفہ نے حکم دیا ہوگا؛ کیونکہ حدود خالص اللہ کا حق ہیں، ان کا نفاذ امیر المسلمین سے متعلق ہوتا ہے۔

مختلف قسم کی کھجوروں کو ملا کر نبیذ بنانے کا حکم

باب میں ابوقتادہ انصاری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور اور کشمش کو اور سوکھی کھجور اور تازہ کھجور کو ملا کر نبیذ بنانے سے منع فرمایا۔

مذکورہ حدیث اور اسی طرح کی دیگر احادیث میں جو ممانعت آئی ہے، وہ لغیرہ ہے یعنی بطورِ احتیاط یہ نہی فرمائی گئی ہے؛ کیونکہ مختلف کھجوروں کو ملانے کی وجہ سے نشہ کی کیفیت جلدی پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے اس کے شراب کے حکم میں داخل ہونے کا قوی اندیشہ ہے، گویا یہ سد الذرائع کے قبیل سے ہے۔

یا پھر یہ مانا جائے کہ یہ حدیثیں منسوخ ہیں؛ کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کشمش کی نبیذ بنائی جاتی تھی، پس اس میں چھوہارے ڈالے جاتے تھے یا چھوہاروں کی نبیذ بنائی جاتی تھی، پس اس میں کشمش ڈالی جاتی تھی۔ (ابوداؤد)

اور غالباً ممانعت کا حکم اس زمانہ کا ہے جب شراب کی قطعی حرمت کا حکم نازل ہوا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کی تربیت کے لیے اس بارے میں ایسے سخت احکام

دیے تھے جن کا مقصود یہ تھا کہ اہلِ ایمان شراب اور نشہ کے ادنیٰ شبہ سے بھی دُور رہیں؛ لیکن جب وہ مقصد حاصل ہوگیا تو یہ احکام ختم ہوگئے؛ چنانچہ علامہ نوویؒ نے بہترین تطبیق دی ہے کہ جن احادیث میں دو چیزیں ملا کر نبیذ بنانے کی اجازت دی گئی ہے وہ اباحت پر محمول ہیں اور جن میں منع فرمایا ہے وہ ممانعت کراہتِ تنزیہی پر محمول ہے؛ اسی لیے امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بھی مخلوط اشیاء کی نبیذ مباح ہے۔

شراب بنانے والے برتنوں کا حکم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت میں عربوں میں شراب کا بے حد رواج تھا، اس سے سرور ونشاط حاصل کیا جاتا تھا، اس کے علاوہ شراب نوشی کرنا اور مہمان کو شراب پیش کرنا عظمت وفضیلت کی بات سمجھی جاتی تھی؛ لیکن چونکہ یہ ایک مضر غیر نافع اور خراب شیٔ تھی؛ اس لیے اسلام نے اسے حرام قرار دے دیا؛ البتہ شریعتِ اسلام نے احکام میں انسانی جذبات کی بڑی رعایت فرمائی ہے؛ اس لیے شراب کی حرمت بتدریج بیان کی گئی؛ لیکن جب وہ حرام کردی تو کچھ احکام ایسے بھی بیان فرمائے کہ لوگوں کو شراب کا خیال بھی نہ آئے؛ اسی لیے وہ برتن جن میں لوگ شراب بنایا کرتے تھے، ان کے استعمال سے بھی روک دیا گیا؛ تاکہ ام الخبائث سے سخت نفرت پیدا ہوجائے اور یہ برتن چار طرح کے ہوتے تھے: کدو کی تونبی، سبز ے گھڑے، مزفت تارکول ملے ہوئے برتن اور کھجور کی جڑ سے بنایا ہوا برتن، بالآخر جب شراب سے نفرت ہوگئی تو پھر ان کے استعمال کی اجازت مل گئی۔

نیز مذکورہ برتنوں سے ممانعت کی وجہ یہ بھی تھی کہ یہ برتن موٹے ہوتے تھے اور ان میں مسامات نہیں ہوتے تھے؛ اس لیے ان میں نبیذ بناتے وقت یہ خطرہ تھا کہ غفلت ہوجائے اور اس میں نشہ پیدا ہوجائے۔

یا پھر اس لیے منع کیا گیا کہ ان میں نبیذ بناتے وقت شراب کی یاد آجائے اور یہ شراب نوشی کا ذریعہ بن جائے۔

اختلافی مسئلہ:

مذکورہ وجوہِ ممانعت کے پیش نظر ان برتنوں کے استعمال کے حکم میں اختلاف ہے، جن لوگوں کے نزدیک ممانعت کی وجہ ان کا موٹا اور مسامات والا ہونا ہے ان کے نزدیک ان کے استعمال کی ممانعت اب بھی باقی ہے اور یہ مالکیہ اور حنابلہ کا مسلک ہے اور جن کے نزدیک ممانعت کی وجہ ان کے ذریعہ شراب کی مذمت کو ظاہر اور اس کی یاد سے دُور رکھنا ہے، تو ان کے نزدیک اب ان برتنوں کا استعمال جائز ہے؛ کیونکہ یہ حکم ہنگامی اور ابتدائی دَور کا تھا، پھر جب اچھے طریقہ سے لوگوں کے ذہن میں شراب کی بُرائی بیٹھ گئی تو ان کے استعمال کی اجازت دے دی گئی، جیسا کہ مسلم شریف کی روایت میں ہے: كنت نهيتكم عن انتباذ في الأواني والأسقية فانتبذوا في كل وعاء ولاتشربوا مسكراً. آخر الذکر مسلک احناف اور شوافع کا ہے۔

محض ریحِ خمر کی وجہ سے حد واجب ہوسکتی ہے؟

ایک شخص کے منہ سے محض شراب کی بو آرہی ہے تو کیا اس سے حد واجب ہوجاتی ہے؟ اس بارے میں اختلاف ہے، امام مالکؒ اور ان کے اصحابؒ کے نزدیک محض منہ سے بُو آنے سے حد واجب ہوجائے گی؛ البتہ علامہ ابنِ رشد مالکیؒ فرماتے ہیں اگر اس پر دو گواہ گواہی دے دیں تو حد واجب ہوگی۔

ان کی دلیل سائب بن یزیدؓ کی روایت ہے: عن السائب بن يزيد أنه حضر عمر بن الخطاب (رضي الله عنه) وهو يجلد رجلًا وقع منه ريح شراب مجلده حدًا تامًا.

اور عبداللہ ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے: أنه جلد رجلًا وجد منه رائحة الخمر.

اور امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور اکثر اہلِ علم کی رائے یہ ہے کہ محض ریحِ خمر وجوبِ حد کا

سبب نہیں ہے؛ تا آنکہ یقینی طور پر علم ہو جائے کہ اس نے شرابِ حرام یا شئ مسکر کو نوش کیا ہے، یہ حضرات فرماتے ہیں کہ منہ سے بدبو آنے کے لیے شراب پینا ضروری نہیں ہے؛ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ اس نے کلی کی ہو یا پانی سمجھ کر منہ میں لے لیا اور پھر معلوم ہوتے ہی اس کو تھوک دیا یا اس نے سمجھا ہو کہ یہ نشہ آور مشروب نہیں ہے یا بطورِ اکراہ پلائی گئی ہو اور ممکن ہے کوئی حلال شئ کھائی یا پی ہو اور اس میں شراب کے مانند بُو ہو، الغرض! یہاں مختلف شبہات ہیں اور حد شبہات سے ساقط ہو جاتی ہے۔ (مغنی، بدایۃ المجتہد)

جواب: امام مالکؒ کی مستدل روایت کا جواب یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو حد جاری کی تھی وہ بُو سونگھ کر نہیں کی؛ بلکہ اس کے پینے والے کے اقرار کی وجہ سے حد جاری کی تھی۔

اور یہ روایت وہی ہے جو کتاب الاشربہ کے شروع میں ہے اور اس میں اقرار کرنے کی وضاحت موجود ہے؛ کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ کہا تھا کہ میں اس سے معلوم کروں گا کہ اس نے کیا پیا ہے۔

اب ذیل میں ''کتاب الاشربہ'' کی متعلقہ حدیثیں اور ان کی تشریحات پیش کی جارہی ہیں۔

عَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيدَ أَنَّهُ أَخْبَرَهُ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ خَرَجَ عَلَيْهِمْ فَقَالَ إِنِّي وَجَدْتُّ مِنْ فُلَانٍ رِيحَ شَرَابٍ فَزَعَمَ أَنَّهُ شَرَابُ الطِّلَاءِ وَأَنَا سَائِلٌ عَمَّا شَرِبَ فَإِنْ كَانَ يُسْكِرُ جَلَدْتُّهُ الْحَدَّ فَجَلَدَهُ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُ حَدًّا تَامًّا.

ترجمہ: حضرت سائب بن یزید سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ میں نے فلاں شخص کے منھ سے شراب کی بُو محسوس کی ہے، وہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے طِلاء پیا ہے اور میں تحقیق کروں گا کہ اس نے کیا پیا ہے، اور اگر وہ چیز نشہ آور ہوگی تو اسے کوڑے ماروں گا (چنانچہ تحقیق کے بعد) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر پوری حد جاری کی۔

تشریح: الطلاء: هو عصير العنب إذا طبخ حتى يذهب أقل من ثلثيه. (هدایه)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے عبید اللہ کے منہ سے کسی نشہ آور چیز کی بُو محسوس کی؛ لیکن ان کو یہ معلوم نہ ہوسکا کہ یہ کس چیز کی بُو ہے، واقعی نشہ آور شئ ہے یا کوئی اور چیز ہے، آپ رضی اللہ عنہ نے اس سے معلوم کیا کہ تو نے کیا پیا ہے؟ اس نے دعویٰ کیا کہ اس نے طلاء پیا ہے، اور انگور کے شیرے کو پکا کر دو تہائی سے زیادہ جلا دیا جائے تو وہ نشہ آور نہیں رہتا ہے اور اس کا پینا حلال ہے؛ اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں تحقیق کروں گا کہ آیا وہ طلاء جو اس نے پیا ہے نشہ آور ہے یا وہ طلاء ہے جس کا پینا حلال ہے، اگر مجھے یہ معلوم ہوا کہ وہ طلاء مسکر تھا تو میں اس پر حدِ خمر جاری کروں گا؛ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی تحقیق کی (یا تو بچے ہوئے مشروب کے ذریعہ یا عبید اللہ کے دوستوں سے معلوم کر کے) تو آپ رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا کہ اس نے نشہ آور طلاء پیا ہے، پھر آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے پر مکمل حد جاری کی۔

أنا سائل عما يشرب: علامہ باجیؒ فرماتے ہیں: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے کے طلاء پینے کے اقرار کرنے کے بعد بھی تحقیق کرنے کی بات کی، یا تو اس لیے کہ آپ رضی اللہ عنہ کو طلاء کے بارے میں معلومات نہیں تھی؛ اس لیے آپ رضی اللہ عنہ فرمایا میں یہ معلوم کروں گا کہ طلاء نشہ آور ہوتا ہے یا نہیں، یا یہ کہ آپ رضی اللہ عنہ طلاء تو جانتے تھے؛ لیکن آپ رضی اللہ عنہ کو اس بات کی تصدیق کرنی مقصود تھی کہ طلاء مسکر پیا ہے یا غیر مسکر؛ چونکہ جب شیرۂ انگور کو دو تہائی سے کم پکایا جائے، تب تک تو وہ نشہ آور اور حرام ہے؛ لیکن جب دو تہائی سے زائد جلا دیا جائے تو وہ حلال ہے، اس کے حلال ہونے کے بارے میں حضرت ابو عبیدہ اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہما کے آثار بخاری شریف میں موجود ہیں، ائمہ ثلاثہؒ نے اس روایت سے اپنے مسلک (ہر نشہ آور چیز حرام قطعی اور خمرِ اصلی کے حکم میں ہے) پر استدلال کیا ہے، بایں طور کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مطلقاً فرمایا کہ اگر اس نے

کوئی نشہ آور چیز پی ہے تو میں اس پر حد جاری کروں گا خواہ اس کا پینا مقدارِ سکر کو پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو؛ کیونکہ اگر نشہ آنے پر حد جاری ہونے کی بات ہوتی تو آپ رضی اللہ عنہ یہ کہتے کہ میں اس کے مسکر ہونے اور مقدارِ شرب دونوں کو معلوم کروں گا جب کہ آپ رضی اللہ عنہ نے ایسا نہ فرما کر صرف جنسِ سکر کو ذکر فرمایا۔

احناف کا کہنا ہے اس روایت سے یہ استدلال کرنا کہ ہر نشہ آور شئ حرام اور موجبِ حد ہے درست نہیں ہے، امام طحاویؒ نے فرمایا یہاں اگر چہ مقدار ذکر نہیں؛ لیکن یہاں جنس اور مقدار دونوں کی تحقیق کا احتمال ہے، اور احتمال کو مراد لینے میں دوسری حدیثوں سے تعارض بھی دُور ہوجاتا ہے۔

نوٹ: اس روایت سے محض ریحِ خمر کے ذریعہ حد کا مسئلہ معلوم ہوتا ہے (اس کی مکمل تفصیل ابتداءِ باب میں گزر چکی ہے)۔

عَنْ ثَوْرِ بْنِ زَيْدٍ الدِّيْلِيِّ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ اسْتَشَارَ فِي الْخَمْرِ يَشْرَبُهَا الرَّجُلُ فَقَالَ لَهُ عَلِيُّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ نَرىٰ أَنْ تَجْلِدَهُ ثَمَانِينَ فَإِنَّهُ إِذَا شَرِبَ سَكِرَ وَإِذَا سَكِرَ هَذىٰ وَإِذَا هَذَى افْتَرىٰ أَوْ كَمَا قَالَ فَجَلَدَ عُمَرُ رَضِيَ اللهُ تَعَالَىٰ عَنْهُ فِي الْخَمْرِ ثَمَانِيْنَ.

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شراب پینے والے شخص کی حد کے سلسلہ میں صحابہؓ سے مشورہ کیا، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم سمجھتے ہیں کہ آپ شاربِ خمر کو اَسّی کوڑے لگائیں؛ اس لیے جب انسان شراب پی لیتا ہے تو اس پر نشہ طاری ہوجاتا ہے اور جب نشہ آجاتا ہے تو اِدھر اُدھر کی بکواس کرنے لگتا ہے اور جب ہذیان و بکواس کرتا ہے تو بسا اوقات کسی پر بہتان لگادیتا ہے (اور زنا کے سلسلہ میں بہتان تراشی پر اَسّی کوڑے لگائے جاتے ہیں)؛ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ شاربِ خمر کے اَسّی کوڑے لگاتے تھے۔

مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ أَنَّهُ سُئِلَ عَنْ حَدِّ الْعَبْدِ فِي الْخَمْرِ، فَقَالَ: بَلَغَنِي أَنَّ عَلَيْهِ نِصْفَ حَدِّ الْحُرِّ فِي الْخَمْرِ.

ترجمہ: ابنِ شہاب زہریؒ سے خمر کے سلسلہ میں غلام کی حد کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ خمر کے سلسلہ میں غلام کی حد آزاد کی حد سے نصف ہے۔

عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ أَنَّهُ سَمِعَ سَعِيدَ بْنَ الْمُسَيَّبِ يَقُوْلُ: مَا مِنْ شَيْئٍ إِلَّا يُحِبُّ اللهُ أَنْ يُعْفِيَ عَنْهُ مَا لَمْ يَكُنْ حَدًّا.

ترجمہ: یحییٰ بن سعیدؒ نے سعید ابنِ مسیبؒ کو فرماتے ہوئے سنا: کوئی گناہ نہیں ہے؛ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ پسند فرماتے ہیں کہ اس کو معاف کر دیا جائے جبکہ وہ گناہ ایسا نہ ہو جس پر حد واجب ہوتی ہے۔

تشریح: مذکورہ اثر کا مطلب یہ ہے کہ وہ گناہ جن پر حد واجب نہیں ہوتی ہے ان کے بارے میں سفارش کرنا مستحب ہے، امیر المؤمنین کے پاس ان کی خبر پہنچنے سے پہلے اور بعد بھی، (كذا في المحلى).

علامہ باجیؒ فرماتے ہیں کہ اس روایت کے معنیٰ میں دو احتمال ہیں:

(۱) جب حدود کا معاملہ امام تک پہنچ جائے، تو امیر المؤمنین کے لیے اس کو معاف کرنا یا چھپانا جائز نہیں۔

(۲) اگر حد کسی ایسے گناہ میں واجب ہو جس کا تعلق بندے سے ہو تو معاملہ کے امیر کے پاس پہنچ جانے کے بعد صاحبِ معاملہ کے لیے معاف کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بندے کے گناہوں کو چھپانا اور معاف کرنا چاہیے؛ لیکن جب کوئی موجبِ حد گناہ امام کے پاس چلا جائے تو اب معاف کرنے والا اور سفارش کرنے والا دونوں ملعون ہیں۔

قَالَ مَالِكٌ عليه السلام: وَالسُّنَّةُ عِنْدَنَا أَنَّ كُلَّ مَنْ شَرِبَ شَرَابًا مُسْكِرًا، فَسَكَرَ أَوْلَمْ يَسْكُرْ فَقَدْ وَجَبَ عَلَيْهِ الْحَدُّ.

ترجمہ: امام مالکؒ (اور یہی مذہب امام شافعیؒ اور احمدؒ کا ہے) نے فرمایا: ہمارے

نزدیک سنت یہ ہے کہ کوئی شخص اگر نشہ آور مشروب پی لے، (اس کی وجہ سے خواہ اسے) نشہ ہو یا نہ ہو، اس پر حد واجب ہو جائے گی۔

(حد خمر کے بارے میں اختلاف اور شرابوں کی اقسام ابتدائے باب میں گزر چکی ہیں)

مَا یُکْرَہُ أَنْ یُّنْبَذَ جَمِیْعًا

(جن چیزوں کو ملا کر نبیذ بنانا مکروہ ہے)

عَنْ عَطَآءِ بْنِ یَسَارٍ رَضِيَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَھٰی أَنْ یُّنْبَذَ الْبُسْرُ وَالرُّطَبُ جَمِیْعًا وَالتَّمْرُ وَالزَّبِیْبُ جَمِیْعًا.

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے گدر کھجور اور پکی ہوئی کھجور کو ملا کر نبیذ بنانے سے اور چھوہارے اور کشمش کو ایک ساتھ ملا کر نبیذ بنانے سے۔

عَنْ أَبِيْ قَتَادَةَ الْأَنْصَارِيِّ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَھٰی أَنْ یُّشْرَبَ التَّمْرُ وَالزَّبِیْبُ جَمِیْعًا وَالزَّھْوُ وَالرُّطَبُ جَمِیْعًا.

ترجمہ: حضرت ابوقتادہ انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے کہ چھوہارے اور کشمش سے بنائی ہوئی گدر کھجور اور پکی کھجور سے بنی ہوئی نبیذ کو پیا جائے۔

قَالَ مَالِكٌ علیہ الرحمۃ: وَھُوَ الْأَمْرُ الَّذِيْ لَمْ یَزَلْ عَلَیْہِ أَھْلُ الْعِلْمِ بِبَلَدِنَا أَنَّہُ یُکْرَہُ ذٰلِكَ لِنَھْيِ رَسُوْلِ اللّٰہِ عنہ.

ترجمہ: حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں: یہی وہ مسلک ہے جس پر ہمارے شہر کے علماء قائم ہیں کہ مذکورہ نبیذیں مکروہ ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے منع فرمانے کی وجہ سے۔

تشریح: دو مختلف چیزوں کو ملا کر نبیذ بنانا جائز ہے یا نہیں؟ باب کی حدیثوں میں اس کی ممانعت ہے، انہیں حدیثوں کی وجہ سے امام مالکؒ، امام احمدؒ، امام اسحاقؒ اور اصحابِ ظواہر کی رائے یہ ہے کہ دو مختلف چیزوں کو ملا کر نبیذ بنانا ناجائز ہے اور یہ ممانعت لعینہٖ اور اب بھی باقی ہے۔

جبکہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ ممانعت لغیرہٖ ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطورِ احتیاط دو مختلف چیزوں کی نبیذ ایک ساتھ بنانے سے منع فرمایا ہے؛ کیونکہ ایسی نبیذ میں غیر محسوس طریقہ پر فساد پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے؛ اس لیے کہ جب دو ایسی چیزوں کو ملا لیا جائے جن میں سے ایک جلدی گلنے والی ہے اور دوسری دیر سے یا ایسی دو چیزیں جن میں سے ایک کھٹی ہے اور دوسری میٹھی، اگر ان کو ملا کر نبیذ بنائی جائے تو نشہ بہت جلد پیدا ہو جائے گا اور پتہ بھی نہیں چلے گا۔

اور دوسری وجہ ممانعت کی یہ ہے کہ دو چیزیں ملا کر بنانا ٹھاٹھ اور رفاہیت ہے جو مؤمن کے شایانِ شان نہیں ہے یعنی مؤمن کو قناعت اور بقدرِ ضرورت اشیاء کے ساتھ زندگی کا گزر بسر کرنا چاہیے۔ (تحفۃ القاری: ۱۰)

مَا يُنْهىٰ أَنْ يُّنْتَبَذَ فِيْهِ

(جن برتنوں میں نبیذ بنانے سے منع کیا گیا ہے)

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَطَبَ النَّاسَ فِيْ بَعْضِ مَغَازِيْهِ قَالَ عَبْدُ اللهِ بْنُ عُمَرَ فَأَقْبَلْتُ نَحْوَهُ فَانْصَرَفَ قَبْلَ أَنْ أَبْلُغَهُ فَسَأَلْتُ مَاذَا قَالَ فَقِيْلَ لِيْ نَهٰى أَنْ يُنْبَذَ فِي الدُّبَّاءِ وَالْمُزَفَّتِ.

ترجمہ: عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک غزوہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو خطاب کیا، کہتے ہیں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجہ ہو کر (چلا)؛ لیکن میرے پہنچنے سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تقریر ختم فرمادی، میں نے لوگوں سے معلوم کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا، کہتے ہیں تو مجھ سے بتایا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تونبی اور تارکول لگے ہوئے برتن میں نبیذ بنانے سے منع فرمایا ہے۔

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى أَنْ يُنْتَبَذَ فِي الدُّبَّاءِ وَالْمُزَفَّتِ.

تشریح: ان برتنوں میں نبیذ کی ممانعت یا تو اس وجہ سے تھی تا کہ بالکلیہ شراب کا خیال ذہن و دماغ سے محو ہو جائے یا پھر اس لیے کہ ان میں مسامات نہیں ہوتے جن کی وجہ سے جلد نشہ پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔

الدباء: اس برتن کو کہتے ہیں جو کدو وغیرہ کے ذریعہ بنایا جاتا تھا۔

مزفت: وہ برتن جس پر تارکول چڑھا دیا گیا ہو۔

مَا جَاءَ فِيْ تَحْرِيْمِ الْخَمْرِ

(شراب کی حرمت کا بیان)

شراب کے روحانی، اخلاقی، تمدنی، جسمانی اور اقتصادی مفاسدات اتنے کثیر اور اتنے زیادہ ہیں کہ شاید دوسری چیزوں میں اتنے مفاسد اور مضرات نہ ہوں؛ اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ام الخبائث فرمایا ہے، شراب کے استعمال سے آدمی کچھ دیر کے لیے ہی سہی اس عقل و جوہر سے محروم ہو جاتا ہے جو اس کے رب کا خاص عطیہ ہے، نیز شراب کے نشہ میں بسا اوقات انسان ایسی حرکت کر بیٹھتا ہے جو انتہائی شرمناک اور نامناسب ہوتی ہے اور شیطان کے ہاتھوں کھلونا بن جاتا ہے، اس کثیر المفاسد شئ سے روکنے کے لیے قرآن وحدیث میں سخت احکامات دیئے گئے ہیں۔

چنانچہ قرآن میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿إِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَيْسِرُ وَ الْأَنْصَابُ وَ الْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ﴾ اس آیت میں خمر کو "رجس" یعنی گندگی اور انتہائی قبیح شئ کہا گیا ہے اور ظاہر ہے نجس، گندی اور قبیح شئ کا استعمال کرنا کسی حالت میں بھی جائز نہیں ہے، اسی طرح فرمایا کہ شربِ خمر شیطانی کام ہے اور شیطان کے اندر خباثت ہوتی ہے اور جو شخص اس کے جیسے کام کرے گا وہ بھی خبائث اور شیطنت کی طرف مائل ہوگا۔

آیت میں شراب کو استعمال کرنے سے پیدا ہونے والی مزید دو خرابیاں کی گئی ہیں:

(۱) دنیوی خرابی (۲) دینی خرابی

دنیوی خرابی یہ ہے کہ جب انسان شراب پی لیتا ہے تو اس کی عقل ماری جاتی ہے جس کے سبب وہ گالی گلوچ اور لوگوں سے جھگڑا فساد کرنے لگتا ہے۔

اور دینی خرابی یہ ہے کہ شرابی نفس کے تقاضوں میں اس قدر گھس جاتا ہے کہ نہ اسے نماز یاد رہتی ہے اور نہ کوئی دوسری عبادت۔

اور حدیث شریف میں بھی شراب پینے والے کے لیے سخت وعید آئی ہے؛ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص دنیا میں شراب پیے اور برابر شراب پینے کی حالت میں مرجائے یعنی اسے توبہ کی توفیق نہ ہو تو آخرت میں جنت کی شرابِ طہور سے محروم رہے گا۔

شراح فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔

ذیل میں اسی موضوع کی دیگر احادیث بیان کی جارہی ہیں۔

عَنْ عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهَا قَالَتْ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْبِتْعِ فَقَالَ كُلُّ شَرَابٍ أَسْكَرَ فَهُوَ حَرَامٌ.

ترجمہ: اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم بتع کے بارے میں دریافت کیا گیا (اس کا پینا جائز ہے یا ناجائز) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر نشہ آور مشروب حرام ہے۔

تشریح: بِتَعْ شہد کی نبیذ کو کہتے ہیں، ایک متعین مقدار میں شہد میں پانی ملا کر چھوڑ دیا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس میں جوش پیدا ہو جائے۔

اس حدیث سے بطورِ قاعدہ کلیہ کے معلوم ہو گیا کہ جس چیز کے کھانے پینے سے نشہ پیدا ہو جائے وہ ناجائز اور ممنوع ہے۔

عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُئِلَ عَنِ الْغُبَيْرَاءِ. فَقَالَ لَا خَيْرَ فِيهَا وَنَهٰى عَنْهَا. قَالَ مَالِكٌ فَسَأَلْتُ زَيْدَ بْنَ أَسْلَمَ مَا الْغُبَيْرَاءُ؟ فَقَالَ هِيَ السُّكُرْكَةُ.

ترجمہ: عطاء بن یسار سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے غبیراء کے بارے

میں دریافت کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس میں کوئی بھلائی نہیں ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے پینے سے منع فرمایا ہے۔ حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں: میں نے زید بن اسلم سے معلوم کیا غبیرا کیا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا وہ ایک قسم کا نشہ ہے۔

تشریح: غُبَیْراء غین کے ضمہ اور با کے فتحہ کے ساتھ مکئی سے بنی ہوئی شراب کو کہتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے پینے کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس میں کوئی خیر نہیں ہے۔ علامہ زرقانیؒ فرماتے ہیں: عدمِ خیر سے مراد حرمت ہے۔

امام مالکؒ کو اس لفظ کے بارے میں تحقیق نہیں تھی؛ اس لیے انہوں نے زید بن اسلم سے معلوم کیا تو انہوں نے اس کی تشریح ''السُکُرْکَۃُ'' (بضم السين والكاف وسكون الراء وبضم الكاف الثاني) سے کی، ممکن ہے مکئی کی شراب کے لیے امام مالکؒ کے علاقہ میں یہی لفظ مشہور ہو۔

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ شَرِبَ الْخَمْرَ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ لَمْ يَتُبْ مِنْهَا حُرِمَهَا فِي الْآخِرَةِ.

ترجمہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو دنیا کے اندر شراب نوشی کرے اور اس سے توبہ کیے بغیر (مرجائے) وہ جنت کی شرابِ طہور سے محروم کردیا جائے گا۔

تشریح: اس حدیث کے سلسلہ میں متعدد احتمالات بیان کیے گئے ہیں۔

بعض حضرات نے اس کا مطلب یہ بیان ہے کہ شرابی شخص جنت میں دخولِ اولی کے طور پر داخل نہ ہوگا اور بعض نے فرمایا شرابی مطلقاً جنت میں داخل نہ ہوگا؛ لیکن یہ صورت اس وقت ہے جب حلال سمجھ کر پیئے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں ایسا شخص اگرچہ جنت میں داخل ہوجائے گا؛ لیکن جنت کی شرابِ طہور سے محروم رہے گا یا تو وہ جنتی شراب کو بھول جائے گا یا اس کو اشتہاء نہ ہوگی؛ کیونکہ خواہش ہونے کے بعد ملنا ضروری ہے۔

عَنِ ابْنِ وَعْلَةَ الْمِصْرِيِّ أَنَّهُ سَأَلَ عَبْدَ اللهِ بْنَ عَبَّاسٍ عَمَّا يُعْصَرُ مِنَ الْعِنَبِ فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ أَهْدٰى رَجُلٌ لِرَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَاوِيَةَ خَمْرٍ فَقَالَ أَمَا عَلِمْتَ أَنَّ اللهَ حَرَّمَهَا؟ قَالَ لَا. فَسَارَّهُ إِنْسَانٌ إِلٰى جَنْبِهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَ سَارَرْتَهُ؟ فَقَالَ أَمَرْتُهُ بِأَنْ يَبِيعَهَا. فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ الَّذِيْ حَرَّمَ شُرْبَهَا حَرَّمَ بَيْعَهَا فَفَتَحَ الرَّجُلُ الْمَزَادَتَيْنِ حَتّٰى ذَهَبَ مَا فِيهِمَا.

ترجمہ: ابنِ وعلہ مصریؒ نے حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے دریافت کیا اس شیرہ کے بارے میں جو انگور سے نچوڑا جاتا ہے، تو ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ایک شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شراب کا ایک مشکیزہ ہدیہ کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حرام کر دیا ہے، اس شخص نے کہا نہیں (مجھے معلوم نہیں ہے) اس شخص کے برابر میں بیٹھے ہوئے ایک شخص نے سرگوشی کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معلوم کیا تم نے آہستہ سے اس سے کیا کہا، اس شخص نے جواب دیا کہ میں نے اُس کو اس شراب کے بیچنے کا حکم دیا، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے جس چیز کے پینے کو حرام قرار دیا ہے اس کے بیچنے کو بھی حرام فرما دیا ہے، پس اس آدمی نے برتن کھول دیئے یہاں تک کہ ان میں موجود تمام شراب بہہ گئی۔

تشریح: عبدالرحمٰن ابنِ وعلہ مصری نے ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے شیرہ انگور کی بیع کے بارے میں مسئلہ معلوم کیا، اس کے جواب میں ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے وہ حدیث بیان کی جس میں ہے کہ ایک شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شراب ہدیہ کی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے اس کا پینا حرام قرار دے دیا ہے اور مزید فرمایا کہ جس کا پینا حرام ہے اس کا بیچنا بھی حرام ہے۔

أما علمت أن الله حرمها: شراح فرماتے ہیں یہ اس وقت کی بات ہے جب حرمتِ خمر کا حکم مشہور نہیں ہوا تھا، امام نوویؒ فرماتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لیے

معلوم کیا تاکہ یہ معلوم ہوجائے کہ اس کو تحریم خمر کا علم ہے یا نہیں اگر ہے تو اس کے شراب کو اپنے پاس روکنے اور یہاں اٹھا کر لانے پر تعزیر کی جائے؛ لیکن اس شخص نے جواب دیا مجھے معلوم نہیں ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو معذور سمجھا، اور اسے کوئی سزا یا ڈانٹ ڈپٹ نہیں کی۔

فسارّہ إنسان: ایک شخص جو وہیں بیٹھا ہوا تھا اس نے ہدیہ دینے والے سے کچھ سرگوشی کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معلوم کیا تم اس کے کان میں کیا کہہ رہے؟ اس نے جواب دیا کہ میں نے اس سے کہا اگر شراب کا پینا حرام ہے تو اسے بیچ دو، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس چیز کا پینا حرام ہے اس کا بیچنا بھی حرام ہے۔

فقال له رسول الله (صلى الله عليه وسلم) إن الذي حرّم شربها حرم بيعها: سرگوشی کرنے والے شخص نے شاید خیال کیا کہ شراب کا صرف پینا حرام ہے؛ البتہ اس کو بیچ کر اس کی آمدنی سے نفع اٹھایا جاسکتا ہے، اسی غلط فہمی کو دُور کرنے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جس چیز کے پینے کو حرام قرار دیا ہے اس کی بیع کو بھی حرام قرار دیا ہے۔

آپؒ فرماتے ہیں اس حدیث کے اندر یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے کہ جس چیز کا استعمال حرام ہے اس کی خرید و فروخت بھی حرام ہے؛ بلکہ یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں چیزوں (پینے اور بیع) کو مستقلاً حرام قرار دیا ہے۔

اسی لیے فقہاء نے نجس ذاتی اور اسبابِ خارجیہ کے سبب نجس چیزوں کے درمیان فرق کیا ہے۔

چنانچہ وہ تیل اور گھی جو اسبابِ خارجیہ کی وجہ سے ناپاک ہوجائیں ان سے کسی بھی طرح کا نفع اٹھانا امام احمد بن حنبلؒ، احمد بن صالحؒ اور عبدالملکؒ وغیرہ کے نزدیک جائز نہیں ہے جس طرح شراب سے کسی کا نفع اٹھانا جائز نہیں۔

اور جمہور امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور لیث بن سعدؒ وغیرہ نے نجس تیل کی

بیع کو جائز قرار دیا ہے، ان حضرات نے فرمایا کہ شراب کے کلی طور پر عدم انتفاع اور نجس تیل کے عدم انتفاع کے درمیان فرق یہ ہے کہ خمر سے تنفر میں مبالغہ کرتے ہوئے اس سے ہر قسم کا نفع اٹھانا حرام قرار دیا گیا، جبکہ نجس تیل اپنی ذات کے اعتبار سے پاک ہے؛ البتہ اس میں خارجی نجاست سرایت کر دگئی ہے اس لئے غیر اکل میں انتفاع جائز ہے۔

بیع خمر کا مسئلہ:

ابن قدامہ نے ''المغنی'' میں فرمایا کہ خمر کی خرید و فروخت کے حرام ہونے پر تمام فقہاء کا اجماع ہے۔

البتہ حنفیہ کے نزدیک اس بارے میں قدرے تفصیل ہے:

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اصل خمر یعنی شیرۂ انگور کی بیع بالکل حرام ہے اور اس کے علاوہ دوسرے نشہ آور مشروب تو ان کی بیع امام صاحبؒ کے نزدیک کراہت کے ساتھ جائز ہے اور صاحبینؒ کے نزدیک عصیرِ عنب، نقیعِ تمر اور نقیعِ زبیب اصل خمر میں شامل ہیں، لہٰذا ان کی بیع جائز نہ ہوگی، اس کے علاوہ دوسرے مسکرات کی بیع جائز ہے۔

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں فتویٰ امام صاحبؒ کے قول پر ہے۔

(فتح القداری، ہدایہ، ردالمحتار)

راویة: دراصل اس جانور کو کہتے ہیں جو پانی یا شراب لے کر جائے؛ لیکن یہاں اس مشکیزہ کو کہا گیا جو اس جانور پر رکھا ہوا ہوتا ہے۔

مزادة: بفتح المیم والزاء قربة مشکیزہ۔

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّهُ قَالَ كُنْتُ أَسْقِي أَبَا عُبَيْدَةَ بْنَ الْجَرَّاحِ وَأَبَا طَلْحَةَ الأَنْصَارِيَّ وَأُبَيَّ بْنَ كَعْبٍ شَرَابًا مِنْ فَضِيخٍ وَ قَالَ فَجَاءَهُمْ آتٍ فَقَالَ إِنَّ الْخَمْرَ قَدْ حُرِّمَتْ. فَقَالَ أَبُو طَلْحَةَ يَا أَنَسُ قُمْ إِلَى هَذِهِ الْجِرَارِ فَاكْسِرْهَا قَالَ فَقُمْتُ إِلَى مِهْرَاسٍ لَنَا فَضَرَبْتُهَا بِأَسْفَلِهِ حَتَّى تَكَسَّرَتْ.

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں ابوعبیدہ بن جراح، ابوطلحہ انصاری اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہم کو گدر خشک کھجور کی شراب پلا رہا تھا کہ ایک آنے والے نے آکر کہا شراب حرام کردی گئی ہے، ابوطلحہ نے کہا: اس گھڑے کے پاس جاؤ اور اسے توڑ دو، انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں اوکھلی کے موسل کے پاس گیا اور میں نے اس سے گھڑوں کے نیچے والے حصہ میں مارا، یہاں تک کہ وہ ٹوٹ گئے۔

تشریح: غالباً یہ واقعہ آیتِ خمر: ﴿اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَيْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ الاٰية﴾ کے نزول کے وقت کا ہے؛ لیکن شراح کے درمیان سنِ حرمتِ خمر کے بارے میں اختلاف ہے۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ ۴ ؁ ہجری اور بعض کے نزدیک ۶ ؁ ہجری میں حرام ہوئی اور ایک قول کے مطابق ۸ ؁ ہجری فتح مکہ سے پہلے حرام ہوئی ہے، حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: ۸ ؁ھ والی بات زیادہ لائق معلوم ہوتی ہے؛ کیونکہ گزشتہ حدیث میں ہدیہ شراب کا جو واقعہ پیش آیا ہے فتح مکہ سے کچھ پہلے کا ہے۔

فأكسرها: امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا ابتداءً یہ خیال تھا کہ جس طرح شراب حرام ہے اسی طرح اس کے برتن کو توڑنا بھی ضروری ہے؛ لیکن بعد میں یہ بات سامنے آگئی جس برتن میں شراب ہو اسے دھو کر پاک کیا جاسکتا ہے، اسے توڑنے کی ضرورت نہیں۔

فضیح گدر خشک اور ردی کھجوروں کو کہتے ہیں۔

اور مہراس دراصل اوکھلی کو کہتے ہیں؛ لیکن یہاں موسل مراد ہے۔

عَنْ مَحْمُودِ بْنِ لَبِيدٍ الْأَنْصَارِيِّ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ حِيْنَ قَدِمَ الشَّامَ فَشَكٰى إِلَيْهِ أَهْلُ الشَّامِ وَبَاءَ الْأَرْضِ وَثِقْلَهَا وَقَالُوْا لَا يُصْلِحُنَا إِلَّا هٰذَا الشَّرَابُ فَقَالَ عُمَرُ اِشْرَبُوا هٰذَا الْعَسَلَ فَقَالُوْا لَا يُصْلِحُنَا الْعَسَلُ فَقَالَ رَجُلٌ مِّنْ أَهْلِ الْأَرْضِ هَلْ لَّكَ أَنْ تَجْعَلَ لَنَا مِنْ هٰذِهِ الشَّرَابِ شَيْئًا لَا

يُسْكِرُ قَالَ نَعَمْ. فَطَبَخُوهُ حَتّٰى ذَهَبَ مِنْهُ الثُّلُثَانِ وَبَقِيَ الثُّلُثُ فَأَتَوْا بِهِ عُمَرَ فَأَدْخَلَ فِيهِ عُمَرُ إِصْبَعَهُ ثُمَّ رَفَعَ يَدَهُ فَتَبِعَهَا يَتَمَطَّطُ فَقَالَ هٰذَا الطِّلَاءُ هٰذَا مِثْلُ طِلَاءِ الإِبِلِ فَأَمَرَهُمْ عُمَرُ أَنْ يَشْرَبُوهُ فَقَالَ لَهُ عُبَادَةُ بْنُ الصَّامِتِ أَحْلَلْتَهَا وَاللهِ فَقَالَ عُمَرُ كَلَّا وَاللهِ اللّٰهُمَّ إِنِّي لَا أُحِلُّ لَهُمْ شَيْئًا حَرَّمْتَهُ عَلَيْهِمْ وَلَا أُحَرِّمُ عَلَيْهِمْ شَيْئًا أَحْلَلْتَهُ لَهُمْ.

ترجمہ: محمود بن لبید انصاریؒ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب شام تشریف لے گئے تو اہلِ شام نے علاقائی وباء اور آب وہوا کے بھاری ہونے کی شکایت کی، اور کہا کہ صرف اس شراب سے ہم تندرست رہ سکتے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا شہد پی لیا کرو، ان لوگوں نے کہا شہد ہمیں موافق نہیں آتا، اسی علاقہ کے ایک شخص نے کہا: کیا ہم آپ کے لیے ایسی شراب بنا کر لائیں جو نشہ آور نہ ہو؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا ہاں (لاؤ) پس انہوں نے شیرہ پکایا، یہاں تک کہ دوتہائی جل گیا اور ایک تہائی باقی رہ گیا، پھر اسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس لائے، آپ رضی اللہ عنہ نے اپنی انگلی اس میں داخل کی اور پھر اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا (انگلی نکال لی) تو اس کا تار بندھ گیا، فرمایا یہ طلاء اونٹ کے طلاء کی طرح ہے، پھر آپ رضی اللہ عنہ نے ان کو اسے پینے کا حکم دیا، عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: بخدا! آپ نے اس کو حلال کر دیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا خدا کی قسم! ہرگز نہیں، اے اللہ! میں نے ان کے لیے کوئی ایسی چیز حلال نہیں کی ہے جس کو آپ نے حرام قرار دیا ہے اور نہ کوئی چیز حرام کی ہے جس کو آپ نے حلال کیا ہے۔

تشریح: حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے دَورِ خلافت میں بذاتِ خود اسلامی خطوں کا دَورہ کیا کرتے تھے؛ تاکہ لوگوں کے حالات معلوم ہوسکیں، اسی غرض سے آپ رضی اللہ عنہ شام تشریف لے گئے، جب آپ رضی اللہ عنہ وہاں پہنچے تو لوگ آپ کے پاس آئے اور انہوں نے آپ سے شکایت کی: ہمارے علاقہ میں وبا پھیلی ہوئی ہے اور ہوا اور پانی میں

بھاری پن ہے، کیا ہم شراب کا استعمال کر سکتے ہیں؛ کیونکہ یہی ہمارے لیے مفید ہو سکتی ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، کہا: تم لوگ شہد کو استعمال کرو؛ کیونکہ قرآنِ کریم نے اس میں صراحتاً شفا ہونے کے بارے میں فرمایا ہے، ان لوگوں نے کہا شہد ہمارے مزاجوں کے موافق نہیں ہے، ہمیں راس نہیں آتا اور اس سے ہماری بیماری ختم نہیں ہوگی، پھر ان میں سے ایک شخص نے کہا ہم غیر مسکر شراب کے بارے میں بات کر رہے ہیں اور اگر آپ چاہیں تو ہم آپ کو لا کر دکھا سکتے ہیں کہ اس میں نشہ نہیں ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا لاؤ پیش کرو؛ تاکہ میں دیکھوں کہ کس طرح اس میں نشہ نہیں آتا؛ چنانچہ ان لوگوں نے شیرہ کو اتنا پکایا کہ اس کا دو تہائی جل گیا اور ایک تہائی باقی رہ گیا، پھر وہ اس کو آپ رضی اللہ عنہ کے پاس لے کر آئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس میں اپنی انگلی ڈال کر اس کی رِقّت کو معلوم کرنا چاہا، پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی انگلی اس میں سے نکالی، تو اس میں تار بن رہے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: طلاء یعنی شیرہ اس طلاء کی طرح ہے جسے اونٹ پر ملا جاتا ہے، اس کی کھجلی ختم کرنے کے لیے، اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو اس کے پینے کی اجازت دے دی۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ جو وہاں موجود تھے، انہوں نے کہا خدا کی قسم! آپ نے ان لوگوں کے لیے شربِ خمر کو حلال کر دیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا میں نے کوئی حرام چیز ان کے حلال نہیں کی ہے اور نہ کوئی حلال چیز حرام کی ہے؛ کیونکہ اس وقت یہ شیرہ اور طلاء غیر مسکر ہے، للہٰذا یہ شراب کے حکم میں نہیں رہا اور اب اس کا پینا جائز ہے۔

فائدہ: طلاء اس شیرۂ انگور کو کہتے ہیں جو پکایا جائے اور دو تہائی سے کم جلایا جائے، پھر جب اس میں جھاگ اٹھیں اور نشہ پیدا ہو جائے اس کو باذق منصف بھی کہتے ہیں یہ حرام ہے اور جب شیرۂ انگور کو دو تہائی سے زیادہ جلا دیا جائے تو پھر وہ بگڑتا نہیں ہے اور نہ اس میں نشہ پیدا ہوتا ہے؛ اس لیے اس کا پینا حلال ہے اور یہاں اسے مجازاً طلاء کہا گیا ہے۔

اعتراض: جب یہ حلال ہے تو حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ نے یہ کیوں فرمایا کہ آپ نے حرام کو حلال کر دیا؟

جواب: علامہ باجیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کے ذہن میں یہ تھا کہ جب اس کی اجازت دے دی جائے گی تو یہ خمر حرام پینے کا سبب بھی بن سکتا ہے۔

عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ أَنَّ رِجَالًا مِّنَ أَهْلِ الْعِرَاقِ قَالُوْا لَهُ يَا أَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ إِنَّا نَبْتَاعُ مِنْ ثَمَرِ النَّخْلِ وَالْعِنَبِ فَنَعْصِرُهُ خَمْرًا فَنَبِيْعُهَا فَقَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ إِنِّيْ أُشْهِدُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ وَمَلٰئِكَتَهُ وَمَنْ سَمِعَ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ أَنِّيْ لَا اٰمُرُكُمْ أَنْ تَبِيْعُوْهَا وَلَا تَبْتَاعُوْهَا وَلَا تَعْصِرُوْهَا وَلَا تَشْرِبُوْهَا وَلَا تَسْقُوْهَا فَإِنَّهَا رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ.

ترجمہ: حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے عراق کے کچھ لوگوں نے ان سے کہا اے عبدالرحمن! (ابنِ عمر رضی اللہ عنہما کی کنیت ہے) ہم کھجور اور انگور خرید کر ان کی شراب نکالتے ہیں، پھر اسے بیچتے ہیں، حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا میں تم پر اللہ اور اس کے فرشتہ اور جو جنات و انسان سن رہے ہیں انہیں گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں تمہیں اس کو بیچنے، خریدنے، شراب بنانے، پینے، پلانے کا حکم نہیں دیتا؛ کیونکہ یہ گندگی اور شیطانی عمل ہے۔

تشریح: جو اہلِ عراق آپ رضی اللہ عنہ کے پاس آئے تھے شاید انہوں نے قریبی زمانہ میں اسلام قبول کیا تھا؛ اس لیے انہیں تحریمِ خمر کی خبر نہیں پہنچی تھی یا پھر ان کا خیال یہ تھا کہ شراب کو صرف پینا حرام ہے بیچنا حرام نہیں ہے؛ اسی لیے حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما نے تفصیل کے ساتھ تمام چیزوں کو ممنوع قرار دیا۔

○❖○

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

كِتَابُ الْجَامِعِ

أي الجامع أشياء شتى یعنی مختلف قسم کی احادیث کو سمیٹنے والی۔

علامہ ابن العربیؒ نے فرمایا: امام مالکؒ نے ''کتاب الجامع'' کا اختراع دو فائدوں کے پیشِ نظر کیا ہے:

(۱) اس میں ان چیزوں کا بیان ہے جو ان احکامِ تکلیفیہ سے خارج ہیں جن کو ابواب و فصول قائم کر کے جدا جدا بیان کیا گیا ہے۔

(۲) جب امام مالکؒ نے شریعت اور اس کے انواع کو بنظر غائر دیکھا اور ان احکامِ شرعیہ کو امر و نہی، عبادات و معاملات اور جنایات و عادات میں منقسم پایا تو ان کو ایک لڑی میں پرو دیا۔ اور کچھ مضامین بکھرے ہوئے اور متغایر المعنیٰ تھے، ان کے مستقل ابواب قائم نہیں کیے؛ کیونکہ ان کے موضوع نہایت مختصر تھے، نیز ان میں طوالت کا ارادہ بھی نہیں تھا؛ چنانچہ منتشر موضوعات کو جمع کر کے ان کو ''کتاب الجامع'' کے تحت بیان کر دیا۔

لیکن شیخ زکریاؒ ''اوجز'' میں فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک بہتر توجیہ یہ ہے کہ ''کتاب الجامع'' سے پہلے جتنے ابواب تھے ان سب کا تعلق احکام یعنی فقہی مسائل سے تھا؛ اس لیے ان کو بیان کرنے میں شدتِ اہتمام سے کام لیا ہے اور ''کتاب الجامع'' سے ختم کتاب تک فضائل کا بیان ہے؛ اس لیے ایسی کسی خاص ترتیب کو ملحوظ نہیں رکھا۔ (اوجز:۱۶)

اَلدُّعَاءُ لِلْمَدِيْنَةِ وَأَهْلِهَا

مدینہ دان سے مشتق ہے أطاع کے معنیٰ ہے یا مَدَنَ بالمكان سے مشتق ہے أي أقام به، مدينة کی جمع مُدُنٌ آتی ہے، میم اور دال کے ضمہ کے ساتھ اور دال کے سکون

کے ساتھ مدینہ کہتے ہیں مصر جامع یعنی ایک بڑے شہر کو جس میں ضروریاتِ زندگی مہیا ہوں، پھر بطورِ علم مدینہ دارِ ہجرتِ رسولؐ پر بولا جانے لگا۔

مدینہ کے بہت سے نام ہیں؛ لیکن امام نوویؒ نے مناسک میں پانچ مشہور ناموں کا ذکر فرمایا ہے: مدینہ، طابہ، طیبہ، دار، یثرب۔

ابنِ حجرؒ فرماتے ہیں کہ مدینہ کے تقریباً ایک ہزار نام ہیں۔

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَهُمْ فِيْ مِكْيَالِهِمْ وَبَارِكْ لَهُمْ فِيْ صَاعِهِمْ وَمُدِّهِمْ يَعْنِيْ أَهْلَ الْمَدِيْنَةِ.

ترجمہ: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اے اللہ! برکت کا نزول فرما دیجیے ان کے کیلوں میں اور برکت وزیادتی فرما دیجیے ان کے صاعوں میں اور مدوں میں یعنی مدینہ والوں کے۔

تشریح: علامہ ابنِ عبدالبرؒ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ والوں کے ناپ تول کے پیمانوں میں برکت کی دعا کرنا یہ استعارہ ہے ان میں تولی جانے والی چیز سے، مراد یہ ہے کہ اے اللہ! اہلِ مدینہ کے تمام غلہ جات میں خیر وبرکت کا نزول فرما دیجیے، اسی کو علامہ ابن العربیؒ نے بیان کیا ہے۔

قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں: یہاں برکت سے مراد نمو اور زیادتی ہے اور ثبات وبقا ہے، نیز یہ بھی احتمال ہے کہ یہاں برکت سے مراد برکت دینی ہو یعنی زکاۃ وصدقات وغیرہ کی مقداروں میں اضافہ، اس وقت دعاء کا منشاء شریعت کی بقاء اور ثبوت ہوگا؛ لیکن علامہ نوویؒ کی رائے یہ ہے کہ یہاں نفسِ کیل اور مد وصاع میں برکت مراد ہے؛ کیونکہ کیل وصاعوں میں اضافہ غلہ جات کی زیادتی کی علامت ہے۔

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ أَنَّهُ قَالَ كَانَ النَّاسُ إِذَا رَأَوْا أَوَّلَ الثَّمَرِ جَاءُوْا بِهِ إِلٰى رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَإِذَا أَخَذَهُ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْ ثَمَرِنَا وَبَارِكْ لَنَا فِيْ مَدِيْنَتِنَا وَبَارِكْ لَنَا

فِیْ صَاعِنَا وَبَارِكْ لَنَا فِیْ مُدِّنَا اَللّٰهُمَّ إِنَّ إِبْرَاهِيْمَ عَبْدُكَ وَخَلِيْلُكَ وَنَبِيُّكَ وَإِنِّيْ عَبْدُكَ وَنَبِيُّكَ وَإِنَّهُ دَعَاكَ لِمَكَّةَ وَإِنِّيْ أَدْعُوْكَ لِلْمَدِيْنَةِ بِمِثْلِ مَا دَعَاكَ بِهِ بِمَكَّةَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ ثُمَّ يَدْعُوْا (بَعْدَ الْفَرَاغِ) أَصْغَرَ وَلِيْدٍ يَرَاهُ فَيُعْطِيْهِ ذَالِكَ الثَّمَرَ.

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا (مدینہ میں) جب لوگ (اپنے باغات میں) نیا پھل دیکھتے تو اس کو لاکر دربارِ نبوی میں پیش فرمادیتے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب اس کو اپنے دستِ مبارک میں لیتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: اے اللہ! ہمارے پھلوں میں برکت نازل فرمادیجیے اور ہمارے شہر کو بھی بابرکت بنادیجیے، نیز ہمارے صاع میں برکت کا نزول فرمائیے اور ہمارے مدوں میں اضافہ فرمادیجیے، اے اللہ! ابراہیم علیہ السلام تیرے بندے، تیرے خلیل اور تیرے نبی ہیں اور میں بھی تیرا بندہ اور تیرا نبی ہوں، انہوں نے تجھ سے مکہ کے لیے (خیر وبرکت) کی دعا کی تھی اور میں تجھ سے مدینہ کے بارے میں وہی سوال کرتا ہوں جو انہوں نے مکہ کے بارے میں کیا تھا اور اس جیسے اضافہ کے ساتھ، پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم دعاؤں سے فارغ ہوجاتے تو جو مجلس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے چھوٹا لگتا اسے بلاتے اور اسی کو یہ پھل عطا فرمادیتے۔

تشریح: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کھجور وغیرہ کے باغات میں پھلوں کے آنے کی ابتدا ہوتی تو سب سے پہلے پھل توڑ کر خدمتِ اقدس میں لے کر حاضر ہوتے؛ تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں خیر وبرکت کی دعا دیں؛ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرماتے: اے اللہ! ہمارے پھلوں میں برکت نازل فرما یعنی جو پھل آچکے ہیں وہ سلامتی کے ساتھ باقی رہیں اور پھلوں میں اضافہ بھی ہوجائے اور فرماتے: اے اللہ! ہمارے شہر کے دیگر اُمور و معاملات میں خیر و عافیت کا معاملہ دیجیے اور وزن و پیمائش کے آلوں میں برکت فرمائیے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے: اے اللہ!

تیرے بندے، تیرے خلیل، تیرے نبی ابراہیم علیہ السلام نے جس طرح شہر مکہ کے لیے برکت کی دعا کی تھی جس کو قرآن نے بیان کیا ﴿فَاجْعَلْ اَفْئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْ اِلَیْهِمْ الاٰیۃ﴾ جس کو تو نے قبول فرمایا، میں بھی تیرا بندہ اور تیرا نبی ہوں اور مدینہ کے لیے برکت و خیریت کی دعا کرتا ہوں جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کے لیے کی تھی، نیز اسی کے ساتھ کچھ اضافہ فرما دیجیے؛ چنانچہ بخاری شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں "ضعفي ما جعلت بمكة من البركة" کے الفاظ ہیں۔

نیز محدثینِ کرام نے یہ توجیہ بھی کی ہے کہ پھلوں کو خدمت میں لانا اس لیے بھی تھا؛ تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عاملین کو بھیج کر اس میں خرص وتخمینہ کرائیں اور مقدارِ زکوٰۃ کا اندازہ لگائیں۔

علامہ باجیؒ فرماتے ہیں: ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کے لیے برکتِ دنیوی کی دعا کی تھی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ مدینہ کے لیے دعائے ابراہیم علیہ السلام اور اس کے ساتھ مثلہ معہ کا اضافہ فرمایا جس سے پتہ چلتا ہے اس سے مراد آخرت کی دعا ہے اور اس سے مدینہ کی مکہ پر برتری اور ثابت ہوتی ہے۔

(مکہ اور مدینہ میں سے کون زیادہ فضیلت رکھتا ہے؟ اس کا بیان آگے آئے گا)

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذکر کے وقت خلیل اللہ ہونے کو ذکر فرمایا اور اپنے آپ کو خلیل نہیں جتایا؟

تو حضرت مولانا یحییٰ صاحبؒ نے اس کی توجیہ یہ فرمائی کہ یہ ادب کے پیشِ نظر ہے کہ آپ نے اپنے اجداد کو ایک درجہ میں نہیں رکھا؛ بلکہ ان کو مزید خصوصیات کے ساتھ ذکر فرمایا۔

مَاجَاءَ فِيْ سُكْنَى الْمَدِيْنَةِ وَالْخُرُوْجِ مِنْهَا

اس باب میں مدینہ منورہ میں رہائش اختیار کرنے اور اس سے کوچ کرنے کے بارے میں فضائل و وعیدیں ذکر کی گئیں یعنی مدینہ میں سکونت اختیار کرنا باعثِ اجر وثواب اور اس سے نفرت و بے رغبتی قابلِ عقاب امر ہے۔

''شفا'' میں قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں: جن اسباب کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمایا اور جن چیزوں کا مشاہدہ فرمایا؛ بلکہ جو اشیاء آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مس ہوئی ہیں ان سے محبت والفت یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اعزاز واکرام اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کی دلیل ہے؛ چنانچہ حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما کو دیکھا گیا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر پر تشریف رکھنے کی جگہ پر ہاتھ رکھتے، پھر اسے اپنے چہرے پر مَل لیتے تھے اور لحاظِ ادب میں امام مالکؒ مدینہ منورہ کے اندر گھوڑے پر سوار نہ ہوتے، فرماتے مجھے اللہ سے شرم آتی ہے کہ میں گھوڑے کے کُھر سے اُس زمین کو روندوں جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں۔

مَالِكٌ عَنْ قَطَنِ بْنِ عُمَيْرِ بْنِ الْأَجْدَعِ أَنَّ يَحْنَسَ مَوْلَى الزُّبَيْرِ بْنِ الْعَوَّامِ أَخْبَرَهُ أَنَّهُ كَانَ جَالِسًا عِنْدَ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ فِي الْفِتْنَةِ فَأَتَتْهُ مَوْلَاةٌ لَهُ تُسَلِّمُ عَلَيْهِ فَقَالَتْ إِنِّي أَرَدْتُ الْخُرُوْجَ يَا أَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ اشْتَدَّ عَلَيْنَا الزَّمَانُ فَقَالَ لَهَا عَبْدُ اللهِ بْنُ عُمَرَ اقْعُدِيْ لُكَعُ فَإِنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَايَصْبِرُ عَلٰى لَأْوَائِهَا وَشِدَّتِهَا أَحَدٌ إِلَّا كُنْتُ لَهُ شَهِيْدًا أَوْ شَفِيْعًا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ.

ترجمہ: حضرت مالکؒ قطن بن عمیر بن سے اور وہ عویمر بن اجدع سے روایت کرتے ہیں کہ زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کے غلام یحنس نے ان کو بتلایا کہ وہ فتنہ کے زمانہ میں (ایک دن) عبداللہ ابنِ عمر رضی اللہ عنہما کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، اتنے میں ان کی ایک باندی آئی اور اس نے سلام کرنے کے بعد کہا کہ میں مدینہ سے کوچ کا ارادہ رکھتی ہوں اے ابوعبدالرحمٰن! مصائبِ زمانہ نے ہم کو آگھیرا ہے، تو ابنِ عمر رضی اللہ عنہما نے اس سے فرمایا پاگل عورت مدینہ منورہ میں ہی قیام پزیر رہ؛ اس لیے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص بھی (قیامِ مدینہ کے دوران) آنے والی سختیوں اور مصیبتوں پر صبر کا دامن پکڑے رہے گا تو قیامت کے دن میں اس کے حق میں گواہی دوں گا یا سفارش کروں گا۔

تشریح: علامہ زرقانیؒ فرماتے ہیں یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب فتنہ برپا ہوا تو حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما کی ایک باندی جو اس زمانہ میں تنگیٔ معاش، ظلم و زیادتی سے دوچار تھی، حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ میں مدینہ منورہ سے عراق یا شام کی طرف منتقل ہوجانا چاہتی ہوں، اس پر حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما نے اظہارِ ناراضگی فرماتے ہوئے بطورِ نصیحت اور شفقت ارشاد فرمایا: کمبخت! مدینہ کے قیام پر مضبوط رہ اور درپیش آلام و مصائب کے خوف سے صبر کو ہاتھ سے نہ جانے دے؛ کیونکہ جو شخص مدینہ شریف میں سکونت اختیار کرے اور پھر اس میں اگر اس کو تنگیٔ معاش وغیرہ لاحق ہو اور وہ ثبات قدمی اختیار کرے تو ایسے شخص کے بارے میں آقا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کے دن اس کے لیے گواہ یا سفارشی بننے کی بشارت سنائی ہے، لہٰذا تو بھی ان تکالیف کو برداشت کر اور جنت کی مستحق بن جا۔

حضرت مولانا یحییٰ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ مدینہ میں قیام کے دوران مصائب کو برداشت کرنے پر جو بشارت ہے وہ اتفاقی ہے یعنی اگر کسی کو تکلیف بھی نہیں پہنچی، پھر بھی وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارش و گواہی کا مستحق ہے، گویا کہ حدیث مبارکہ میں قیام فی المدینہ کی ترکیز ہے۔

لکاع ہندوستانی نسخوں میں یہی لفظ ہے جبکہ مصری نسخوں میں لکع ہے اور دونوں فصیح ہیں، بولا جاتا ہے: امرأة لكع وامرأة لكاع: کمینہ ہونا، بدنصیب ہونا اور یہاں اصل معنیٰ مراد نہیں؛ بلکہ تاکید اور توجہ مراد ہے۔

لأوائها بسکون الہمزۃ وتبدل ألفا: تکلیف، پریشانی اور یہاں شدتِ جوع مراد ہے۔

حدیث شریف کے اندر شفيعًا أو شهيدًا تردد کے ساتھ ہے، اس سلسلہ میں علامہ باجیؒ نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ یہ حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما کی جانب سے ہی ہو یا راوی کا شک ہے۔

قاضیؒ فرماتے ہیں بعض مشائخ نے "أو" "من قبيل الشك" مانا ہے؛ لیکن میرے

نزدیک یہ شک وتردد کے لیے مناسب نہیں ہے؛ کیونکہ اس حدیث کو صحابہ کرام کی ایک جماعت نے ''او'' کے ساتھ ہی بیان کیا ہے اور ایک بڑی جماعت کا یا ان کے راویوں کا شک پر اتفاق کر لینا بعید بات ہے؛ بلکہ زیادہ ظاہر یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح ارشاد فرمایا ہے، یا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اسی طرح جانا یا پھر تقسیم کے لیے ہے اور مطلب یہ ہوگا کہ بعض اہلِ مدینہ کے حق میں سفارش فرمائیں گے اور بعض کے حق میں گواہی دیں گے یا پھر گناہ گاروں کے لیے سفارش اور فرماں برداروں کے حق میں گواہی ہوگی، نیز ممکن ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں وفات پا گیا اس کے لیے شہادت اور بعدہ انتقال کرنے والے کے لیے سفارش وغیرہ توجیہات ہوسکتی ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا شہادت وسفارش کو خاص طور پر اہلِ مدینہ کے لیے بیان کرنا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ شہادت اور شفاعت عام شفاعت جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قیامت کے دن حاصل ہوگی اس سے الگ اور زائد ہے جو اہلِ مدینہ کے لیے ترقی درجات اور تخفیف عذاب کا سبب بنے گی، علی اختلاف العباد۔

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ أَنَّ أَعْرَابِيًّا بَايَعَ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الْإِسْلَامِ وَأَصَابَ الْأَعْرَابِيَّ وَعْكٌ بِالْمَدِيْنَةِ فَأَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللهِ أَقِلْنِي بَيْعَتِي فَأَبَى النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ جَاءَهُ فَقَالَ أَقِلْنِي بَيْعَتِي فَأَبَى ثُمَّ جَاءَهُ فَقَالَ أَقِلْنِي بَيْعَتِي فَأَبَى. فَخَرَجَ الْأَعْرَابِيُّ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّمَا الْمَدِيْنَةُ كَالْكِيْرِ تَنْفِي خَبَثَهَا وَيَنْصَعُ طِيْبُهَا.

ترجمہ: حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دیہاتی شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر بیعتِ اسلام کی، پھر وہ دیہاتی مدینہ کے بخار میں مبتلا ہوگیا؛ چنانچہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ! میری بیعت کو واپس کر دیجیے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع

فرما دیا، وہ پھر آیا اور کہا میری بیعت رَدّ کر دیجیے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر انکار فرما دیا، وہ پھر آیا اور وہی الفاظ دوہرائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر انکار فرمایا، آخر کار وہ دیہاتی شخص مدینہ سے خروج کر گیا، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مدینہ تو ایک دھونکنی کے مانند ہے جو اپنی گندگی کو صاف کر دیتا ہے اور خالص اشیاء کو باقی رکھتا ہے۔

تشریح: ایک دیہات کا شخص خدمتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوا اور اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر بیعتِ اسلام کا ارادہ کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے بیعت لے لی، پھر دوسرے دن وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا میں شدتِ بخار سے دوچار ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیعت واپس لے لیجیے، اس نے تین مرتبہ اقالۂ بیعت کی درخواست کی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر مرتبہ منع فرمادیا؛ چونکہ یہ بیعت علامہ زرقانیؒ کے قول کے مطابق فتح مکہ کے بعد تھی، لہٰذا بیعتِ اسلام ہوگی اور اسلام کے بعد کفر میں رجوع حرام ہے، اسی کو قاضی عیاضؒ نے اختیار فرمایا؛ لیکن اکثر محدثین کی رائے یہ ہے کہ بیعت کی واپسی کی بات صرف قیامِ مدینہ کے بارے میں تھی؛ چنانچہ ابنِ بطالؒ نے دلیل یہ دی ہے کہ اگر اس سے مراد رجوع عن الاسلام ہوتا تو اسے قتل کر دیا جاتا؛ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات نہ مان کر بضد رہا جو کہ علامتِ ارتداد ہے۔

(شرح الزرقانی: ۴/۶۲۔ اوجز المسالک: ۱۵/۵۸۲)

پھر اشکال ہوتا ہے کہ جب اعرابی کا ارادہ رجوع عن الاسلام نہیں تھا پھر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اقالۂ بیعت کیوں نہیں فرمایا؟ جواب یہ ہے کہ علماء نے فرمایا ہے کہ جب جو شخص قیام عند النبی کا ارادہ کر لے اس کے لیے بھی پھر رجوع الی البادیہ جائز نہیں ہے اور اعرابی سے اسلام اور قیام بالمدینہ دونوں پر بیعت کی تھی۔ (فتح الملہم: ۶/۵۲۸)

پھر اس اعرابی کے جانے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مدینہ ایک بھٹی کے مانند ہے جس طرح جب بھٹی میں لوہا ڈالا جاتا ہے تو وہ اس پر لگے گرد و غبار کو صاف کر دیتی

اور خالص لوہے کو نکھار دیتی ہے، اسی طرح مدینہ منورہ ایمانِ خالص والے اشخاص کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے اور منافقین، کفار اور عاصیوں کو اپنے سے دُور کر دیتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ گناہ گاروں کی طبیعت مدینہ جا کر منقبض رہتی ہے اور وہ وہاں سے جلد از جلد سامانِ واپسی تیار کر لیتے ہیں اور خالص مؤمنین تو ان کی طبیعت مدینہ پاک میں فرحت ومسرت محسوس کرتی ہے اور مدینہ کے مقابلے میں دنیا کا ہر خطہ ان کی نظر میں ہیچ ہے۔

وَعْك: واؤ کے فتحہ اور عین کے سکون کے ساتھ، معنیٰ ہیں بخار یا بخار کی تکلیف یا کپکپاہٹ۔

اصمعی کا کہنا ہے کہ گرمی کی شدت کو ''وعك'' کہتے ہیں، اسی سے سخت بخار کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ (فتح الباری: ۲۰۰/۱۳)

الكير: جمع أكيار وكير کاف کے کسرہ اور یاء کے سکون کے ساتھ: لوہار کی بھٹی۔

تُنفي: انفاء دُور کرنا نفي (ض) نفيًا.

خبث: وہ گندگی جس کو آگ ختم کر دیتی ہے، یہاں مراد جو خالص ایمان والا نہ ہو۔

ينصع: نصع (ف) نصعًا خالص کرنا۔

طِيْب: پاک صاف شئ، یہاں مراد خالص مؤمنین ہیں۔

سَعِيْدُ بْنُ يَسَارٍ يَقُوْلُ سَمِعْتُ أَبَاهُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ تَعَالىٰ عَنْهُ يَقُوْلُ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أُمِرْتُ بِقَرْيَةٍ تَأْكُلُ الْقُرىٰ يَقُوْلُوْنَ يَثْرِبُ وَهِيَ الْمَدِيْنَةُ تَنْفِي النَّاسَ كَمَا تَنْفِي الْكِيْرُ خَبَثَ الْحَدِيْدِ.

ترجمہ: سعید ابنِ یسار کہتے ہیں میں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو کہتے سنا وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجھے ایسی بستی کا حکم دیا گیا ہے جو تمام بستیوں کو کھا لے گی، لوگ اسے یثرب کہتے ہیں اور وہ مدینہ ہے، وہ لوگوں کو ایسے ہی دُور کر دیتا ہے جیسے بھٹی لوہے کی گندگی دُور کر دیتی ہے۔

تشریح: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے ہجرت کے بارے میں فرمایا کہ مجھے ایک بستی کی طرف ہجرت کا حکم ملا ہے جو تمام بستیوں پر غالب آئے گی، اکثر محدثین نے حدیث کے اندر لفظ ''اکل'' سے مراد غلبہ لیا ہے؛ کیونکہ کھانے والا شئ مؤکول پر غالب ہوتا ہے، گویا اس میں بشارت ہے کہ مدینہ منورہ فتوحات کے ذریعہ تمام بستیوں پر غالب آئے گا اور اموالِ غنیمت مدینہ میں سمٹ کر آجائیں گے؛ اور اہلِ مدینہ انہیں اموال کو کھائیں گے۔

امام نوویؒ، ابنِ وہبؒ، ابنِ بطالؒ اور حافظ ابنِ حجرؒ وغیرہ نے اسی کو لیا ہے، نیز ابن المنیرؒ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد مدینہ کی تمام شہروں پر فضیلت بھی ہوسکتی ہے۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کچھ لوگ اس کو یثرب کہتے ہیں؛ چنانچہ منافقین یہود وغیرہ مدینہ کو یثرب کہتے تھے؛ حالانکہ اس کے شایانِ شان نام مدینہ ہے۔

اسی وجہ سے بعض علماء کے نزدیک مدینہ کو یثرب کہنا مکروہ ہے اور قرآنِ کریم میں یثرب کہنا بطورِ حکایت منافقین ہے۔

اور مدینہ کی شان یہ ہے کہ وہ بدطینت، بداعمال لوگوں کو اپنے سے دُور کردیتا ہے جیسے آگ لوہے کے زنگ اور مٹی کو دُور کردیتی ہے۔

مَالِكٌ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ اَبِيْهِ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يَخْرُجُ أَحَدٌ مِنَ الْمَدِيْنَةِ رَغْبَةً عَنْهَا إِلَّا أَبْدَلَهَا اللهُ خَيْراً مِّنْهُ.

ترجمہ: جو کوئی مدینہ منورہ سے نفرت کرتے ہوئے نکل کر چلا جائے تو اللہ تعالیٰ شہر مدینہ کو اس سے بہتر شخص (اقامت کے لیے) عطا فرمادیں گے۔

تشریح: اس حدیث میں ان لوگوں کے لیے وعید ہے جو مدینہ سے نفرت کرتے ہوئے وہاں رہائش کو ترک کردیں۔

نیز لفظ ''رغبۃ عنها'' سے ایک اعتراض کا جواب دیا گیا ہے، اعتراض یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک بڑی جماعت نے مدینہ طیبہ کو خیر باد کہہ کر دیگر مقامات پر

رہائش اختیار کرلی، نیز جو شخص حج وعمرہ اور زیارتِ مدینہ کی غرض سے وہاں حاضر ہوتا ہے بالآخر وہ بھی مدینہ سے اپنے وطن کی طرف کوچ کر جاتا ہے؟

اسی کے جواب میں حدیثِ پاک کی وضاحت ہے کہ جو شخص مدینہ کو وطن بنانے کے بعد اس سے ناپسندیدگی اور اعراضاً کسی دوسری جگہ کو اپنا وطن بنالیتا ہے تو ایسا شخص گویا ناقابلِ مبارک، بدنصیب ہے اور اس کے جانے کے بعد اللہ تعالیٰ مدینہ میں کسی ایسے شخص کو اقامت عطا کرتے ہیں جو اس سے بہتر ہوتا ہے۔

رہی صحابہ رضی اللہ عنہم کی مقدس جماعت، تو ان حضرات کا مدینہ کو چھوڑنا اشاعتِ دین اور تشہیر اسلام کی خاطر تھا نہ کہ اس سے محبت نہ ہونے کی وجہ سے، یہی وجہ تھی کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت اس بات کی خواہش مند تھی کہ ان کی موت بھی مدینہ میں آئے؛ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ دعا فرماتے: اے اللہ! مجھے مدینۂ رسول میں رہتے ہوئے شہادت نصیب فرما، آخرکار آپ رضی اللہ عنہ کی دعا قبول ہوئی اور فیروز لؤلؤ کے ہاتھوں مسجد نبوی میں نمازِ فجر پڑھاتے ہوئے آپ رضی اللہ عنہ نے جامِ شہادت نوش فرمایا، اسی طرح امام مالکؒ جب مدینہ سے باہر کسی ضرورت کے سبب تشریف لے جاتے تو جلد از جلد واپسی کے بارے میں فکر مند رہتے۔

اسی طرح زائرینِ مدینہ اور قبرِ اطہر کا وہاں سے واپسی کرنا بطورِ کراہت ونفرت نہیں ہوتا۔

عَنْ سُفْيَانَ بْنِ أَبِيْ زُهَيْرٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالىٰ عَنْهُ أَنَّهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ تُفْتَحُ الْيَمَنُ فَيَأْتِيْ قَوْمٌ يَبُسُّوْنَ فَيَتَحَمَّلُوْنَ بِأَهْلِيْهِمْ وَمَنْ أَطَاعَهُمْ وَالْمَدِيْنَةُ خَيْرٌ لَّهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ إلخ.

ترجمہ: سفیان بن ابی زہیر کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا: یمن فتح ہوگا تو ایک قوم مدینہ آئے گی ٹہلتی ہوئی یا سواری پر چلتی ہوئی اور اپنے گھر والوں اور اپنے اطاعت گزاروں یعنی اپنے قریبی لوگوں کو لے جائے گی؛ حالانکہ مدینہ ان کے لیے بہتر ہے الخ

تشریح: اس حدیث میں دوسرے شہروں پر مدینہ کی فضیلت کو بتلایا گیا ہے اور وہاں رہنے کی ترغیب دی گئی ہے کہ فتوحات کی وجہ سے اگرچہ دوسرے شہروں میں وسعت ہوجائے گی؛ لیکن مدینہ کی رہائش تمام شہروں کے مقابلہ میں مبارک اور باعثِ اجر ہے، لہٰذا دنیوی مال ودولت کی وسعت کی وجہ سے مدینہ کی اقامت کو ترک نہ کیا جائے اگر وہاں کچھ پریشانیاں پیش آجائیں تو ان پر صبر کیا جائے۔

بس (ن) بسًاسار یعنی چلنا،بعض کے نزدیک ... چلنا یا تیز تیز قدموں سے چلنا۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَتُتْرَكَنَّ الْمَدِيْنَةَ عَلىٰ أَحْسَنِ مَا كَانَتْ حَتّٰى يَدْخُلَ الْكَلْبُ وَالذِّئْبُ فَيَغْذِيْ عَلىٰ بَعْضِ سَوَارِيْ الْمَسْجِدِ أَوْ عَلَى الْمِنْبَرِ قَالُوْا يَارَسُوْلَ اللهِ فَلِمَنْ تَكُوْنُ الثِّمَارُ ذٰلِكَ الزَّمَانَ قَالَ لِلْعَوَافِي الطَّيْرِ وَالسِّبَاعِ.

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مدینہ اس سے بھی اچھی حالت میں چھوڑا جائے گا، یہاں تک کہ اس میں کتے اور بھیڑیے داخل ہوکر مسجد کے بعض ستونوں یا منبر پر پیشاب کریں گے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یارسول اللہ! اس زمانہ کے پھل کس کے لیے ہوں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حاجت مند پرندوں اور درندوں کے لیے۔

تشریح: اس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پیشین گوئی فرمائی ہے کہ مدینہ پر ایک ایسا وقت بھی آئے گا کہ اس کی عمدہ حالت یعنی اس کی یہ وسعت، خیر وبھلائی سب ختم ہوجائے گی اور اس کی ویرانگی کا یہ عالم ہوگا کہ کتے اور بھیڑیے مسجد کے ستونوں اور منبر پر پیشاب کرتے پھریں گے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا جب لوگ یہاں نہ رہیں گے اور مدینہ میں رہائش متروک ہوجائے گی تو یہاں کے پھل وغلات کس کے کام آئیں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً فرمایا بھوکے پیاسے پرندوں اور درندوں کے۔

یہاں سوال یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشین گوئی جس زمانہ کے لیے ہے آیا وہ آچکا یا بعد میں آئے گا؟

جواب: قاضی عیاضؒ کا خیال یہ ہے کہ یہ شروع زمانہ کی بات ہے، اس وقت مدینہ دینی اور دنیوی دونوں اعتبار سے ترقی پر تھا، پھر وہاں سے خلافت شام منتقل ہوگئی اور علماء و اہلِ فضل سب کوچ کر گئے اور یہ سب فتنہ کے وقت پیش آیا تھا، اس وقت خوف ودہشت میں وہاں سے لوگ منتقل ہو گئے تھے؛ لیکن بعد میں وہ دوبارہ لوٹ کر آگئے اسی کی طرف علامہ زرقانیؒ کا میلان ہے جبکہ امام نوویؒ نے فرمایا یہ صورتِ حال قربِ قیامت میں پیش آئے گی، اگر پیش آچکی ہوتی تو اس اہم بات کو تواتر کے ساتھ بیان کیا جاتا۔ حافظ ابنِ حجرؒ کا رجحان یہی ہے اور بعض لوگوں نے فرمایا یہ اس وقت پیش آئے گا جب خلیفہ مہدی رضی اللہ عنہ مدینہ سے بیت المقدس کی طرف کوچ کر جائیں گے۔

لغات: غذى تغذية يغذى يبول دفعة بعد دفعة: وقفہ وقفہ سے پیش کرنا۔

سواري جمع سارية: أعمدة، ستون۔

مَالِكٌ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ عُمَرَ بْنَ عَبْدِ الْعَزِيْزِ حِيْنَ خَرَجَ مِنَ الْمَدِيْنَةِ الْتَفَتَ إِلَيْهَا فَبَكَىٰ ثُمَّ قَالَ يَا مُزَاحِمُ اَتَخْشَىٰ أَنْ نَكُوْنَ مِمَّنْ نَفَتِ الْمَدِيْنَةُ.

ترجمہ: امام مالکؒ کو یہ بات پہنچی ہے جب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ مدینہ سے شام واپسی کے لیے نکلے تو اس کی طرف متوجہ ہوکر رونے لگے، پھر فرمایا: اے مزاحم! یا تم ڈرتے ہو کہ ہم ان لوگوں میں سے ہوں جن کو مدینہ سے نکال دیا گیا ہے؟

تشریح: عبدالملک نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو مدینہ کا گورنر بنا کر بھیجا تھا انہوں نے وہاں اپنے زمانۂ ولایت تقریباً سات سال قیام فرمایا، پھر جب معزول ہو گئے اور واپس شام لوٹنے لگے، تو مدینہ کے فراق میں بہت روئے اور اپنے غلام کو مخاطب کر کے فرمایا: مجھے اس بات کا ڈر ہے کہ کہیں ہم لوگ ان میں سے نہ ہوں جن میں نفاق اور خباثت ہوتی ہے؛ کیونکہ مدینہ اپنے اندر کے خبث اور گندگی کو باہر پھینک دیتا ہے۔

لغات: نفى نفيا: دور کردینا، ہٹانا۔

مزاحم: عمر بن عبدالعزیزؒ کے غلام کا نام ہے۔

مَا جَاءَ فِيْ تَحْرِيْمِ الْمَدِيْنَةِ.

(مدینہ منورہ کی حرمت کا بیان)

حرمِ مدینہ کے سلسلہ میں فقہاء کا اختلاف ہے:

امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک مدینہ کا حرم مکہ کے حرم کی طرح ہے، لہٰذا اس کے جانوروں کا شکار کرنا، درختوں اور گھاس کو کاٹنا جائز نہیں ہے، ان حضرات کی دلیل: ''المدينة حرام مابين عير إلى ثور''. (بخاری) وقال إني أحرمها مابين لابتي المدينة. ہے اور اگر کوئی حرمِ مدینہ کے درختوں اور گھاس کو کاٹتا ہے یا شکار کرتا ہے اس کی جزا کے سلسلہ میں دو قول ہیں:

(۱) اس بارے میں کوئی جزا واجب نہ ہوگی؛ کیونکہ حرمِ مدینہ ایسی جگہ ہے جہاں بغیر احرام کے داخل ہوسکتے ہیں، یہ اکثر اہلِ علم امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کا قول ہے۔

(۲) حرمِ مدینہ میں حرمِ مکہ کی طرح جزا واجب ہوگی؛ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں مدینہ کو ویسا ہی حرام قرار دیتا ہوں جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرام قرار دیا ہے، نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے درختوں کو کاٹنے اور جانور کو شکار کرنے سے منع فرمایا ہے۔

پھر جن کے نزدیک اس میں جزا واجب ہے اس کی کیفیت یہ ہے کہ شکاری کی سلب کو لے لیا جائے گا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: من أخذ أحدا يصيد فيه فيسلبه. (ابوداؤد) یعنی جب کوئی کسی شکاری کو مدینہ میں پکڑے تو اس کا سامان لے لے؛ یہاں تک کہ اس شخص کے مکمل کپڑے لے لیے جائیں؛ البتہ اس کی سواری کو نہیں لیا جائے۔

امام ابوحنیفہؒ اور سفیان ثوریؒ کے نزدیک حرمِ مدینہ حرمِ مکہ کی طرح نہیں ہے، لہٰذا وہاں کے درخت کو کاٹنا اور شکار کرنا ناجائز تو نہیں ہے؛ البتہ مکروہ ہے۔

ان حضرات کا استدلال مسلم شریف کی ایک روایت سے ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا تخبط منها شجرة إلا لعلف. یعنی جانوروں کی خوراک کے لیے درخت کاٹ سکتے ہیں۔ اگر حرمِ مدینہ حرم مکی کی طرح ہوتا تو کسی بھی طرح قطعِ شجر کی اجازت نہ ہوتی، اسی طرح مشہور حدیث ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت انس رضی اللہ عنہ کے بھائی عمیر سے ان کی بلبل کے گم ہو جانے پر مزاح فرماتے تھے، اگر مدینہ کا حرم مکہ کے مانند ہوتا تو پرندہ کو پکڑ کر اس سے کھیلنے کی اجازت ہرگز نہ ہوتی۔

نیز حرمِ مدینہ کے حقیقی حرم ہونے کی صورت میں اس کی جزا کے بارے میں تفصیل بیان کی جاتی جیسا کہ حرمِ مکہ کی جزا کے سلسلہ میں قرآن وحدیث میں مکمل تفصیل موجود ہے۔

ائمہ ثلاثہؒ کے استدلال کا جواب:

جو دلائل جمہور نے پیش کیے ہیں ان میں حرم سے مراد مدینہ کا احترام، عزت اور زینت ہے، کہ درختوں اور گھاس کو کاٹ کر اس کی زینت اور خوبصورتی کو پامال نہ کیا جائے، جیسا کہ ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ مدینہ کے ٹیلوں کو منہدم نہ کیا جائے؛ کیونکہ یہ اس کی زینت ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایک مسلمان ہونے کے ناطے ہر شخص پر مدینہ کا احترام واجب ہے، تاہم حرمِ مدینہ کی کیفیت حرمِ مکہ سے جدا ہے، حرمِ مکہ کی عظمت وحرمت مدینہ سے بڑی ہے؛ چنانچہ وہاں بغیر احرام کے داخل نہیں ہو سکتے اور وہاں کسی جرم کے ارتکاب پر دم دینا واجب ہو جاتا ہے جبکہ حرمِ مدینہ میں ارتکابِ جرم کی صحیح قول کے مطابق کوئی جزا نہیں ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ طَلَعَ لَهُ أُحُدٌ فَقَالَ هٰذَا جَبَلٌ يُحِبُّنَا وَنُحِبُّهُ اَللّٰهُمَّ إِنَّ إِبْرَاهِيْمَ حَرَّمَ مَكَّةَ وَإِنِّيْ أُحَرِّمُ مَا بَيْنَ لَابَتَيْهَا.

ترجمہ: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے (کسی سفر سے واپسی پر) جب احد پہاڑ نظر آنے لگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ ایسا پہاڑ ہے جو ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت رکھتے ہیں، اے اللہ! ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرم بنایا ہے اور میں دونوں لابوں کی درمیانی جگہ کو حرم بناتا ہوں۔

تشریح: حدیثِ پاک میں دو چیزیں موضوعِ بحث ہیں: (۱) پہاڑ اور مؤمنین کے مابین محبت کا مطلب (۲) ابراہیم علیہ السلام کے مکہ کو حرم قرار دینے کے معنیٰ۔

(۱) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کسی سفر سے مدینہ واپس ہو رہے تھے (ایک قول کے مطابق خیبر سے اور بعض لوگوں کے قول کے مطابق حج اور بعض کے نزدیک تبوک سے واپسی پر) جب مدینہ کے قریب پہنچے اور احد پہاڑ جب نظر کے سامنے پڑا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ ایسا پہاڑ ہے جو ہم سے محبت کرتا ہے۔

پہاڑ کے محبت کرنے کے مختلف معنیٰ بیان کیے گئے ہیں، مثلاً (۱) اہلِ احد اور اس سے مراد انصار ہیں (۲) حقیقتاً پہاڑ نبی سے محبت کرتا ہے؛ کیونکہ بعض غیر جاندار چیزوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطبت کا شرف حاصل ہے یعنی جمادات میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت رکھ دی گئی تھی، اس کو علامہ زرقانیؒ بیان فرمایا ہے (۳) سہیلیؒ فرماتے ہیں: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نیک فالی اور اچھے اسماء کو پسند فرماتے تھے اور احد پہاڑ غلبۂ دین اور اس کے ارتفاع کا اشارہ کرتا ہے، تو گویا وہ ہم سے محبت کرتا ہے۔

اور چونکہ وہ ہم سے محبت کرتا ہے ہم بھی اس سے محبت کرتے ہیں، نیز یہ کہ اُحد جنت کے پہاڑوں میں سے ہے، یا ہم اس کے پاس رہنے والوں یعنی انصار سے محبت کرتے ہیں۔

(۲) پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ میں حرم کے حدود کی تعیین کے لیے دعا کی تھی اور اے اللہ! تو نے وہ دعا قبول فرمائی اور ایک متعینہ حصہ کو حرم قرار دے دیا گیا، یا یہ کہ ابراہیم علیہ السلام کو اپنے اجتہاد سے حدودِ حرم طے کرنے کا اختیار دیا تھا، اسی طرح نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مدینہ کے لیے حدودِ حرم کی دعا کی اور مدینہ کا حرم دولابوں کے درمیان طے پایا جو تقریباً ۱۲/میل ہے، جبلِ ثور سے جبلِ عیر تک۔

یہ حدیث فریقِ اوّل کی دلیل ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حرمِ مدنی کو حرمِ مکی سے تشبیہ دی ہے، لہٰذا جو چیزیں حرمِ مکی کے اندر حرام ہوں گی وہ یہاں بھی حرام ہوں گی۔

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ أَنَّهُ كَانَ يَقُوْلُ لَوْ رَأَيْتُ الظِّبَاءَ تَرْتَعُ بِالْمَدِيْنَةِ مَا ذَعَرْتُهَا قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا بَيْنَ لَابَتَيْهَا حَرَامٌ.

ترجمہ: سعید بن مسیبؒ سے روایت ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: اگر مدینہ میں ہرن کو چرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو میں اسے ڈراتا اور بھگاتا نہیں ہوں (یعنی شکار نہیں کرتا) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مدینہ کے دونوں لابوں کے درمیان حرم ہے۔

لابۃ: اس پتھریلی زمین کو کہتے ہیں جس میں کالے پتھر ہوتے ہیں۔

عَنْ أَبِيْ أَيُّوْبَ الْأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ أَنَّهُ وَجَدَ غِلْمَانًا قَدْ أَلْجَءُوْا ثَعْلَبًا إِلٰى زَاوِيَةٍ فَطَرَدَهُمْ عَنْهُ.

قَالَ مَالِكٌ عليه الرحمة: لَا أَعْلَمُ أَنَّهُ قَالَ أَفِيْ حَرَمِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصْنَعُ هٰذَا؟

ترجمہ: حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے چند لڑکوں کو دیکھا کہ انہوں نے ایک

لومڑی کو ایک کونے میں گھیر رکھا ہے، حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ نے انہوں کو ڈانٹا (یعنی ان سے اسے چھڑوایا)۔

امام مالکؒ کہتے ہیں میں نہیں جانتا؛ مگر حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا حرمِ رسول میں بھی یہ کیا جائے گا (امام مالکؒ کو اس جملہ کے بارے میں شک ہے کہ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے ان لڑکوں کے فعل پر نکیر کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ معزز مقام جس کا احترام ووقار آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوگیا ہو وہاں بھی جانور کو شکار اور قید کیا جائے گا) یعنی حرمِ مدینہ میں یہ سب حرکتیں نہیں ہونی چاہئیں۔

الجاء الجاءً: مجبور کرنا، مضطرب کرنا، کسی جگہ سمیٹ دینا۔

عَنْ رَجُلٍ قَالَ دَخَلَ عَلَيَّ زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ وَأَنَا بِالْأَصْوَافِ قَدِ اصْطَدْتُّ نُهَسًا فَأَخَذَهُ مِنْ يَدِيْ فَأَرْسَلَهُ.

ترجمہ: ایک شخص (شرحبیل بن سعد) کہتے ہیں کہ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ میرے پاس تشریف لائے اور میں مقامِ اصواف میں تھا، میں نے ایک پرندہ شکار کر رکھا تھا، پس انہوں نے میرے ہاتھ سے اس پرندہ کو لیا اور اسے چھوڑ دیا۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ''اسواف'' دولابوں کے درمیان ایک مقام کا نام ہے اور بعض شراح نے فرمایا اس میں تحریف ہوئی ہے، اصل میں یہ اسواق تھا۔

حضرت زید نے اس لیے اس پرندہ کو لے کر چھوڑ دیا؛ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو پکڑنے سے منع فرمایا ہے؛ لیکن اگر کوئی شخص حرمِ مدینہ کے باہر سے شکار کر کے لائے تو اسے چھوڑنے کو نہیں کہا جائے گا۔

لغت: نهسٌ نون کے ضمہ اور ''ہ'' کے فتحہ کے ساتھ ایک پرندہ جو اکثر اپنی دم ہلاتا رہتا ہے۔

مَاجَاءَ فِيْ وَبَاءِ الْمَدِيْنَةِ

حافظؒ فرماتے ہیں وبا مقصور بالہمز اور بغیر الہمز دونوں طرح پڑھا جاتا ہے، اور وبا عام بیماری کو کہتے ہیں، بعض لوگ اس کا اطلاق طاعون وغیرہ پر بھی کرتے ہیں؛ لیکن ہر وبا

طاعون نہیں ہوتی ہے، علامہ ابنِ اثیرؒ نے نہایہ میں فرمایا: وبا کے معنیٰ طاعون اور ایسی بیماری کے ہیں جس سے فضاء میں فساد ہوجاتا ہے اور پھر اس سے مزاج اور جسم میں تکدر پیدا ہونے لگتا ہے۔

حافظؒ فرماتے ہیں: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے وقت مدینہ میں بہت زیادہ وبا پھیلی ہوئی تھی؛ لیکن مدینہ کی وبا بخار تھی جیسا کہ حدیث میں اس کی صراحت ہے۔

(فتح الباری: ۱۰؍۱)

علامہ زرقانیؒ فرماتے ہیں: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقامِ وباء کی طرف جانے کی نہی کے باوجود ہجرت اس لیے کی؛ کیونکہ جس مقامِ وباء کی طرف جانے سے روکا گیا ہے اس سے مراد ایسی عام بیماری ہے جس کی وجہ سے موتوں کا وقوع ہورہا ہو اور مدینہ میں جو بیماری تھی وہ ایک بخار تھا، جو اکثر اجنبی لوگوں کو ہوجاتا تھا یا یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے وقت نہی وارد نہیں ہوئی تھی قاله عياض. (زرقانی: ۴)

عَنْ عَائِشَةَ أُمِّ الْمُؤْمِنِيْنَ أَنَّهَا قَالَتْ لَمَّا قَدِمَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَدِيْنَةَ وَعِكَ أَبُوْ بَكْرٍ وَبِلَالٌ قَالَتْ فَدَخَلْتُ عَلَيْهِمَا فَقُلْتُ يَا أَبَتِ كَيْفَ تَجِدُكَ؟ وَيَا بِلَالُ كَيْفَ تَجِدُكَ قَالَتْ فَكَانَ أَبُوْ بَكْرٍ إِذَا أَخَذَتْهُ الْحُمّٰى يَقُوْلُ:

كُلُّ امْرِئٍ مُّصَبَّحٌ فِيْ أَهْلِهِ ۔۔۔ وَالْمَوْتُ أَدْنٰى مِنْ شِرَاكِ نَعْلِهِ

وَكَانَ بِلَالٌ إِذَا أُقْلِعَ عَنْهُ يَرْفَعُ عَقِيْرَتَهُ فَيَقُوْلُ:

أَلَا لَيْتَ شِعْرِيْ هَلْ أَبِيْتَنَّ لَيْلَةً ۔۔۔ بِوَادٍ وَّحَوْلِيْ إِذْخِرٌ وَّجَلِيْلٌ

وَهَلْ أَرِدَنْ يَوْمًا مِيَاهَ مَجَنَّةٍ ۔۔۔ وَهَلْ يَبْدُوَنْ لِيْ شَامَةٌ وَّطَفِيْلٌ

قَالَتْ عَائِشَةُ فَجِئْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَخْبَرْتُهُ فَقَالَ اللّٰهُمَّ حَبِّبْ إِلَيْنَا الْمَدِيْنَةَ كَحُبِّنَا مَكَّةَ أَوْ أَشَدَّ وَصَحِّحْهَا وَبَارِكْ لَنَا فِيْ صَاعِهَا وَمُدِّهَا وَانْقُلْ حُمَّاهَا وَاجْعَلْهَا بِالْجُحْفَةِ.

ترجمہ: اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو حضرت ابوبکر اور حضرت بلال رضی اللہ عنہما کو بخار ہو گیا، پس میں ان کے پاس گئی اور میں نے کہا: اے ابا جان! کیسا محسوس کر رہے ہو؟ اور بلال! تمہاری طبیعت کیسی ہے؟ فرماتی ہیں حضرت ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کی عادت تھی کہ جب ان کو بخار آتا تھا تو وہ یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

''ہر شخص اپنے خاندان میں ''صبح مبارک'' کہا جاتا ہے؛ حالانکہ موت اس کے چپل کے تسمہ سے بھی زیادہ قریب ہے''

اور جب حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا بخار اُترتا تھا تو وہ بلند آواز سے کہتے تھے:

''کاش! مجھے معلوم ہوتا کہ میں کوئی رات وادی مکہ میں گزاروں گا اور میرا اِردگرد اذخر اور جلیل گھاس ہو گی''

''اور کیا میں کسی دن مجنہ نامی چشمہ پر اُتروں گا؟ اور کیا میرے لیے شامہ اور طفیل پہاڑ ظاہر ہوں گے؟''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں نے واپس آکر اس کی اطلاع آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اللہ! ہمارے دلوں میں مدینہ کی محبت مکہ کی طرح پیوست فرما دیجیے؛ بلکہ اس سے بھی زیادہ اور مدینہ کو ہمارے لیے صحت افزا بنا دیجیے اور ہمارے لیے صاع اور مد میں برکت فرما دیجیے اور اس کے بخار کو منتقل کر کے اسے جحفہ پہنچا دیجیے۔

تشریح: ہجرت سے پہلے مدینہ کو وباء الارض کہا جاتا تھا اس زمانہ میں عقیدہ تھا جب کوئی شخص مدینہ جاتا تھا تو اس سے کہا جاتا تھا یثرب کی وباء سے بچنے کے لیے گدھے کی طرح آواز نکالو۔

جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب مدینہ ہجرت کر کے آئے، بہت سے لوگ بخار میں مبتلا ہو گئے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میرے والد ابوبکر اور

حضرت بلال رضی اللہ عنہما کو بھی بخار ہوگیا تھا، میں ان کی عیادت کے لیے گئی اور حالت دریافت کی تو دونوں ہی تکلیف میں تھے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی عادت تھی کہ وہ بیمار ہوتے تو ایک شعر پڑھا کرتے تھے:

كل امرئ إلخ: یعنی کسی شخص کے گھر والے ابتداءِ دن میں اسے صبح بخیر اور صبح مبارک کہتے ہیں؛ حالانکہ اس کی موت اس سے بھی زیادہ قریب ہوتی جتنا چپل کا تسمہ پیر سے ہوتا ہے یعنی پتہ نہیں چلتا کہ کب اچانک دن کے بقیہ حصہ میں اسے موت آجاتی، گویا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ دنیاوی زندگی کی عدمِ حیثیت اور بے معنیٰ ہونے کو بیان کرتے تھے کہ انسان صحت وتندرستی کی زندگی گزارتا ہے، اسی دوران اچانک موت آتی ہے اور لقمۂ اجل بن جاتا ہے۔

اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ شعر پڑھا کرتے:

ألا ليت شعري إلخ: حضرت بلال رضی اللہ عنہ مکہ سے خروج اور وباء الارض میں داخل ہونے پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہتے تھے کہ میں مکہ میں ہی رہتا اور میرے اِردگرد اذخر اور جلیل نامی گھاس ہوتی اور چشمہ مجنہ پر جاتا (مکہ کے قریب ایک چشمہ کا نام ہے) اور مکہ کے شامہ اور طفیل پہاڑوں کو دیکھتا۔

ہائے افسوس! مکہ کی زندگی کو الوداع کہنا پڑا؛ اسی لیے عتبہ، شیبہ اور امیہ بن خلف پر لعنت بھیجتے تھے کہ انہوں نے ہمیں مکہ سے وباء الارض کی طرف نکلنے پر مجبور کردیا۔

نوٹ: یہ اشعار حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے اپنے نہیں ہیں۔

جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور ان کے اشعار کو سنایا اور ان کی باتوں کا ذکر کرتے ہوئے ان دونوں کی بیماری کی اطلاع دی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے لیے دعاء فرمائی: اے اللہ! ہمارے دلوں میں مدینہ کی محبت اس سے زیادہ پیدا فرمادیجیے جتنی ہم مکہ سے کرتے ہیں اور مدینہ کی آب وہوا کو اتنا بہتر بنادیجیے کہ وہ ہمارے لیے صحت افزا بن جائے اور مدینہ کے صاعوں، مدوں اور تمام

پیمانوں میں برکت پیدا فرمادیں اور مدینہ کے بخار کو یہاں سے جحفہ میں منتقل فرمادیں، اس زمانہ میں جحفہ یہودیوں کا مسکن تھا؛ اس لیے آپ نے دعا میں اس کا ذکر فرمایا، اس سے معلوم ہوا کافر دشمنِ اسلام کے لیے بیماری وہلاکت کی دعا کرنا جائز ہے۔

علامہ زرقانیؒ فرماتے ہیں: اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے مدینہ کی آب وہوا، موسم اور وہاں کی زندگی تمام جگہوں کے مقابلہ میں سب سے بہتر ہے؛ ورنہ اس سے پہلے وہاں وباء کا یہ عالم تھا کہ اگر وہ کوئی شخص مدینہ کا پانی پی لیتا تو فوراً بخارزدہ ہوجاتا تھا، یہاں تک کہ اگر کوئی پرندہ بھی وہاں سے گزرتا تو بخارزدہ ہوکر گرجاتا تھا۔

لغات: كيف تجدك أي تجد نفسك والمراد به الاحساس.

مُصَبَّحٌ بضم الميم على وزن محمد، المراد أنه يقال له ""صباح الخير"" في أهله، وقد يفجأ الموت في بقية النهار.

شراك: بكسر الشين والخافة الراء، السير الذي يكون في وجه النعل.

اقلع الكف عن الأمر: یہاں مراد ہے بخار کا ختم ہوجانا۔

يرفع عقيرته، بفتح العين وكسر القاف: روتے ہوئے آواز کو بلند کرنا۔

أبيتنَّ مضارع من البيتوتة: رات گزارنا۔

إزخر: مکہ کی ایک خوشبودار چوڑے پتے والی گھاس، حشيشة مكية ذو رائحة.

جليل نبت ضعيف أصفر: پیلی ہلکی گھاس۔

أَرِدَنْ بنون التاكيد من الوُرودِ: چشمہ یا گھاٹ پر آنا۔

مجنه بفتح الميم وكسر الجيم: مکہ سے چند میل پر ایک مقام کا نام ہے۔

يَبْدُوْنَ بنون تأكيد مخففة، من البدو ظاهر ہونا۔

شامة وطَفيل بفتح الطاء وكسر الفاء جبلان بمكة على نحو ثلاثين ميلا.

جمہور کے نزدیک تو یہ دونوں پہاڑ ہی ہیں؛ لیکن خطابیؒ نے فرمایا ہے یہ دونوں چشمے ہیں۔

أَنَّ عَائِشَةَ قَالَتْ وَكَانَ عَامِرُ بْنُ فُهَيْرَةَ يَقُوْلُ:

قَدْ رَأَيْتُ الْمَوْتَ قَبْلَ ذَوْقِهِ إِنَّ الْجَبَانَ حَتْفُهُ مِنْ فَوْقِهِ

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں اور عامر بن فہیرہ (حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے غلام) کہتے ہیں:

میں موت کی شدت کو اس کے چکھنے یعنی آنے سے پہلے دیکھ چکا ہوں اور بزدل شخص کی موت بھی آسمان سے ہی آتی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ بسا اوقات بیماری اتنی سخت ہوجاتی ہے کہ موت سے پہلے ہی اس کی شدت آدمی چکھ لیتا ہے؛ لیکن بہترین آدمی وہ ہے، جو ہمت وحوصلہ اور صبر سے کام لیتا ہے؛ کیونکہ بزدلی اور بے صبری اختیار کرنے پر بھی انسان موت سے نہیں بچ سکتا ہے جب اس کا وقت آجائے۔

نوٹ: یہ شعر پہلی مرتبہ عمر بن امارہ نے کہا تھا۔

جَبَان، ضعيف القلب، ضد الشجاع. حتف، الاختناق أي الموت.

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ تَعَالىٰ عَنْهُ أَنَّهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلىٰ أَنْقَابِ الْمَدِيْنَةِ مَلٰئِكَةٌ لَا يَدْخُلُهَا الطَّاعُوْنَ وَلَا الدَّجَّالُ.

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مدینہ کے راستوں پر فرشتوں کا پہرہ ہے، اس میں طاعون اور دجال داخل نہیں ہوسکتے۔

تشریح: لایدخلها الطاعون: مدینہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقدس شہر ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت ونگرانی کے لیے فرشتوں کو متعین کر رکھا ہے، لہٰذا وہاں کبھی طاعون اور دجال نہ داخل نہ ہوسکیں گے۔ اب علماء کے درمیان اس بارے میں بحث ہے کہ یہ حکم ہر زمانہ کے لیے ہے یا زمانۂ نبوی کے ساتھ خاص ہے؟

حافظ ابن حجرؒ کے کلام سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ یہ حکم تمام زمانوں کو محیط ہے؛ اسی لیے

بعض علماء نے اس کو معجزہ قرار دیا ہے کہ مدینہ کا طاعون سے محفوظ ہونا اُس دَور سے لے
آج تک اور ہمیشہ کے لیے ہے۔

اور حافظ ابنِ حجرؒ نے دوسرے بعض علماء کا قول نقل کیا ہے کہ یہ معجزاتِ محمدیہ سے ہے
کیونکہ اطباء اوّل تا آخر اس بات سے عاجز ہیں کہ کسی شہر سے طاعون کو بالکلیہ دفع کر سکیں
لیکن مدینہ میں طاعون کا داخل ہونا اس طویل مدت میں ممنوع ہو گیا ہے۔

مناسب بھی یہی ہے کہ عدمِ دخول ہمیشہ کے لیے ہو؛ ورنہ ایک خاص مدت تک طاعون
کا نہ ہونا کسی بھی شہر اور گاؤں میں ہو سکتا ہے، اس میں مدینہ کی امتیازی شان کیا رہے گی۔

سوال: جب طاعون مسلم کے حق میں شہادت ہے تو مدینہ میں طاعون نہ ہونا مدینہ
فضیلت نہیں؛ بلکہ برائی ہے کہ ایک عظیم دولت سے مدینہ محروم ہو گیا؟

حضرات علماء نے اس کے متعدد جوابات دیئے ہیں:

(۱) طاعون کا ایک سبب یہ ہے کہ وہ جنات کے حملہ سے ہوتا ہے، کفار جنات شرارت
وعداوت سے ایسا کرتے ہیں اور مدینہ میں کفار جن داخل نہیں ہو سکتے؛ اس لیے وہاں کے
لوگوں پر اس کا حملہ بھی نہیں ہو سکتا۔ خلاصہ یہ ہوا کہ مدینہ کی فضیلت اس اعتبار سے ہے
کفار جنات مدینہ میں داخل نہیں ہو سکتے، لہٰذا کوئی اشکال کی بات نہیں ہے۔

(۲) علامہ عینیؒ وغیرہ نے مسند احمد کی ایک روایت کی روشنی میں یہ جواب دیا ہے
جبرئیل علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے دو چیزیں لے کر آئے تھے، ایک بخار
دوسرے طاعون، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں بخار کو روک لیا اور طاعون کو ملک
شام بھیج دیا۔

اس میں حکمت یہ تھی کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو صحابہ رضی
اللہ عنہم باعتبار تعداد اور سامان کے بہت قلیل تھے اور اس زمانہ میں مدینہ مرکزِ وباء تھا، آپ
صلی اللہ علیہ وسلم کو دو باتوں (بخار اور طاعون) میں اختیار دیا گیا جن میں سے ہر ایک
اجر جزیل ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بخار کو ترجیح دی کہ اس میں طاعون کے مقابلہ

اموات کم ہوتی ہیں، پھر جب جہاد وغیرہ کی ضرورت پڑی اور بخار کے باقی رہنے کی صورت میں جسموں میں ضعف پیدا ہو جانے کا خطرہ ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بخار کو جحفہ منتقل کرنے کی دعا کی اور وہ قبول ہوئی اور مدینہ تمام شہروں میں سب سے زیادہ صحت افزا علاقہ بن گیا اور اس کی یہی صورت باقی رہ گئی؛ تاکہ حقیقی طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کا اثر اور عظیم معجزہ کا ظہور ہو۔

ایک شبہ کا ازالہ:

حضرت ابوالاسود کی ایک روایت میں ہے کہ میں مدینہ آیا اور وہاں کسی مرض کے وقوع سے جلدی جلدی موتیں ہو رہی تھیں۔

یہ واقعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ کا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ میں طاعون آیا ہے؛ اس لیے بعض کی رائے یہ ہے کہ عدمِ دخولِ طاعون کی بات زمانۂ نبوت کے ساتھ تھی اور فی الجملہ مدینہ میں طاعون داخل ہو سکتا ہے۔

لیکن حقیقی بات وہی ہے جس کو ابنِ قتیبہ نے معارف میں اور نوویؒ نے اذکار میں بیان کیا ہے کہ طاعون نہ کبھی مکہ میں داخل ہوا اور نہ مدینہ میں۔

اور ابوالاسود کی روایت کا جواب یہ ہے کہ وہ طاعون نہیں تھا؛ بلکہ کوئی عام وبا مراد ہوگی۔

ولا الدجال، فعال من الدجل: بہت مکار دھوکہ باز فریب کار۔

بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ ایسا کوئی شہر نہیں ہوگا جہاں دجال اپنا قدم نہیں رکھے گا سوائے مدینہ اور مکہ کے، ان کے ہر دروازہ پر اللہ تعالیٰ نے حفاظتی فرشتوں کو تعینات کر رکھا ہے جو اسے وہاں سے بری طرح مار بھگائیں گے۔

مَاجَاءَ فِيْ إِجْلَاءِ الْيَهُوْدِ مِنَ الْمَدِيْنَةِ

إجلاء: إجلاء الإخراج: نکالنا۔

یہاں باب میں مدینہ ہے؛ لیکن مراد پورا جزیرۃ العرب ہے۔

حافظ ابنِ حجرؒ فرماتے ہیں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے مدینہ ہجرت کرکے تشریف لائے تو کفار تین طبقات میں تقسیم ہوگئے:

(۱) وہ لوگ جنہوں نے یہ وعدہ کیا کہ نہ تو ہم آپ سے جنگ کریں گے اور نہ آپ کے اعداء کی معاونت کریں گے اور یہ یہود کے تین قبیلے (قریظہ، نضیر اور قینقاع) تھے۔

(۲) ایک گروہ وہ تھا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کے لیے برسرِ پیکار تھا اور وہ قریش تھے۔

(۳) وہ جماعت تھی جو غیر جانب دار ہو کر اس انتظار میں تھی اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے، یہ عرب کے دیگر قبائل تھے، اور انہیں میں منافقین ہیں، یہ اگرچہ اسلام کا اظہار کرتے؛ لیکن اندر دشمنی رکھتے تھے۔

پھر ان میں سے پہلے گروہ یعنی یہود نے عہد شکنی کی اور مسلمانوں سے قتال کے لیے تیار ہوگئے، بالآخر یکے بعد دیگرے مسلمانوں نے ان تینوں قبیلوں کو شکست دی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مدینہ سے جلاوطن کردیا۔

بنو قینقاع کی جلاوطنی:

ان قبائل میں سے سب سے پہلے مدینہ کے قریب رہنے والے قبیلہ بنو قینقاع نے عہد شکنی کی اور ان سے جنگ ہوئی، واقعہ یہ ہوا کہ ایک عرب عورت ان کے بازار میں گئی، ایک یہودی دوکاندار نے اس کے ساتھ شرارت کی اور اسے برہنہ کردیا، ایک عرب آیا اور اس نے اس شخص کو قتل کردیا، یہود جمع ہوگئے، دونوں فریقوں (عرب اور یہود) میں لڑائی شروع ہوگئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ملامت کی، اس پر بنو قینقاع بگڑ گئے اور بولے بدر کی فتح پر مغرور مت ہونا، وہ تمہاری قوم تھی جو لڑنا نہیں جانتی تھی، اگر ہم سے سابقہ پڑے گا تو معلوم ہوجائے گا جنگ کسے کہتے ہیں، پس انہوں نے معاہدہ توڑ دیا؛ اس لیے نصف شوال ۲ھ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر

حملہ کیا، پندرہ روز محاصرہ رہا، آخر میں بنوقینقاع پر رعب طاری ہوگیا اور بلا شرط انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر رضا مندی ظاہر کی، آخر میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی سفارش سے فیصلہ ہوا کہ ساری قوم مدینہ اور اطراف کو چھوڑ کر چلی جائے، اس طرح ان کی مدینہ سے جلاوطنی ہوئی۔

بنونضیر کے ساتھ جنگ:

قصہ یہ ہوا کہ بنوکلاب کے دو شخصوں کو عمرو بن امیہ ضمری نے قتل کردیا اور بنونضیر، بنوکلاب کے حلیف تھے؛ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم دیت کے متعلق گفتگو کرنے کے لیے بنونضیر کے پاس تشریف لے گئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت بھی تھی، وہ لوگ بظاہر بہت اخلاق سے ملے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک دیوار کے پاس بٹھا دیا، اس کے بعد مشورہ کیا کہ اوپر سے آپ کے اوپر ایک بھاری پتھر گرادیں؛ لیکن یہ خبر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعہ دے دی گئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے فوراً کھڑے ہوکر چلے گئے۔

اس واقعہ کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کہلا بھیجا کہ دس دن کے اندر تم اطرافِ مدینہ سے چلے جاؤ؛ لیکن رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی نے انہیں اکسایا اور مدد کا وعدہ کیا، اس اعتماد پر انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جواب دیا کہ یہاں سے نہیں جائیں گے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے اصحابؓ جو چاہیں کریں، اس جواب کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حملہ کی تیاری کی اور مسلمانوں نے ان کے قلعوں کا محاصرہ کیا، آخر کار وہ مدینہ چھوڑنے پر راضی ہوگئے؛ چنانچہ علاقہ خالی کرکے یہ لوگ خیبر چلے گئے۔

بنوقریظہ کا انجام:

بنوقریظہ یہودیوں کا سب سے خبیث قبیلہ تھا، واقعہ یہ ہوا کہ اس بار یہودیوں نے مسلمانوں کے مکمل خاتمہ کا ارادہ کیا، اس سلسلہ میں انہوں نے دشمن قبیلوں کو مدینہ پر حملہ

کرنے کے لیے آمادہ کیا؛ چنانچہ تقریباً دس ہزار عرب مسلمانوں پر حملہ کے لیے چڑھ آئے
یہی غزوۂ احزاب ہے، اسی وقت بنوقریظہ نے علی الاعلان اپنا معاہدہ فسخ کر دیا جیسے ہی
مسلمانوں کا خندق سے محاصرہ ختم ہوا اور وہ اپنے گھر لوٹ ہی تھے کہ جبرئیل علیہ السلام
بنوقریظہ پر حملہ کا حکم لے کر آ گئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو وہاں پہنچنے کے
لیے کہا، مسلمانوں نے وہاں پہنچ کر ان کا محاصرہ کیا اور یہ محاصرہ پچاس دن رہا اور بنی قریظہ
مایوس ہو گئے، قصہ مختصر ان لوگوں کا فیصلہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے مطابق یہ ہوا کہ جوانوں کو
قتل کر دیا جائے اور ان کی ذریات گرفتار کر لی جائیں اور ان کے اموال مسلمانوں میں تقسیم
کر دیے جائیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے فیصلہ کو قبول کیا اور ان کے ساتھ یہی ہوا۔

ان واقعات سے معلوم ہوا کہ پہلے دو قبیلوں کی مدینہ سے جلاوطنی آپ صلی اللہ علیہ
وسلم کے زمانہ میں ہو گئی تھی اور ان یہودیوں نے فدک اور خیبر میں آباد یہود کے پاس جا کر
پناہ لے لی تھی، اس کے بعد ۶ ھ یا ۷ ھ میں جنگِ خیبر ہوئی اور مسلمانوں کو فتح ہوئی ا
خیبر کی زمینیں مسلمانوں کے قبضہ میں آ گئیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کو جزیرۃ
العرب سے بالکل نکالنا چاہا؛ لیکن انہوں نے کہا ہم کو جلاوطن نہ کریں، ہم یہاں کی زمینوں
سے اچھی طرح واقف ہیں، ہم تمہارے لیے کھیتی کریں گے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان
کی بات مان لی اور نصف پیداوار پر صلح ہو گئی۔

خیبر کے قریب یہودیوں کا ایک فدک نامی علاقہ تھا جب انہوں نے خیبر کا حال سنا
ان پر رعب طاری ہو گیا اور وہ بھی اسی طرح کے معاملہ پر راضی ہو گئے اور آپ صلی اللہ علیہ
وسلم کے پاس پیغام بھیجا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول کر لیا۔

واضح رہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ کی حقیقی خواہش تو یہ تھی کہ غیر مسلموں کو پورے
جزیرۃ العرب سے نکال دیا جائے؛ لیکن بعض مصلحتوں کے پیش نظر آپ صلی اللہ علیہ وسلم
نے ان کو انہیں زمین پر باقی رکھا تھا؛ لیکن جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کا وقت
قریب آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جزیرۃ العرب میں دو دین باقی نہیں رہ

جیسا کہ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری کلمات یہی تھے، پھر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دَورِ خلافت آیا تو انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی منشا کے مطابق پورے جزیرۃ العرب کو کفار سے پاک فرما دیا، اس طرح تمام یہود اور نصاریٰ اور دیگر کفار کا مدینہ؛ بلکہ پورے جزیرۃ العرب سے اجلاء واخراج ہوگیا۔

غیر مسلمان کا جزیرۃ العرب سے تخلیہ ضروری کیوں تھا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ منشاء کس وجہ سے تھی؟

جاننا چاہیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا ہے کہ جزیرۃ العرب میں دو مذاہب باقی نہیں رہ سکتے، اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اسلامی حکومت میں غیر مسلم نہیں رہ سکتے، اگر ایسا ہوتا تو جزیہ کا حکم بے معنیٰ ہوتا؛ بلکہ مطلب یہ ہے کہ خصوصاً جزیرۃ العرب میں غیر مسلم نہیں رہیں گے۔

شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں: جزیرۃ العرب سے غیر مسلموں کا تخلیہ تین وجوہ سے ضروری ہے: (۱) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ بات جانتے تھے کہ زمانہ ہمیشہ ایک حالت پر نہیں رہتا؛ بلکہ حالات بدلتے رہتے ہیں؛ اس لیے ممکن ہے اسلام کسی زمانہ میں کمزور پڑ جائے اور اس کی جمعیت پراگندہ ہوجائے ایسے وقت میں اگر مرکزِ اسلام اور اس کی جڑ میں غیر مسلم ہوں گے تو حرماتِ دین کی پردہ دری ہوگی؛ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ اور مکہ کے اطراف واکناف سے کفار کو نکالنے کا حکم دیا۔

(۲) غیر مسلموں سے اختلاط لوگوں کے دین کے فساد کا سبب ہے اور لوگوں کے مزاج کو تبدیل کردیتا ہے، پس اگر دوسرے علاقوں میں غیروں کے ساتھ اختلاط ناگزیر ہے تو کم از کم حرمین شریفین کو تو پاک رکھا جائے۔

(۳) نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وہ بات منکشف ہوئی جو آخری زمانہ میں پیش آنے والی ہے کہ دین مدینہ میں سانپ کے اپنے بل میں سکڑنے کی طرح سکڑ جائے گا اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب وہاں کوئی غیر مسلم نہ ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ اوّلاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ یہودیوں کے قبیلوں کو مدینہ سے نکال دیا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش ہوئی کہ پورے جزیرۃ العرب کو کفار سے خالی کردیا جائے جس کا اظہار خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبانِ مبارک سے فرمایا لیکن چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بعض مصلحتوں کے پیشِ نظر اس کو انجام نہ دے سکے تھے اس لیے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت آیا تو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس خواہش کو پورا کردیا اور جزیرۃ العرب کفر کی خباثت سے پاک وصاف ہوگیا۔

مَالِكٌ عَنْ إِسْمٰعِيْلَ بْنِ أَبِيْ حَكِيْمٍ أَنَّهُ سَمِعَ عُمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيْزِ يَقُوْلُ كَانَ مِنْ اٰخِرِ مَا تَكَلَّمَ بِهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ قَالَ قَاتَلَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ أَلَا! لَا يَبْقَيَنَّ دِيْنَانِ بِأَرْضِ الْعَرَبِ.

ترجمہ: عمر بن عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری کلمات میں سے ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کی لعنت ہو یہود ونصاریٰ پر، انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنایا، سنو! سرزمینِ عرب میں ہرگز دو دین باقی نہیں رہ سکتے۔

تشریح: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کے وقت جن اہم کلمات کو اپنی زبانِ مبارک سے ادا کیا ان میں سے یہ بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ لعنت بھیجے یہود ونصاریٰ پر کہ انہوں نے اپنے انبیاء اور اولیاء کی قبروں کو مسجد بنالیا۔

حافظ ابنِ حجرؒ فرماتے ہیں: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اس مرض میں اس بات کا ادراک ہوگیا تھا کہ اب دنیا سے تشریف لے کر چلے جائیں گے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اندیشہ ہوا کہ کہیں میرے امتی بھی میری قبر کو سجدہ گاہ نہ بنالیں جیسے یہود ونصاریٰ نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنایا تھا؛ اس لیے بطورِ تنبیہ کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کلمات ارشاد فرمائے اور یہود ونصاریٰ پر لعنت فرمائی اور ان کے اس فعل کی مذمت کی؛ تاکہ آپ کی امت میں کوئی ایسا نہ کرے۔

اتخذوا قبور أنبياءهم مساجد: یہ جملہ مستأنفہ ہے اور ایک سوال کا جواب ہے کہ یہود ونصاریٰ پر لعنت کیوں ہو؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا جواب دیا؛ اس لیے کہ انہوں نے قبروں کو سجدہ گاہ بنایا۔

اور اس جملہ کے مطلب میں علماء کے دو قول ہیں:

(۱) انبیاء اور اولیاء کی قبروں پر سجدہ نہ کیا جائے جیسے جاہل بدعتی کرتے ہیں۔

(۲) جہاں اولیاء اور انبیاء کی قبریں ہوں وہاں مسجد تعمیر نہ کی جائے اور نہ قبرستان میں نماز ادا کی جائے یعنی یہ دونوں کام موجبِ لعنت ہیں، اوّل الذکر کے سلسلہ میں تو ظاہر ہے اور آخر الذکر میں لعنت اور ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ اس میں تشبہ بالیہود ہے، نیز اس سے نبی یا ولی کی حد درجہ تعظیم کا اندیشہ ہے جو کفر کا سبب ہوسکتا ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: قبرستان میں نماز کی ممانعت کے سلسلہ میں علماء کا اختلاف ہے۔

شوافع کے نزدیک قبرستان میں نماز پڑھنا مکروہِ تنزیہی ہے اور امام احمدؒ کے نزدیک مکروہِ تحریمی ہے؛ بلکہ ان کے نزدیک نماز ہوتی ہی نہیں ہے۔

منیہ، خانیہ اور فتاویٰ میں حنفیہ کا مذہب اس سلسلہ میں یہ ہے کہ اگر قبرستان میں نماز پڑھنے کی جگہ متعین ہو اور اس خاص جگہ میں قبر نہ ہو تو وہاں نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔

(فتح الباری: ۳، شرح زرقانی: ۴، شامی)

إلا لايبقين دينان بأرض العرب: ارض العرب اور جزیرۃ العرب جیسا کہ آئندہ حدیث میں ہے اس کے مصداق کے بارے میں اختلاف ہے۔

سعید بن عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں جزیرۃ العرب وہ خطہ ہے جو وادی سے انتہائے یمن تک ہے۔ امام احمدؒ کے نزدیک جزیرۃ العرب مدینہ اور اس کے اردگرد کا علاقہ ہے اور امام شافعیؒ کے نزدیک اس کا مصداق مکہ، یمامہ، خیبر، ینبع، فدک اور اس کے اردگرد کا علاقہ ہے جسے حجاز کہتے ہیں۔

کفار کے جزیرۃ العرب میں دخول اور ان کے قیام کا مسئلہ:

امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور دوسرے بعض حضرات کے نزدیک کفار کو جزیرۃ العرب سے نکالنا واجب ہے اور دوسرے علاقہ کے کفار کا وہاں دخول اور ان کا قیام وہاں جائز نہیں ہے؛ البتہ امام شافعیؒ کے نزدیک جزیرۃ العرب سے مراد حجاز ہے، جس میں مکہ، مدینہ، یمامہ اور اس کے اطراف شامل ہیں۔

ان حضرات کی دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ﴿اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ﴾ ہے، نیز حدیثِ باب سے ان حضرات نے استدلال کیا ہے۔

حافظ ابنِ حجرؒ فرماتے ہیں حدیث میں اضافت پورے جزیرۃ العرب کی طرف ہے؛ کیونکہ قبل از اسلام وہاں کفار کے موطن و مسکن تھے؛ لیکن کفار کا قیام خصوصاً حجاز میں ممنوع ہے اور وہ مکہ، مدینہ، یمامہ اور اس کے اطراف ہیں۔

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک کفار کے لیے حرم میں داخل ہونے کی اجازت ہے؛ لیکن جزیرۃ العرب میں کفار کے لیے قیام اور سکونت اختیار کرنا جائز نہیں ہے، امام صاحبؒ کی دلیل ابوداوٗد کی ایک روایت ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفدِ ثقیف کو مسجد میں ٹھہرایا تھا؛ حالانکہ وہ کفار تھے۔

اور عدمِ سکونت کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ کا استدلال حدیثِ باب سے ہے یعنی جزیرۃ العرب میں کفار کا قیام نہیں ہوسکتا ہے۔

فریقِ اوّل کے استدلال کا جواب:

ائمہ ثلاثہؒ کی مستدل آیت کا جواب یہ ہے کہ آیت میں مشرکین کے دخول سے حکومت وغلبہ کے طور پر داخل ہونا مراد ہے یعنی کوئی کافر حرم کا حاکم نہیں بن سکتا، نیز کفار کا برہنہ ہوکر طواف کرنے اور حج کرنے کی ممانعت ہے۔

اس کے بعد جاننا چاہیے امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک کفار کا قیام اور ان کا

مستقل سکونت اختیار کرنا پورے جزیرۃ العرب میں ممنوع ہے اور ان کا استدلال حدیث میں مذکور لفظ "بأرض العرب" اور "بجزیرۃ العرب" سے ہے جب کہ امام شافعیؒ جزیرۃ العرب سے ایک مخصوص خطہ مراد لیتے ہیں جیسا کہ اوپر گزرا یعنی اس خطہ کے علاوہ کفار ارضِ عرب میں وطنیت اختیار کر سکتے ہیں، ان کا استدلال یہ ہے کہ جب کفار کو جلاوطن کیا گیا تھا تو تیماء اور یمن سے نہیں کیا گیا تھا، نیز ابوعبیدہؓ کی ایک حدیث میں "اخرجوا الیہود من الحجاز" کے الفاظ ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے یہاں الگ الگ دو مسئلے ہیں:

(۱) کفار کا جزیرۃ العرب میں سکونت پذیر ہونا اور مستقل مقیم ہونا تو یہ علی الاتفاق ممنوع ہے؛ البتہ مالکیہ اور حنفیہ کے نزدیک جزیرۃ العرب پورا مراد ہے جب کہ شوافع اور حنابلہ کے نزدیک صرف ارضِ حجاز مراد ہے۔

(۲) دیگر علاقوں کے کفار کا حرم میں داخل ہونا تو یہ ائمہ ثلاثہؒ کے نزدیک ناجائز ہے اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جائز ہے اور جہاں دخول کی ممانعت آئی ہے وہ غلبہ اور استیلاء کے طور پر ہے، واللہ اعلم۔ (المنتقی: ۷، مغنی لابن قدامہ: ۱۳ راجع للتفصیل)

عَنِ ابْنِ شِهَابٍ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَجْتَمِعُ دِيْنَانِ فِيْ جَزِيْرَةِ الْعَرَبِ.

قَالَ مَالِكٌ رحمه الله: قَالَ ابْنُ شِهَابٍ فَفَحَصَ عَنْ ذٰلِكَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ حَتّٰى أَتَاهُ الثَّلْجُ وَالْيَقِيْنُ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَا يَجْتَمِعُ دِيْنَانِ فِيْ جَزِيْرَةِ الْعَرَبِ فَأَجْلٰى يَهُوْدَ خَيْبَرَ.

ترجمہ: ابن شہاب سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جزیرۃ العرب میں دو مذاہب جمع نہیں ہو سکتے۔

امام مالکؒ کہتے ہیں: ابن شہاب نے فرمایا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ فرمان کے بارے میں چھان بین کی، پھر جب مکمل یقین ہوگیا کہ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ''جزیرۃ العرب میں دو دین جمع نہیں ہوں گے'' تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خیبر کے یہود کو جلا وطن کر دیا۔

قَالَ مَالِكٌ رحمہ اللہ: وَقَدْ أَجْلَى عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ يَهُوْدَ نَجْرَانَ وَفَدَكَ فَأَمَّا يَهُوْدَ خَيْبَرَ فَخَرَجُوْا مِنْهَا لَيْسَ لَهُمْ مِنَ التَّمَرِ وَلَا مِنَ الْأَرْضِ شَيْئٌ وَأَمَّا يَهُوْدُ فَدَكَ فَكَانَ لَهُمْ نِصْفُ التَّمَرِ وَنِصْفُ الْأَرْضِ لِأَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ صَالَحَهُمْ عَلَى نِصْفِ التَّمَرِ وَنِصْفِ الْأَرْضِ مَاقَامَ لَهُمْ عُمَرُ نِصْفَ التَّمَرِ وَنِصْفَ الْأَرْضِ قِيْمَةً مِنْ ذَهَبٍ وَوَرَقٍ وَإِبِلٍ وَحِبَالٍ وَأَقْتَابٍ ثُمَّ أَعْطَاهُمُ الْقِيْمَةَ وَأَجْلَاهُمْ مِنْهَا.

ترجمہ: حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں: اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نجران اور فدک کے یہودیوں کو جلا وطن کیا، بہر حال یہودِ خیبر کے لیے پھل اور زمین سے کوئی چیز نہیں تھی اور رہے فدک کے یہود، تو ان کے لیے نصف پھل اور نصف زمین تھی؛ اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نصف ثمر اور نصف ارض پر مصالحت کی تھی، پس عمر رضی اللہ عنہ نے نصف ثمر اور نصف ارض کی، سونے چاندی، اونٹ، رسیوں اور کجاووں سے قیمت لگائی اور ان کو قیمت دے کر جلا وطن کر دیا۔

تشریح: پہلے یہ بات آچکی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش تھی کہ کفار جزیرۃ العرب میں نہ رہیں؛ بلکہ وہ خالص مسلمانوں کا مسکن رہے؛ لیکن بعض مصالح کے پیشِ نظر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں اس پر عمل درآمد نہ ہوسکا تھا؛ لیکن جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا اور اللہ تعالیٰ نے اسلام کی جڑوں کو مضبوط بنادیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دَورِ خلافت میں جب بڑے بڑے اور اہم فیصلے لیے تو آپ رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان اور منشاء کی تکمیل کے لیے کفار کو جزیرۃ العرب سے نکالنے کا بھی فیصلہ کیا۔

اجلاءِ یہودِ خیبر:

جب مسلمانوں کے اہل وعیال زیادہ ہوگئے اور وہ خود اپنی زمین پر کام کرنے کے

قابل ہو گئے اور دوسری طرف یہودیوں کی طرف سے جب شرارتوں میں اضافہ ہونے لگا جس کا ظہور اس طرح ہوا کہ حضرت عبداللہ ابنِ عمر رضی اللہ عنہما زمینوں کی دیکھ بھال کے لیے جب خیبر گئے تو یہودیوں نے انہوں کو چھت سے دھکیل دیا جس سے ان کے ہاتھ کا جوڑ کھل گیا، نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان مبارک کو مدنظر رکھتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اعلان کیا کہ میں یہودیوں کو جلاوطن کرنے والا ہوں، اس خبر کے بعد یہودیوں کی طرف سے پیغام آیا کہ جب تمہارے نبی نے ہمیں برقرار رکھا تو تم کیوں نکال رہے ہو؟ تو اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں بھولا نہیں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ تمہارا کیا حال ہوگا جب تم کو جزیرۃ العرب سے نکالا جائے گا، آخر کار حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو مقامِ تیماء اور اریحاء کی طرف نکال دیا اور ان کو پھلوں، اونٹوں اور دیگر اموال کی قیمت دے دی، زمین کی قیمت نہیں دی؛ کیونکہ وہ مسلمانوں کی تھی۔

اہلِ فدک کا اخراج:

فدک فا کے فتحہ کے ساتھ ایک بستی کا نام تھا جو مدینہ سے دو دن کی دُوری پر اور خیبر سے ایک منزل کے فاصلہ پر تھی، اس بستی میں یہودی آباد تھے، ان کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شام کی طرف چلتا کر دیا، ان لوگوں نے جنگِ خیبر کے وقت جب مسلمانوں کی فتح کے بارے میں سنا، تو ان کی بھی ہمت ٹوٹ گئی؛ اس لیے انہوں نے بھی خیبر کے معاہدہ کے مانند معاہدہ کی پیش کش کی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نصف ثمر اور نصف ارض پر ان سے مصالحت کر لی؛ چونکہ فدک کی فتح اور کامیابی کے لیے لشکر اور گھوڑے وغیرہ استعمال کرنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی؛ اس لیے یہ زمین خالص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی؛ اس لیے جب حضرت نے ان کی جلاوطنی کا ارادہ کیا تو ان کے نصف پھلوں، نصف زمین اور دیگر سامان کی قیمت لگا کر ان کو دے دی اور ان کو شام کی طرف روانہ کر دیا۔

اہلِ نجران کی جلا وطنی:

نجران یمن کے قریب یہودیوں کی ایک بستی تھی اور نجران سنہ ۱۰ھ میں صلح پر فتح ہوا تھا، ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ ان کے اخراج کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر فرمایا تھا: اخرجوا أهل نجران من جزيرة العرب.

بالآخر ۲۰ھ میں جزیرۃ العرب تمام کفار و مشرکین سے پاک ہوگیا۔

(فتح الملہم: ۷، نعمت المنعم: ۲، فتح الباری)

جَامِعُ مَا جَاءَ فِيْ أَمْرِ الْمَدِيْنَةِ

(مدینہ منورہ کے سلسلہ میں مزید احادیث)

أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ طَلَعَ لَهُ أُحُدٌ فَقَالَ هٰذَا جَبَلٌ يُحِبُّنَا وَنُحِبُّهُ.

ترجمہ و تشریح گزشتہ باب میں گزر چکے ہیں۔

عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ الْقَاسِمِ أَنَّ أَسْلَمَ عَنْ أَسْلَمَ مَوْلٰى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّهُ زَارَ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عَيَّاشٍ الْمَخْزُوْمِيَّ فَرَأٰى عِنْدَهُ نَبِيْذًا وَهُوَ بِطَرِيْقِ مَكَّةَ فَقَالَ لَهُ أَسْلَمُ إِنَّ هٰذَا الشَّرَابَ يُحِبُّهُ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ فَحَمَلَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عَيَّاشٍ قَدَحًا عَظِيْمًا فَجَاءَ بِهِ إِلٰى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ فَوَضَعَهُ فِيْ يَدِهِ فَقَرَّبَهُ عُمَرُ إِلٰى فِيْهِ ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ فَقَالَ عُمَرُ إِنَّ هٰذَا الشَّرَابَ طَيِّبٌ فَشَرِبَ مِنْهُ ثُمَّ نَاوَلَهُ رَجُلًا عَنْ يَمِيْنِهِ فَلَمَّا أَدْبَرَ عَبْدُ اللّٰهِ نَادَاهُ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ فَقَالَ أَأَنْتَ الْقَائِلُ لَمَكَّةُ خَيْرٌ مِنَ الْمَدِيْنَةِ فَقَالَ عَبْدُ اللّٰهِ فَقُلْتُ هِيَ حَرَمُ اللّٰهِ وَأَمْنُهُ وَفِيْهَا بَيْتُهُ فَقَالَ عُمَرُ لَا أَقُوْلُ فِيْ بَيْتِ اللّٰهِ وَلَا فِيْ حَرَمِهِ شَيْئًا ثُمَّ قَالَ عُمَرُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ أَأَنْتَ الْقَائِلُ لَمَكَّةُ خَيْرٌ مِنَ الْمَدِيْنَةِ قَالَ

فَقُلْتُ هِيَ حَرَمُ اللّٰهِ وَأَمْنُهُ وَفِيهَا بَيْتُهُ فَقَالَ عُمَرُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ لَا أَقُولُ فِي حَرَمِ اللّٰهِ وَلَا فِي بَيْتِهِ شَيْئًا ثُمَّ انْصَرَفَ.

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے غلام اسلم کی ملاقات مکہ کے راستہ میں عبداللہ بن عیاش مخزومی سے ہوئی، اسلم نے ان کے پاس نبیذ دیکھی، تو کہا اس مشروب کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ پسند فرماتے ہیں، عبداللہ بن عیاش نے ایک بڑا پیالہ اٹھایا اور اسے لے کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آ گئے اور آپؓ کے سامنے رکھ دیا، پس عمر رضی اللہ عنہ نے اسے اپنے منہ کے قریب کیا پھر سر اٹھایا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا یہ عمدہ مشروب ہے اور اسے نوش فرمالیا اور (بچا ہوا) اپنے داہنی طرف بیٹھے ہوئے شخص کو دے دیا، پھر جب عبداللہ بن عیاش واپس جانے لگے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں آواز دی اور ان سے معلوم کیا: کیا تم اس بات کے قائل ہو کہ مکہ مدینہ سے بہتر ہے؟ عبداللہ نے کہتے ہیں میں نے جواب دیا وہ اللہ کا حرم ہے اس کے امن کی جگہ اور وہاں اللہ کا گھر ہے، حضرت نے کہا میں اللہ کے گھر اور اس کے حرم کے بارے میں کچھ نہیں کہتا ہوں، پھر دوبارہ ان سے یہی سوال کیا اور انہوں نے وہی جواب دیا اور واپس لوٹ گئے۔

تشریح: عبداللہ بن عیاش مخزومی مکہ مکرمہ تشریف لے جا رہے تھے، اس دوران حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے غلام اسلم کی ان سے ملاقات ہوئی، عبداللہ بن عیاش کے پاس نبیذ تھی، گفتگو کے دوران اسلم نے ان سے کہا آپ کے پاس جو مشروب ہے وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کافی پسند ہے، گویا انہوں نے عبداللہ کو اس بات پر ابھارا کہ اس میں سے کچھ مشروب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی پیش کر دیا جائے، عبداللہ کی مسافت غالباً مدینہ سے کم رہی ہوگی؛ اس لیے وہ خود مشروب کا ایک بڑا پیالہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس لے کر حاضر ہو گئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو لیا اور فرمایا طیب یعنی حلال اور لذیذ ہے، پھر اس میں سے کچھ نوش فرما کر اپنے داہنی جانب والے شخص کو عطا کر دیا جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی یہی معمول تھا، پھر جب وہ جانے لگے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو

بلا کر معلوم کیا، کیا تمہاری رائے مدینہ کے مقابلہ میں مکہ کے بہتر ہونے کی ہے؟ انہوں نے اثبات میں جواب تو نہیں دیا؛ البتہ ایسی بات کہی جس سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مکہ مدینہ سے بہتر اور افضل ہے یعنی انہوں نے مکہ کی تعریف کی، اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مکہ کے حرم اور مقامِ امن ہونے میں کوئی کلام نہیں ہے، میں تو دونوں کے تقابل کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں یعنی دونوں میں کون افضل ہے؟

عیسیٰ بن دینار کہتے ہیں ایسا لگتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مدینہ کے مقابلہ میں مکہ کی فضیلت کو قدرِ ناپسند کر دیتے تھے۔

مکہ مکرمہ زیادہ افضل ہے یا مدینہ منورہ؟

یہ ایک مختلف فیہ مسئلہ ہے، امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، احمد بن حنبل اور اکثر صحابہؓ کا مذہب یہ ہے کہ مکہ مکرمہ پوری روئے زمین بشمول مدینہ منورہ کے سب سے افضل ہے جب کہ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ اور دیگر چند صحابہؓ اور امام مالکؒ کا مسلک یہ ہے کہ مدینہ مکہ مکرمہ سے افضل ہے۔

جمہور کے دلائل:

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَدِيِّ بْنِ الْحَمْرَاءِ أَنَّهُ سَمِعَ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ وَاقِفٌ عَلىٰ رَاحِلَتِهِ بِمَكَّةَ يَقُوْلُ وَاللهِ! إِنَّكِ لَخَيْرُ أَرْضِ اللهِ وَأَحَبُّ أَرْضِ اللهِ إِلَىٰ اللهِ وَلَوْ لَا أَنِّيْ أُخْرِجْتُ مِنْكِ مَاخَرَجْتُ.

اس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحتاً فرمایا ہے: اے مکہ! تو اللہ کی زمینوں میں سب سے بہتر اور اللہ کو پسندیدہ ہے، اگر اس شہر کے لوگ مجھے نہ نکالتے تو میں نہ نکلتا۔

اور آپؐ نے مساجد کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا: میری اس مسجد میں نماز دوسری مسجدوں کے مقابلہ میں ایک ہزار نمازوں سے افضل ہے؛ مگر مسجد حرام میں ایک نماز میری مسجد سے سو گنا زیادہ افضل ہے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مکہ کی فضیلت مدینہ پر بڑھی ہوئی ہے۔

امام مالکؒ کے دلائل:

(۱)قال النبی صلّی اللہ علیہ وسلم مدینۃ خیر من مکۃ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں یہ حدیث ضعیف ہے۔

(۲)اللھم اجعل بالمدینۃ ..... ما بمکۃ من البرکۃ.

بہر حال دونوں طرف دلائل ہیں؛ لیکن جمہور کا مذہب راجح ہے۔

واضح رہے یہ اختلاف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبرِ اطہر کے استثناء کے ساتھ ہے؛ کیونکہ وہ مٹی اور وہ مقام جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعضاء مس ہیں، وہ بالاتفاق مخلوقات میں سب سے افضل ہے جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مخلوقات میں سب سے افضل ہے؛ بلکہ فقہاء نے روضۂ اطہر کو کعبۃ اللہ، عرش اور کرسی وغیرہ تمام چیزوں سے افضل قرار دیا ہے

اشکال:

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے وہ چیزیں جن کی نسبت اللہ کی طرف ہے وہ سب سے افضل ہونی چاہئیں، مثلاً کعبۃ اللہ، عرش، کرسی وغیرہ؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں افضلیت میں مقابلہ مخلوقات کے درمیان ہے، یہ ذاتِ نبیؐ اور اللہ کی ذات کا مقابلہ نہیں ہے (نعوذ باللہ) پس جب یہ مخلوقات کی افضلیت کا مقابلہ ہے تو سب سے افضل چیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور آپؐ کے ممسوسات قرار دیئے جائیں گے اور رہے کعبۃ اللہ، عرش اور کرسی وغیرہ تو اس کے مس کا اللہ کی ذات سے کوئی تعلق نہیں ہے؛ کیونکہ ذاتِ باری ان چیزوں سے پاک اور بالاتر ہے، واللہ اعلم۔

(تاریخِ مدینہ منورہ، درمختار، فیض القدیر)

مَاجَاءَ فِي الطَّاعُوْنِ

طاعون کیا ہے؟

طاعون ایک وبائی بیماری ہے، جو عام طور پر موت پر جا کر منتج ہوتی ہے، اہلِ لغت

کے نزدیک طاعون کے معنی وبا ہیں اور اطباء کہتے ہیں کہ طاعون ایک ایسی قسم کا قاتل دمہلا ورم ہے جس سے شدید تپش پیدا ہوتی ہے اور وہ انتہائی خطرناک ہوتا ہے اور وہ اپنے حدود سے تجاوز کرتا رہتا ہے اور گردا گرد کے متاثر حصے سیاہ یا ہرا ہو جاتا ہے اور یہ ورم تین جگہ پیدا ہوتا ہے: ایک بغل میں، دوسرے کان کے پیچھے، تیسرے نرم گوشت میں۔

طاعون کے ظاہری اور باطنی اسباب:

طاعون کے کچھ ظاہری اسباب ہیں جن کو اطباء بیان کرتے ہیں اور وہ اپنی جگہ صحیح بھی ہو سکتے ہیں، مثلاً کسی عضو کے اندر گندہ متعفن خون جو سینے کی وجہ سے عضو کو فاسد کر دیتا ہے اور اس کے اطراف کے حصہ کو متغیر کر دیتا ہے۔

لیکن ان ظاہری اسباب کے علاوہ طاعون کے کچھ اسباب باطنی بھی ہوتے ہیں جو کہ احادیث میں بیان کیے گئے ہیں، انہی اسباب میں ایک سبب یہ ہے کہ اللہ کی نافرمانی کی وجہ سے اس کو بطور عذاب نازل کیا جاتا ہے: قال النبي صلى الله عليه وسلم: الطاعون زجر أو عذاب عذب به بعض الأمم.

(۲) طاعون جنات کا حملہ: قال النبي صلى الله عليه وسلم فناء أمتي بالطعن والطاعون، قال فقلنا يا رسول الله هذا الطعن فقد عرفناه، فما الطاعون؟ قال طعن أعدائكم من الجن وفي كل شهادة.

(۳) طاعون کا ایک سبب معاشرہ کے اندر فحش اور بدکاری کا بڑھ جانا بھی ہے: قال النبي صلى الله عليه وسلم لم تظهر الفاحشة في قوم حتى يعلنوا بها إلا فشا فيهم الطاعون والأوجاع التي لم تكن مضت في أسلافهم الذين مضوا.

نیز حدیث شریف میں وارد ہوا کہ بنی اسرائیل اور اس سے پہلی امتوں پر بھی طاعون کی شکل میں عذاب بھیجا گیا ہے، علامہ طبری نے اس کی تفصیل کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ بنی اسرائیل میں طاعون کے عذاب کی وجہ بھی ان کے درمیان بڑھتی ہوئی فحش و بدکاری تھی۔

طاعون کے پیدا ہونے کے وقت حکمِ شرعی:

جن علاقوں میں طاعون پھیلنے لگے ان کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو حکم بیان فرمائے ہیں:

إذا سمعتم به (الطاعون) بأرض فلاتقدموا عليه وإذا وقع بأرض وأنتم بها فلاتخرجوا فراراً منه.

یعنی اگر کسی جگہ طاعون ہوتو وہاں نہ جاؤ، دوسرا یہ کہ جس جگہ طاعون ہے اورتم وہیں ہو تواس طاعون زدہ علاقہ سے نہ نکلو۔

ان دو حکموں کی علت معلوم کرنے سے پہلے جاننا چاہیے کہ اسلام کے بنیادی عقائد میں سے یہ بھی ہے کہ جو کچھ اچھا بُرا ہوتا ہے وہ مشیتِ خداوندی سے ہوتا ہے، کسی انسان یا کسی شئ کا بالذات اس میں کوئی دخل نہیں ہے، اگر ہے تو وہ محض کسب یا سبب کی حد تک ہے؛ مگر زمانۂ جاہلیت میں جہاں مختلف قسم کے عقائدِ باطلہ پائے جاتے تھے، وہیں ایک عقیدہ یہ بھی تھا کہ بعض بیماری متعدی ہوتی ہیں اور وہ بالذات ایک دوسرے میں منتقل ہوتی رہتی ہیں، لہٰذا اس کی اصلاح بھی لازم تھی؛ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "لَاعَدْوىٰ وَلَاطِيَرَ وَلَاغُوْلَ" (یعنی بیماری ایک دوسرے میں منتقل نہیں ہوتی) موقع طاعون کی حدیث اوراس حدیث میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے؛ مگر دونوں حدیثیں صحیح ہیں؛ اس لیے علماء نے ان میں تطبیق دینے کی کوشش کی ہے۔

چنانچہ علماء نے فرمایا کہ منشاءِ نبوت یہ ہے کہ بالذات بغیر اللہ کی مرضی وحکم کے کوئی بیماری متعدی نہیں ہوتی، جیسا کہ اہلِ جاہلیت کا خیال تھا، ہاں مشیتِ خداوندی سے ایک بیماری دوسرے کولگ سکتی ہے جیسا کہ اسباب میں ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ تعدیۂ امراض کی نفی سے بالذات تعدیہ مراد ہے اورتعدیۂ امراض کے اثبات سے مراد حکمِ خدا سے تعدیہ مراد ہے، لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔

دوسری تطبیق یہ کہ درحقیقت کوئی بیماری دوسرے کی جانب تجاوز نہیں کرتی ہے اور طاعون زدہ علاقہ میں نہ جانے کا حکم حسماً للمادۃ وسداً للباب ہے کہ اگر کمزور عقیدہ والا طاعون زدہ علاقہ میں گیا اور مشیتِ خدا سے وہی بیماری لگ گئی تو وہ خیال کرے گا کہ وہاں جانے کی وجہ سے بیماری پیدا ہوئی ہے۔

اس کے علاوہ بعض علماء ان احادیث میں ناسخ ومنسوخ اور ترجیح کے قائل ہیں۔

اس کے بعد زیرِ بحث مسئلہ میں غور کیا جائے کہ آپؐ نے وہاں جانے اور طاعون زدہ علاقہ سے نکلنے کو منع کیوں فرمایا؟ امام طحاویؒ فرماتے ہیں: اس کی حکمت یہ ہے کہ اگر کوئی آدمی طاعون زدہ مقام پر گیا اور وہاں اسے بھی طاعون ہوگیا تو وہ کہیں یہ خیال نہ کرے وہاں جانے سے مجھے طاعون ہوگیا ہے اور طاعون والے علاقہ سے باہر آ گیا اور طاعون سے بچا رہا تو یہ نہ سمجھے کہ باہر نکل کر میں بچ گیا؛ حالانکہ بیماری کا آنا جانا خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو کچھ اچھا برا ہوتا ہے وہ تقدیرِ الٰہی سے ہوتا ہے، جس کو طاعون ہونا ہے اس کو ضرور ہوگا، خواہ وہیں رہے یا بھاگے اور جس کے حق یہ مقدر نہ ہو اس کو ہرگز نہیں ہوسکتا خواہ کہیں بھی رہے؛ اس لیے اللہ کے نبی نے باہر والے کو وہاں جانے، اور جو وہاں موجود ہیں ان کو نکلنے سے منع فرمادیا؛ تاکہ کوئی بدعقیدگی میں مبتلا نہ ہو۔

اس کے علاوہ علماء نے چند وجوہات اور بیان کی ہیں کہ اگر جو لوگ وہاں موجود ہیں، وہاں سے نکل جائیں تو بیماروں کی تیمارداری کون کرے گا، اور اگر کسی کا انتقال ہوجائے تو کفن دفن کا انتظام کیسے کیا جائے گا۔

طاعون سے فرار پر وعید اور صبر پر ثواب:

طاعون زدہ علاقوں میں رہ کر اور خدا پر توکل کرنا رحمت ومغفرت کا سبب ہے اور درجۂ شہادت کے حصول کا ذریعہ ہے اور اس کی وجہ سے انتقال کرنے والا شہداء کی فہرست میں شامل کیا جائے گا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اَلشُّهَدَاءُ خَمْسَةٌ اَلْمَطْعُوْنُ وَالْمَبْطُوْنُ وَالْغَرِقُ وَصَاحِبُ الْهَدْمِ وَالشَّهِيْدُ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ.

اس کے برعکس ایسے علاقہ سے فرار ہونا سخت وعید کا باعث ہے؛ چنانچہ ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اَلْفَارُّ مِنَ الطَّاعُوْنِ كَالْفَارِّ مِنَ الزَّحْفِ وَالصَّابِرُ فِيْهِ كَالصَّابِرِ فِي الزَّحْفِ.

بطورِ خلاصہ حافظ ابنِ حجرؒ نے فرمایا کہ طاعون زدہ علاقہ سے نکلنا تین صورتوں میں ہوسکتا ہے: ایک یہ کہ طاعون سے فرار اختیار کرتا ہوا نکلے، ایسے شخص کے بارے میں وعید وارد ہوئی ہے، دوسرے یہ کہ کسی کام سے باہر جانا چاہتا تھا؛ لیکن وہاں طاعون آ گیا، اب اگر یہ اپنے کام سے جائے تو اس پر وعید نہیں ہے، تیسری صورت یہ ہے کہ کام سے باہر جانا چاہتا تھا، بستی میں طاعون آ گیا، اب اس نے ارادہ کرلیا کہ باہر تو جانا ہے؛ لیکن بستی میں طوعون ہے، تو اب باہر ہی ٹھہر جاؤں گا، ایسے شخص کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔

ملحوظہ: طاعون زدہ علاقہ میں صبر کے ساتھ رہنے پر شہادت کا درجہ مؤمن کامل کو حاصل ہوگا یا غیر کامل کو بھی؟ اس بارے میں نصوص میں کوئی تفصیل نہیں ہے؛ لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ درجہ مؤمن کامل کو ملے گا؛ کیونکہ وہاں قیام کے ساتھ صبر وتوکل بھی شرط ہے، نیز یہ کہ طاعون اکثر معصیت، زنا کاری اور فحش کاری کے سبب آتا ہے اور ان چیزوں سے حقیقی مؤمن ہی دُور رہتا ہے، واللہ اعلم۔

(فتح الباری، زاد المعاد، فتح الملہم، انفاس الفقہ)

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللهُ تَعَالىٰ عَنْهُ خَرَجَ إِلَى الشَّامِ حَتّٰى إِذَا كَانَ بِسَرْغَ لَقِيَهُ أُمَرَاءُ الْأَجْنَادِ أَبُوْ عُبَيْدَةَ بْنُ الْجَرَّاحِ وَأَصْحَابُهُ رَضِيَ اللهُ تَعَالىٰ عَنْهُمْ فَأَخْبَرُوْهُ أَنَّ الْوَبَاءَ قَدْ وَقَعَ بِالشَّامِ فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ قَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللهُ تَعَالىٰ عَنْهُ أُدْعُ لِيَ الْمُهَاجِرِيْنَ الْأَوَّلِيْنَ فَدَعَاهُمْ فَاسْتَشَارَهُمْ وَأَخْبَرَهُمْ أَنَّ الْوَبَاءَ قَدْ وَقَعَ بِالشَّامِ

فَاخْتَلَفُوْا فَقَالَ بَعْضُهُمْ قَدْ خَرَجْتَ لِأَمْرٍ وَلَا نَرٰى أَنْ تَرْجِعَ عَنْهُ وَقَالَ بَعْضُهُمْ مَعَكَ بَقِيَّةُ النَّاسِ وَأَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَا نَرٰى أَنْ تُقْدِمَهُمْ عَلٰى هٰذَا الْوَبَاءِ فَقَالَ ارْتَفِعُوْا عَنِّيْ ثُمَّ قَالَ ادْعُ لِيَ الْأَنْصَارَ فَدَعَوْتُهُمْ فَاسْتَشَارَهُمْ فَسَلَكُوْا سَبِيْلَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَاخْتَلَفُوْا كَاخْتِلَافِهِمْ فَقَالَ ارْتَفِعُوا عَنِّيْ ثُمَّ قَالَ ادْعُ لِيْ مَنْ كَانَ هٰهُنَا مِنْ مَشْيَخَةِ قُرَيْشٍ مِنْ مُهَاجِرَةِ الْفَتْحِ فَدَعَوْتُهُمْ فَلَمْ يَخْتَلِفْ عَلَيْهِ مِنْهُمْ رَجُلَانِ فَقَالُوْا نَرٰى أَنْ تَرْجِعَ بِالنَّاسِ وَلَا تُقْدِمَهُمْ عَلٰى هٰذَا الْوَبَاءِ فَنَادٰى عُمَرُ فِي النَّاسِ إِنِّيْ مُصْبِحٌ عَلٰى ظَهْرٍ فَأَصْبِحُوْا عَلَيْهِ فَقَالَ أَبُوْ عُبَيْدَةَ أَفِرَارًا مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ؟ فَقَالَ عُمَرُ لَوْ غَيْرُكَ قَالَهَا يَا أَبَا عُبَيْدَةَ نَعَمْ نَفِرُّ مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ إِلٰى قَدَرِ اللّٰهِ أَرَأَيْتَ لَوْ كَانَ لَكَ إِبِلٌ فَهَبَطَتْ وَادِيًا لَهُ عُدْوَتَانِ إِحْدَاهُمَا مُخْصِبَةٌ وَالْأُخْرٰى جَدْبَةٌ أَلَيْسَ إِنْ رَعَيْتَ الْخَصِبَةَ رَعَيْتَهَا بِقَدَرِ اللّٰهِ وَإِنْ رَعَيْتَ الْجَدْبَةَ رَعَيْتَهَا بِقَدَرِ اللّٰهِ قَالَ فَجَاءَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ عَوْفٍ وَكَانَ غَائِبًا فِيْ بَعْضِ حَاجَتِهٖ فَقَالَ إِنَّ عِنْدِيْ مِنْ هٰذَا عِلْمًا سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ إِذَا سَمِعْتُمْ بِهٖ بِأَرْضٍ فَلَا تَقْدَمُوْا عَلَيْهِ وَإِذَا وَقَعَ بِأَرْضٍ وَأَنْتُمْ بِهَا فَلَا تَخْرُجُوْا فِرَارًا مِنْهُ قَالَ فَحَمِدَ اللّٰهَ عُمَرُ ثُمَّ انْصَرَفَ.

ترجمہ وتشریح: عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ملک شام کی جانب تشریف لے گئے، یہاں تک کہ جب مقام سرغ میں پہنچے تو ان سے لشکروں کے امراء ابوعبیدہ بن الجراح، خالد بن ولید، یزید بن سفیان، سرحبیل بن حسنہ اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہم ملے (حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں شہروں کو ان کے درمیان تقسیم کردیا تھا) ملاقات کے بعد ان لوگوں نے خبر دی کہ ارضِ شام میں وبا پھیل گئی ہے، ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا میرے پاس مہاجرین اوّلین کو بلا کر لاؤ (اس سے مراد وہ صحابہؓ ہیں جنہوں نے قبلتین کی طرف نماز ادا کی ہے)

چنانچہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما ان لوگوں کو بلا کر لائے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے (مقام وباء پر ٹھہرنے یا اس سے کوچ کرنے کے بارے میں) ان سے مشورہ کیا اور بتلایا یہاں ارضِ شام میں بہت زیادہ وباء پھیلی ہوئی (تمہاری اس بارے میں کیا رائے) ہے، ان مہاجرین اوّلین کا اس سلسلہ میں اختلاف ہو گیا؛ چنانچہ ان میں سے بعض لوگوں نے کہا آپ مہم پر نکلے ہیں (یعنی لوگوں کے احوال و کوائف کو جاننے کے لیے آئے ہیں) ہمارا خیال نہیں ہے کہ آپ کو واپس ہو جانا چاہیے (یہاں تک کہ آپ اپنا کام پورا کر لیں؛ کیونکہ ہوتا وہی ہے جو اللہ نے لکھ رکھا ہے)

اور دوسرے گروہ نے کہا آپ کے ساتھ دوسرے فاضل صحابہؓ بھی ہیں (یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس صحابہؓ کی جماعت جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتی ہے اور قتال کرتی ہے وہ بھی آئی ہے) اور ہمارا خیال یہ ہے کہ آپ ان کو اس وباء اور طاعون کے لیے پیش نہ کریں (بلکہ واپس ہو جائیں)۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: دونوں جماعتوں کے دلائل واضح ہیں، ایک نے توکل و تسلیم اور قضاء کو بنیاد بنایا جبکہ دوسری جماعت نے حذر و احتیاط کو سامنے رکھ کر اپنے آپ کو ہلاکت سے بچانے کے لیے کہا۔

(لیکن جب ان جماعتوں میں اختلاف ہو گیا اور مسئلہ حل نہیں ہوا تو) حضرت نے کہا: آپ لوگ چلے جاؤ اور فرمایا: انصار کو بلاؤ، پس میں نے ان کو بلایا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے بھی اسی بارے میں مشورہ کیا، انصار نے بھی مہاجرین کا طرز اپنایا اور انہیں کی طرح اختلافِ رائے سامنے آیا اور مسئلہ حل نہیں ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہاں جو فتح مکہ کے مہاجرین، مشائخ ہیں انہیں بلاؤ (امام نوویؒ نے فرمایا: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے ہجرت کی تھی اور حافظ نے فرمایا مہاجرت کا لفظ اشارہ کرتا ہے جو مہاجرین کی فضیلت ہے وہ غیر مہاجرین کی نہیں ہے)

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں میں نے انہیں بلایا تو ان میں سے صرف

دو آدمیوں کی رائے مختلف تھی، ان میں سے اکثر نے کہا ہمارا خیال یہ ہے کہ آپ لوگوں کو مدینہ واپس کر دیں اور ان کو اس وباء پر پیش نہ کریں (حضرت عمر رضی اللہ عنہ دراصل تمام صحابہؓ کی رائے لینا چاہتے تھے، پس ان میں سے اکثر کی رائے سے واپسیٔ مدینہ کی طرف اتفاق ہو گیا) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اعلان کیا کہ میں صبح کے وقت اپنی سواری پر سوار ہو کر کوچ کرنے والا ہوں اور تم بھی سفر کے لیے تیار ہو جاؤ۔

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ جو اس وقت شام کے امیر تھے، انہوں نے کہا: اے عمر! کیا تم قضاءِ الٰہی اور اس کے مقدر کردہ فیصلہ سے بھاگنا چاہ رہے ہو؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے ابوعبیدہ! اگر تمہارے علاوہ کوئی دوسرا یہ بات کہتا (تو مجھے تعجب نہ ہوتا یا میں اسے سزا دیتا وغیرہ، یا پھر "لو" تمنی کے لیے ہے، تو پھر جواب کی ضرورت نہیں ہے یعنی کاش! یہ بات کسی دوسرے نے کہی ہوتی تم صاحبِ علم و فضل ہوتے ہوئے ایسی بات کر رہے ہو)۔

اس کے جواب میں حضرت نے کہا: ہاں! ہم اللہ کے فیصلہ سے دوسرے فیصلہ کی جانب بھاگ رہے ہیں (مطلب یہ ہے کہ جس طرح طاعون وباء اللہ کا مقدر کردہ ہے، اسی طرح اپنے کو ہلاکت سے بچانا اور محفوظ جگہ رہنا یہ بھی تو اللہ کا فیصلہ ہے، لہٰذا ہم کچھ غلط نہیں کر رہے)

پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مثال سے سمجھایا کہ یہاں سے جانا اللہ کی تقدیر سے بھاگنا نہیں ہے، یہ ایسا ہی ہے کہ اگر تمہارے پاس ایک اونٹ ہو اور تم اسے ایک ایسی وادی میں چھوڑ دو جس کے دو کنارے ہوں جن میں ایک سرسبز و شاداب ہو اور دوسرا قحط زدہ ہو، کیا ایسا نہیں کہ اگر اسے ہریالی زمین پر چراؤ تو اللہ کے مقدر کرنے سے ہے اور بنجر زمین میں چراؤ تو یہ بھی اللہ کے حکم سے ہے (اسی طرح جو شخص مامون و محفوظ مقام پر چلا جائے تو یہ اللہ کے حکم سے گیا اور اگر ایسے مقام پر اقدام کیا اور گیا جہاں وباء پھیلی ہوئی ہے تو وہ بھی اللہ کی مقدر کرنے سے گیا)

ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں اتنے میں عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ تشریف لے آئے، وہ کسی ضرورت کی وجہ سے موجود نہیں تھے، انہوں نے کہا: یہ جو بحث چل رہی ہے، اس بارے میں میرے پاس علم یعنی حدیثِ نبوی موجود ہے، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا جب تم جس جگہ میں طاعون کے بارے میں سنو تو وہاں مت جاؤ اور اگر کسی جگہ طاعون آجائے اور تم پہلے سے وہاں ہو تو وہاں سے نہ نکلو اس سے فرار اختیار کرتے ہوئے، ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث سنی تو اللہ کی حمد وثناء کی کہ بہت بڑا مسئلہ حل ہو گیا، پھر آپ رضی اللہ عنہ مدینہ واپس ہو گئے (چونکہ مقامِ وباء پر نہیں پہنچے تھے؛ بلکہ مقامِ سرغ میں تھے جو شام سے پہلے تبوک میں ایک وادی ہے اور مدینہ سے تیرہ منزل کی دُوری پر ہے)

حافظ ابنِ حجرؒ فرماتے ہیں: اس معلوم ہوا کہ اگر کسی جگہ سفر کے ارادہ سے نکلے، پھر راستہ میں معلوم ہوا کہ وہاں وبا اور طاعون پھیلا ہوا ہے، تو وہاں سے واپس آنے میں کوئی حرج نہیں ہے، یہ رجوع بدفالی کی وجہ سے نہیں؛ بلکہ اپنے کو ہلاکت سے بچانے کے لیے ہے۔

شیخ تقی الدین ابنِ دقیق العیدؒ فرماتے ہیں: طاعون زدہ علاقہ میں جانے اور وہاں سے نکلنے کی ممانعت اس لیے یہ ہے کہ اس طرح کا اقدام کرنے میں نفس کو مصیبت میں ڈالنا ہے، ممکن ہے وہ اس مصیبت پر صبر نہ کر سکے، نیز اس میں صبر اور توکل کے مقامِ بلند پر فائز ہونے کا دعویٰ بھی ہے؛ اس لیے منع کیا گیا ہے۔

اسی طرح طاعون زدہ علاقہ سے نکلنے میں اسباب کے اختیار کرنے میں اتنا مبالغہ ہے جس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام مسائل کا حل اسباب میں ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہم کو شریعت نے دونوں حالتوں میں اعتدال کو اختیار کرنے اور تکلف کو چھوڑنے کا حکم دیا ہے۔

لغات: الأجناد: جند کی جمع لشکر... لأمر أي أمرٍ مهمٍ.
بقية الناس أي بقية خيارهم...... هَبَطْتَ (ض) هبطًا اترنا۔
عدو بالتا عدوة کی جمع: وادی کی بلند جگہ یعنی اس کا کنارہ۔

مُخْصِبَۃٌ من أخصب: نشوونما ہونا...... جَدَبَۃ قحط، ویران ہونا۔

وضاحت: موطا کے نسخہ میں عبداللہ ابنِ عیاش سے روایت کی گئی؛ لیکن یہ کاتب کی غلطی ہے، دراصل یہ عبداللہ ابنِ عباس ہے۔

عَنْ عَامِرِ بْنِ سَعْدِ بْنِ أَبِيْ وَقَّاصٍ أَنَّهُ سَأَلَ أُسَامَةَ بْنَ زَيْدٍ مَا ذَا سَمِعْتَ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ فِي الطَّاعُوْنِ فَقَالَ أُسَامَةُ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الطَّاعُوْنُ رِجْزٌ أُرْسِلَ عَلىٰ طَائِفَةٍ مِّنْ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ أَوْ عَلىٰ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ فَإِذَا سَمِعْتُمْ بِهِ بِأَرْضٍ فَلَا تَدْخُلُوْا عَلَيْهِ وَإِذَا وَقَعَ بِأَرْضٍ وَأَنْتُمْ بِهَا فَلَا تَخْرُجُوْا فِرَارًا مِنْهُ قَالَ مَالِكٌ قَالَ أَبُوا النَّضْرِ لَايُخْرِجُكُمْ إِلَّا فِرَارًا مِنْهُ.

ترجمہ: عامر بن سعد بن ابی وقاص اپنے والد سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے اس چیز کے بارے میں سوال کیا جو انہوں نے طاعون کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا؟ حضرت اسامہ نے کہا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: طاعون ایک عذاب ہے، جو بنی اسرائیل کے قبیلہ پر بھیجا گیا تھا یا ان سے پہلے لوگوں پر بھیجا گیا تھا، پس اگر تم کسی علاقہ میں طاعون کے بارے میں سنو تو وہاں داخل مت ہو اور اگر کسی جگہ طاعون آجائے اور تم پہلے سے وہاں ہو تو وہاں سے نہ نکلو، اس سے بھاگتے ہوئے، امام مالکؒ فرماتے ہیں: ابوالنضر نے ''إِلَّا فِرارًا مِنْهُ'' بیان ہے یعنی ''إِلَّا'' کے اضافہ کے ساتھ۔

تشریح: حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے معلوم کیا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے طاعون کے سلسلہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ سنا ہے، تو انہوں نے جواب دیا، ہاں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے طاعون کے بارے میں فرمایا یہ ایک قسم کا عذاب ہے، جو بنی اسرائیل پر ان کی فحش کاری اور بدکاری کی بنا پر بھیجا گیا تھا، یا ان سے پہلے لوگوں پر بھیجا گیا تھا۔

واقعہ یہ ہوا تھا کہ ایک شخص جس کا نام بلعم بن باعورا تھا، یہ ملکِ شام میں بیت المقدس کے قریب کنعان کا رہنے والا تھا، یہ ایک نیک اور مستجاب الدعوات آدمی تھا، غرقِ فرعون اور ترکِ مصر کے بعد حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کو جب قومِ عمالقہ سے جہاد کرنے کا حکم ملا اور جبارین نے دیکھا کہ موسیٰ علیہ السلام قریب آچکے ہیں، تو وہ اس شخص کے پاس آئے اور کہا: موسیٰ علیہ السلام سخت آدمی ہیں اور ان کے پاس ایک لشکر ہے، وہ ہماری زمینوں پر قبضہ کرلیں گے، آپ اللہ سے دعا کریں کہ ان کو ہمارے ملک سے واپس کردے۔

بلعم نے اوّلاً تو معذرت کی اور کہا وہ اللہ کے نبی ہیں، میں ان کے لیے بددعا کیسے کرسکتا ہوں، اگر میں نے ایسا کیا تو میرا دین اور دنیا دونوں برباد ہوجائیں گے؛ لیکن انہوں نے بے حد اصرار کیا تو اس نے کہا میں استخارہ کروں گا اور اپنے رب کی رضا معلوم کروں گا؛ چنانچہ اس کو استخارہ سے یہ اشارہ دیا گیا کہ وہ بددعا نہ کرے اور اس نے قوم سے کہہ بھی دیا کہ مجھے بددعا سے منع کیا گیا ہے؛ لیکن ان لوگوں نے ایک بہت بڑا تحفہ اسے پیش کیا، اس نے قبول کرلیا، اب قوم نے اور بھی اصرار کیا اور اب وہ بددعا کرنے پر راضی ہوگیا، جب اس نے بددعا کرنا شروع کی تو اس وقت قدرت کا کرشمہ یہ ہوا کہ وہ کلمات بددعا جو موسیٰ علیہ السلام کے لیے کہنا چاہتا تھا اُسی قوم کی بددعا کے لیے نکل گئے، ان لوگوں نے اس پر ملامت کی کہ تو ہمارے ہی لیے بددعا کررہا ہے، وہ اٹھ کر چلے گئے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اس قومِ جبارین پر تباہی آئی اور اس شخص کی زبان لٹک کر سینے پر آگئی، اب اس نے جبارین سے کہا میری دنیا وآخرت تو دونوں برباد ہوگئی ہیں؛ لیکن میں تمہیں ایک تدبیر بتاتا ہوں کہ تم اپنی حسین لڑکیوں کو آراستہ کرکے بنی اسرائیل کے لشکر میں بھیج دو اوران کو تاکید کردو کہ بنی اسرائیل میں سے جوکوئی بھی ان کے ساتھ کچھ کرنا چاہے اسے منع نہ کریں، اس کی اس چال پر عمل کیا گیا اور بنی اسرائیل فعلِ حرام میں مبتلا ہوگئے جس کے نتیجہ میں اللہ نے ان پر طاعون بھیج دیا جس میں ستر ہزار آدمی ہلاک ہوگئے، مؤرخین نے اسی طرح کے اور بھی واقعات ذکر کیے ہیں۔

قَالَ مَالِكٌ رحمه الله: قَالَ اَبُوا النَّضْرِ. امام مالکؒ فرماتے ہیں: محمد بن المنکدر کی روایت میں ''فَلَاتَخْرُجُوْا فِرَارًا مِّنْـهُ'' ہے اور ابوالنضر نے ''لایخرجکم إلا فرارا منه'' بیان کیا ہے۔

نوٹ: (باب کی دو حدیثوں کو مکرر ہونے کی وجہ سے چھوڑ دیا گیا ہے۔

عَنْ مَالِكٍ أَنَّهُ بَلَغَنِيْ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ لَبَيْتٌ بِرُكْبَةِ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ عَشْرَةِ أَبْيَاتٍ بِالشَّامِ.

قَالَ مَالِكٌ رحمه الله: يُرِيْدُ لِطُوْلِ الْأَعْمَارِ وَالْبَقَاءِ وَلِشِدَّةِ الْوَبَاءِ بِالشَّامِ.

ترجمہ: امام مالکؒ فرماتے ہیں: مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مقامِ رکبہ میں ایک گھر مجھے زیادہ پسندیدہ ہے شام کے علاقہ میں دس گھروں سے۔

امام مالکؒ نے فرمایا: مراد لمبی زندگیاں اور بقاء ہے اور شام میں سخت وباء کا پھیلنا ہے۔

تشریح: رکبۃ طائف کی وادیوں میں سے ایک وادی ہے یا مکہ اور عراق کے درمیان شہر ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب شام تشریف لے گئے اور وہاں طاعون پھیلنے کی وجہ سے مدینہ واپس آگئے تو فرمایا: میرے نزدیک پسندیدہ بات یہ ہے کہ مقامِ ''رکبہ'' میں ایک گھر بہتر ہے علاقہ شام میں دس گھر ہونے کے مقابلہ میں، آپ نے یہ اس لیے فرمایا؛ کیونکہ مقامِ رکبہ کی فضاء وغذا صحت بخش تھی اور وہاں کے لوگوں کی عمریں لمبی لمبی ہوتی تھیں جبکہ شام کثیر الوباء بیماریوں کا علاقہ تھا؛ اس لیے فرمایا: وہاں دس گھر ہوں یہ مجھے پسند نہیں؛ کیونکہ جب زندگی ہی سلامت نہ رہے گی تو گھروں کے اضافہ سے کیا فائدہ۔

○❖○

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلنَّهْيُ عَنِ الْقَوْلِ فِي الْقَدْرِ

(تقدیر کے بارے میں بے جا غور وخوض کی ممانعت)

قدر: بفتح القاف والدال وتسكن الدال بمعنیٰ اندازہ لگانا، مقرر کرنا، حکم لگانا۔
وفي النهايه: القدر ماقضاه الله وحكم به من الأمور. (محشی)

اصطلاحِ شریعت میں "قدر" نام ہے ان اُمور کا جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ ازل میں فیصلہ کر چکے ہیں، اور جن کے ہونے نہ ہونے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا حکم ثبت ہو چکا ہے۔

تقدیر، ایمانیات کا جزوِ لاینفک ہے یعنی ہر مؤمن کے لیے اس بات کا اعتقاد رکھنا لابدی ہے کہ دنیا میں اب تک جو کچھ بھی وقوع پذیر ہوا ہے اور جو کچھ آئندہ ہوگا وہ سب اللہ تعالیٰ کے فیصلۂ ازلی اور اس کے حکم کے مطابق ہے، یہی ایمان بالقدر ہے، پھر قضاء اور قدر شئ واحد ہیں یا دونوں میں فرق ہے؟

تو علامہ کرمانیؒ فرماتے ہیں کہ علماء کے نزدیک احکامِ اجمالیہ کلیہ جو ازل میں ہیں، وہ قضاء ہیں اور وہ احکامِ جزئیہ تفصیلیہ جو ازلی کلیات کے مطابق وجود پذیر ہوں گے قدر ہے۔ (فتح الباری)

حضرت نانوتویؒ نے بھی فرق کیا ہے؛ لیکن حضرتؒ کا موقف اوپر کی تفصیل کے برعکس ہے، حضرت فرماتے ہیں مثلاً کسی مکان کو بنانے کے ارادہ کے وقت جو نقشہ ذہن میں ہوتا ہے وہ بمنزلہ قدر کے ہے، اور اسی کے مطابق خارج میں جو مکان تیار ہوا ہے وہ بمنزلہ قضاء ہے۔

اس کے برخلاف علماء کی اکثریت نے اس میں فرق کو تسلیم نہیں ہے۔
اور اس باب کے اندر ایمان بالقدر کے ساتھ ساتھ اس میں غور وخوض اور بحث وتفتیش کی ممانعت کو بیان کیا گیا ہے۔

کیونکہ مسئلۂ تقدیر مزلۃ الاقدام اور سر من اسرار اللہ ہے جس کی پوری حقیقت کی اطلاع نہ کسی مقرب فرشتہ کو دی گئی اور نہ کسی نبی اور رسول کو اس سے مکمل آشنا کرایا گیا، قرآن وحدیث کے بیان سے زیادہ محض عقل سے اس کی گہرائی میں اترنا حد جواز سے نکل جاتا ہے۔

اسی لیے عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: من تكلم في شئ من القدر سئل عنه يوم القيامة ومن لم يتكلم فيه لم يسئل عنه.

نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ سے تقدیر کے سلسلہ میں سوال کیا گیا تو آپؓ نے فرمایا:
طريق مظلم لاتسلكه، واعاد السوال فقال بحر عميق لاتلجه فأعاد السوال فقال سر الله قد خفي عليه فلا تفتشه.

لہٰذا تقدیر کے مسئلہ میں قیاس آراء اقوال سے احتراز ضروری ہے؛ ورنہ جبریہ یا قدریہ جیسی بدعقیدگی کا قوی اندیشہ ہے؛ کیونکہ تقدیر کے مسئلہ کو عقل کے دائرے میں لانا اور اس کو دلائلِ عقلیہ سے ثابت کرنا اور کوئی محقق اور واضح مرتبہ جبر وقدر کے درمیان ثابت کرنا جس سے ہر شخص بات سمجھ جائے تقریباً ناممکن ہے اور تقدیر کی حقیقت کا انکشاف تقریباً محال ہے؛ اس لیے اس میں غور وخوض کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی راہِ حق سے ہٹنے لگتا ہے اور فکری گمراہی میں مبتلا ہوجاتا ہے؛ اس لیے قرآن وحدیث میں جو بیان کیا گیا ہے، اسی کو سمجھنے پر اکتفا کرے، اگرچہ اس کی مکمل حقیقت سے آشنا نہ ہوسکے۔

(عون الترمذی، تحفۃ الالمعی :۵)

(مسئلہ تقدیر کی مزید وضاحت احادیث کے تحت آتے رہے گی، ان شاء اللہ)

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ تَحَاجَّ اٰدَمُ وَ مُوْسٰى

فَحَجَّ اٰدَمُ مُوْسیٰ فَقَالَ لَهُ مُوْسیٰ أَنْتَ اٰدَمُ الَّذِيْ أَغْوَيْتَ النَّاسَ وَأَخْرَجْتَهُمْ مِنَ الْجَنَّةِ فَقَالَ لَهُ اٰدَمُ أَنْتَ مُوْسَى الَّذِيْ أَعْطَاكَ اللهُ عِلْمَ كُلِّ شَيْئٍ وَاصْطَفَاكَ بِرِسَالَتِهٖ قَالَ نَعَمْ قَالَ اَفَتَلُوْمُنِيْ عَلٰى أَمْرٍ قَدْ قُدِّرَ عَلَيَّ قَبْلَ أَنْ أُخْلَقَ.

ترجمہ: حضرت موسیٰ اور آدم علیہما السلام میں مناظرہ ہوا اور آدمؑ (دلیل سے) حضرت موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے، واقعہ یہ ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام نے حضرت آدم علیہ السلام سے کہا آپ وہی ہیں جس نے لوگوں کو گمراہ کیا اور آپ نے ان کو جنت سے نکال دیا، تو آدم علیہ السلام نے جواب دیا کہ آپ وہی موسیٰ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے مخلوقات سے اپنی پیغمبری کے لیے منتخب فرمایا اور ہر چیز کا علم عطا فرمایا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: جی یہ بات بالکل درست ہے، تو آدم علیہ السلام نے فرمایا: آپ مجھ پر ایسی چیز کے بارے میں ملامت کر رہے ہیں، جو میری پیدائش سے پہلے میرے مقدر میں لکھ دی گئی تھی۔

تشریح: حدیث پاک میں چند بحثیں ہیں:

(۱) حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان ہزاروں سال کے فاصلہ کے ساتھ یہ مناظرہ کیسے ممکن ہے؟

تو اس بارے میں مختلف آراء سامنے آئی ہیں، ایک رائے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں زندہ کر دیا تھا یعنی یہ مناظرہ دنیا میں ہی واقع ہوا۔ دوسری رائے یہ ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کے انتقال کے بعد ان کی روح عالمِ ارواح میں پہونچی، وہاں یہ مناظرہ پیش آیا، اور بعض لوگوں کا قول یہ ہے کہ لیلۃ المعراج میں جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تمام انبیاء کرام علیہم السلام جمع ہوئے، وہاں یہ مناظرہ ہوا، علامہ قابسیؒ کی رائے یہ ہے کہ دونوں کی ارواح آسمان میں جمع ہوئی، وہاں یہ مناظرہ ہوا ہے، واللہ اعلم حقیقۃ الحال۔

(۲) دوسری بحث یہ ہے کہ بظاہر آدم علیہ السلام نے لغزش کے عذر میں تقدیر کو پیش کیا، جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ گناہ کے عذر میں تقدیر پیش کرنا جائز ہے، لہٰذا ہر عاصی اپنے گناہ کے عذر میں تقدیرِ الٰہی کا حوالہ دے کر ملامت، سزا وغیرہ سے دستبردار ہو سکتا ہے جو ایک نامعقول بات ہے، نیز اس سے وعظ و نصیحت اور ارسال رسل وغیرہ تمام چیزوں کا بے کار اور ضائع ہونا متصور ہوتا ہے، اسی کے ساتھ یہ جواب مذہبِ جبریہ کا مؤید بھی ثابت ہوتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ دراصل حضرت آدم علیہ السلام کی نظر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اعتراض بچند وجوہ نامناسب تھا، اسی سبب آدم علیہ السلام نے تقدیر کو جواباً ان کے سکوت کے لیے پیش کیا، معصیت اور لغزش کے عذر کے طور پر پیش نہیں کیا۔

پہلی وجہ یہ تھی یہ اعتراض دار التکلیف میں نہ تھا، دوسری وجہ تھی کہ معصیت پر ملامت اصلاح کے لیے ہوتی ہے اور اس کا تعلق بھی دار التکلیف سے ہے جبکہ یہ مناظرہ عالمِ بالا میں تھا جہاں ملامت کا نتیجہ محض شرمندگی ہے۔

تیسری وجہ یہ تھی اور یہی سب سے بہتر حل ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس وقت آدم علیہ السلام پر نکیر فرمائی جب کہ وہ اپنے فعل سے تائب و نادم ہو کر دربارِ الٰہی میں مقبول بھی ہو چکے تھے؛ حالانکہ توبہ کے بعد کسی کے فعل پر ملامت کرنا مناسب نہیں ہے لِأَنَّ التَّائِبَ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهُ.

اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدائے حدیث میں ارشاد فرمایا کہ: حضرت آدم علیہ السلام بطورِ دلیل حضرت موسیٰ علیہ السلام پر غالب آگئے اور غلبہ سے مراد توبہ کے بعد معصیت پر ملامت کے مناسب نہ ہونے کو ثابت کرنا ہے۔

لیکن پھر اشکال یہ باقی ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جانب سے ملامت مناسب تھی، تو آدم علیہ السلام نے جواباً یہی بات کیوں نہ فرما دی کہ ”جس فعل سے میں توبہ کر چکا ہوں اور مجھے کو قبولیت سے بھی نواز دیا گیا“ تو آپ مجھ کو ملامت کیوں کر رہے ہیں؟ جواب میں تقدیر کو پیش کیوں کیا؟

اس کا جواب حافظ ابنِ حجرؒ نے یہ دیا ہے کہ جو فعل حضرت آدم علیہ السلام سے صادر ہوا اس میں قدر وکسب دونوں شامل تھے، تو توبہ سے کسب کا اثر تو مٹ گیا اور رہا قدر تو اس کی وجہ سے ملامت غیر مناسب ہے؛ کیونکہ وہ فعل اللہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے فعل کے بارے میں سوال ناجائز ہے

اور اس جواب کو پیش کرنے میں اثبات تقدیر اور مصالح تکوین بھی ہیں۔

(تکملہ فتح الملہم: ۱۱/۲۷۶)

اور ایک اہم توجیہ یہاں یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام تقدیر کو پیش کرنا اعتذار عن المعصیۃ کے طور پر نہیں؛ بلکہ مصائب پر تسلی دینے کے لیے پیش کیا تھا۔

(۳) تیسری بحث یہ ہے کہ ''اغویت الناس'' اس میں سببِ بعید کی جانب اشارہ ہے یعنی اگر شجر ممنوعہ کو تناول نہ فرماتے تو اخراج من الجنۃ نہ ہوتا اور جب جنت سے اخراج نہ ہوتا تو شہوات وشیطان کا تسلط نہ ہوتا جو کہ گمراہی کا سبب ہے۔

علم کل شیٔ بطورِ تغلیب کے ہے۔

خلاصہ: اس حدیث میں اس بات کی تعلیم ہے کہ اوّلاً تقدیر پر تکیہ نہیں کرنا چاہیے، معاملات کو اسباب کے دائرہ میں لانا چاہیے اور اچھائی کے اسباب اختیار کرنے چاہئیں اور برائی کے اسباب سے بچنا چاہیے، پھر جب معاملہ ایک طرف ہو جائے تو تقدیر پر اعتماد کرنا چاہیے، مثلاً کسی کا بچہ بیمار پڑ گیا، تو وہ ہر طرح سے علاج ومعالجہ کرائے، تقدیر پر بھروسہ کر کے نہ بیٹھے؛ مگر جب بچہ فوت ہو جائے تو رضا بہ قضاء کا مرحلہ شروع ہوتا ہے، اب آدمی کو یہ سوچنا چاہیے کہ جو مقدر تھا وہ ہوا اور اسی میں میرے لیے خیر تھی، یہ تقدیر ایمان کا بہت بڑا فائدہ ہے۔

عَنْ مُسْلِمِ بْنِ يَسَارٍ الْجُهَنِيِّ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ سُئِلَ عَنْ هٰذِهِ الْآيَةِ ﴿وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى أَنْفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوْا بَلٰى ۚ شَهِدْنَا ۚ أَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا

ذُرِّيَّتَهُمْ ﴾ فَقَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُسْأَلُ عَنْهَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ اللهَ تَعَالٰى خَلَقَ اٰدَمَ ثُمَّ مَسَحَ ظَهْرَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَاسْتَخْرَجَ مِنْهُ ذُرِّيَّةً فَقَالَ خَلَقْتُ هٰؤُلَاءِ لِلْجَنَّةِ وَبِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ يَعْمَلُوْنَ ثُمَّ مَسَحَ ظَهْرَهٗ فَاسْتَخْرَجَ مِنْهُ ذُرِّيَّةً فَقَالَ خَلَقْتُ هٰؤُلَاءِ لِلنَّارِ وَبِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ يَعْمَلُوْنَ فَقَالَ رَجُلٌ يَارَسُوْلَ اللهِ فَفِيْمَ الْعَمَلُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ اللهَ إِذَا خَلَقَ الْعَبْدَ لِلْجَنَّةِ اسْتَعْمَلَهٗ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ حَتّٰى يَمُوْتَ عَلٰى عَمَلٍ مِنْ أَعْمَالِ أَهْلِ الْجَنَّةِ فَيُدْخِلُهٗ بِهِ الْجَنَّةَ وَإِذَا خَلَقَ الْعَبْدَ لِلنَّارِ اسْتَعْمَلَهٗ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ حَتّٰى يَمُوْتَ عَلٰى عَمَلٍ مِنْ أَعْمَالِ النَّارِ فَيُدْخِلُهٗ بِهِ النَّارَ.

ترجمہ: مسلم بن یسار جہنی سے روایت ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے آیت کریمہ ﴿وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ الْاٰيَة﴾ (جب آپ کے رب نے اولادِ آدم کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان سے انہیں کے متعلق عہد لیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا، کیوں نہیں، ہم سب گواہ بنتے ہیں؛ تا کہ تم لوگ قیامت کے روز یہ نہ کہنے لگو کہ ہم تو اس توحید سے محض بے خبر تھے (بیان القرآن)) کے بارے میں دریافت کیا گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی آیت کے بارے میں سوال کیا جارہا تھا؛ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا، پھر اپنے دائیں ہاتھ کو ان کی پشت پر پھیرا اور اس سے ایک مخلوق کو نکالا اور فرمایا ان لوگوں کو میں نے جنت کے لیے پیدا فرمایا ہے اور یہ لوگ اہلِ جنت کے اعمال کریں گے، پھر ان کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور ایک مخلوق کو نکالا اور فرمایا ان لوگوں کو میں نے جہنم کے لیے پیدا فرمایا ہے اور یہ جہنمیوں والے اعمال کریں گے، تو ایک شخص نے دریافت کیا کہ پھر عمل کا کیا فائدہ ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ

جب اللہ تعالیٰ بندہ کو جنت کے لیے پیدا فرماتے ہیں تو اس سے جنت والے لوگوں کے اعمال کراتے ہیں، یہاں تک کہ اس کی موت جنتیوں کے اعمال میں سے ہی کسی عمل پر ہوتی ہے، پھر اس کو اس کے ساتھ جنت میں داخل فرمادیتے ہیں، اور جب کسی بندہ کو جہنم کے لیے پیدا فرماتے ہیں تو اس سے جہنمیوں والے اعمال سرزد کراتے ہیں، یہاں تک کہ اس کی جہنمیوں کے اعمال میں سے ہی کسی عمل پر موت ہوتی ہے، اور اس کو اس کے بُرے عمل کے ساتھ جہنم میں داخل کردیتے ہیں۔

تشریح: اوّلاً آیتِ مبارکہ کی تفسیر پیشِ خدمت ہے:

گزشتہ آیات میں بنی اسرائیل کے میثاقِ توحید کا بیان تھا، اس پر اشکال ہوسکتا ہے کہ اسرائیلیوں سے لیا ہوا میثاقِ توحید دیگر انسانوں کے لیے کیوں کر حجت ہوگا؟ چنانچہ اس آیت میں اسی توحید پرستی کا بیان ہے کہ توحید شناسی اور توحید پرستی کا اقرار تو پوری انسانیت سے لیا جاچکا ہے، یعنی اللہ کو وحدہٗ لاشریک لہٗ تسلیم کرنا فطرتِ سلیمہ کا جزو ہے۔

چنانچہ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مقامِ عرفات کی ایک وادی ''نعمان'' میں آدم علیہ السلام کی اولاد کو ان سے نکال کر جمع فرمایا، جو کہ چونٹیوں کی شکل میں تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا: کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟

کیا میں رب نہیں ہوں؟ تو سب نے اس خداداد عقل سے حقیقتِ امر کو سمجھ کر جواب دیا، کیوں نہیں؛ واقعی آپ ہمارے رب ہیں، حق تعالیٰ نے وہاں جتنے ملائکہ اور مخلوقات حاضر تھے سب کو گواہ کر کے سب کی طرف سے فرمایا: ہم سب اس واقعہ کے گواہ بنتے ہیں، اس تفسیر کو ابنِ جریرؒ اور حضرت تھانویؒ وغیرہ نے اختیار کیا ہے یعنی ﴿شَهِدْنَا﴾ اللہ کا کلام ہے نہ کہ ﴿بَلٰى﴾ کا تتمہ جب کہ صاحبِ تفسیر کبیر نے فرمایا کہ: شَهِدْنَا، بَلٰى کا تتمہ ہے یعنی اولادِ آدم کا ہی قول ہے اور یہ اقرار و شہادت اس لیے ہوا؛ تاکہ تم میں سے ترکِ توحید اور اختیارِ شرک پر سزا پاتے وقت قیامت کے دن یہ نہ کہنے لگیں کہ ہم تو اس توحید سے بالکل

بے خبر اور غافل تھے اور اولادِ آدمؑ کو ان کی پشتوں سے نکالنے کی شکل و کیفیت یہ تھی کہ: اللہ تعالیٰ نے جب پہلی مرتبہ ہاتھ پھیرا تو ذریت کا ایک گروہ نکلا اور اس کے بارے میں اللہ نے فرمایا: یہ جنت میں داخل ہوں گے؛ کیونکہ یہ جنت والے عمل کریں گے، پھر دوسری مرتبہ ہاتھ پھیرا اور ذریتِ آدمؑ کا دوسرا گروہ وجود میں آیا، اس کے بارے میں اللہ نے فرمایا: ان لوگوں کو میں نے جہنم کے لیے پیدا کیا ہے اور جہنم والے اعمال ہی کریں گے۔

ایک صحابی (غالباً عمران بن حصین رضی اللہ عنہ) نے دریافت کیا: اے اللہ کے رسول! جب کچھ لوگوں کا جنت میں اور دوسرے کچھ کا جہنم میں جانا پہلے سے طے ہے تو پھر عمل کرنے کا کیا فائدہ ہے؟ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ انسان ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے؛ بلکہ بندہ کو عمل کرنے کا اختیار دیا گیا اور یہ تقدیر اجمالی نہیں ہے؛ بلکہ تفصیلی ہے یعنی جب بندہ جو کام کرتا ہے اپنے اختیار سے کرتا ہے اور اللہ اسے توفیق دیتے ہیں اور اس کے کاموں کی تخلیق کرتے ہیں، پس جو بندہ ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا اور اسی پر اس کی موت آئے گی اور نیک بندوں کے زمرے میں شامل ہوگا اور دوسرا اس کے برعکس ہوگا، پس ہر ایک کو اچھے کام کی کوشش کرنی چاہیے اور بُرے کاموں سے رکنا چاہیے اور ایک جگہ ارشاد فرمایا ''وکل میسر لما خلق'' یعنی ہر شخص کے لیے وہی چیز آسان کی جاتی ہے جس کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔

فائدہ: تقدیر کے مسئلہ پر جو اشکال ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان صرف ایک جہت سے سوچتا ہے جبکہ تقدیر کے مسئلہ کی دو جانب ہیں:

ایک اللہ کی جانب ہے کہ سب کچھ ازل سے طے شدہ ہے اور اللہ ہر چیز جانتے بھی ہیں؛ مگر یہ صرف عقیدہ ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کا ایک جز ہے جس پر ایمان لانا ضروری ہے۔

دوسری جانب بندوں کی ہے جو عمل کی جانب ہے یعنی ہم کو یہ حکم ہے کہ اپنے اختیار اور تمیز سے اچھے کام کریں اور بُرے کاموں سے رکیں؛ تا کہ اچھے انجام سے ہم کنار

ہوں؛ کیونکہ دنیا دارالاسباب ہے، یہاں ہر چیز کا سبب ہے، جس سے مسببات وجود میں آتے ہیں اور تقدیرِ الٰہی میں صرف مسببات نہیں؛ بلکہ اسباب بھی ہیں، اور اعمالِ صالحہ اور سیئہ کے علاوہ کائنات کی ہر چیز میں انسان اس کو تسلیم بھی کرتا ہے اور اس پر عمل پیرا بھی ہے، پس یہی بات ایمان واعمالِ صالحہ اور کفر واعمالِ سیئہ میں بھی تسلیم کر لی جائے یعنی جو جنت میں جائے گا، وہ اعمالِ صالحہ کی وجہ سے اور جو جہنم میں جائے گا، وہ اعمالِ سیئہ کی وجہ سے جائے گا، اس کی نظیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں صراحتاً ہر بندہ کو رزق دینے کا وعدہ فرمایا ہے، تو یہ ایک عقیدہ ہے، اسی وجہ سے دنیا کا کوئی انسان صرف اسی عقیدہ پر جما نہیں بیٹھا رہتا؛ بلکہ معاش کمانے کے اسباب اختیار کرتا ہے، تو اللہ کی طرف سے رزق کا وعدہ ایک جانب ہے اور اسباب کو اختیار کرنا دوسری جانب ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو مسئلہ کی دوسری جانب یعنی معاملات اور اختیار کو اپنی جہت سے دیکھنا چاہیے اور یہ بات دنیا میں بھی تسلیم کی جاتی ہے، اسی طرح ایمان واعمالِ صالحہ، کفر واعمالِ سیئہ کو دیکھنا چاہیے یعنی بندہ اپنے اختیار سے اسباب کے دائرے میں کوشش کرتا رہے، پھر کوئی اشکال نہیں ہوگا، واللہ اعلم۔

عَنْ مَالِكٍ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ تَرَكْتُ فِيْكُمْ أَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا كِتَابَ اللهِ وَسُنَّةَ نَبِيِّهِ.

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں نے تمہارے درمیان دو چیزوں کو چھوڑا ہے جب تک تم ان دونوں کو مضبوطی سے پکڑے رہو گے تم ہرگز گمراہ نہیں ہو سکتے اور وہ دو چیزیں: اللہ کی کتاب اور اس کے نبی کی سنت اور طریقہ ہے۔

تشریح: اس روایت میں قرآن وسنت کو سیکھنے اور مضبوطی سے پکڑنے اور ان پر ہر حال میں عمل پیرا ہونے کی ترغیب دی گئی ہے اور جو شخص قرآن وسنت میں بیان کردہ اُصول وجزئیات کی اقتدا کرتے رہے گا، اس کے گمراہ نہ ہونے کی ضمانت ہے۔

اور اس حدیث کو یہاں ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ تقدیر کے بارے میں اسلامی

تعلیمات قرآن وحدیث میں بھری پڑی ہیں، لہٰذا انسان کو مسئلہ تقدیر قرآن وسنت کے دائرے میں رہ کر سمجھنا چاہیے، اس میں اپنی عقل کے گھوڑے نہ دوڑائے۔

وضاحت: كتاب الله وسنة نبيه: بدلیت کی بناء پر منصوب ہیں۔

عَنْ طَاؤُسٍ الْيَمَانِيِّ أَنَّهُ قَالَ أَدْرَكْتُ نَاسًا مِنْ أَصْحَابِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُوْنَ كُلُّ شَيْئٍ بِقَدَرٍ قَالَ طَاؤُسٌ وَسَمِعْتُ عَبْدَ اللهِ بْنَ عُمَرَ يَقُوْلُ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُلُّ شَيْئٍ بِقَدَرٍ حَتَّى الْعَجْزُ وَالْكَيْسُ.

ترجمہ: حضرت طاؤس سے روایت ہے وہ کہتے ہیں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے اصحاب سے ملا ہوں وہ فرماتے ہیں: ہر چیز قضاءِ الٰہی کے مطابق ہوتی ہے، طاؤس کہتے ہیں: میں نے عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کو فرماتے ہوئے سنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: دنیا کی ہر چیز تقدیرِ الٰہی کے مطابق وجود پذیر ہوتی ہے، یہاں تک کہ انسان کا عاجز ہونا اور عقل مند ہونا۔

تشریح: اس روایت میں تقدیر کا دائرہ بیان کیا گیا ہے، تمام کائنات خواہ ارضی ہو یا سماوی اس کا کوئی ذرہ، اس کا کوئی حال تقدیر کے دائرے سے باہر نہیں اور تقدیر صرف اجمالی نہیں؛ بلکہ تفصیلی ہے، یعنی تقدیر میں صرف مسببات ومعلولات ہی نہیں؛ بلکہ ان کے اسباب علل بھی ہیں، مذکورہ حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر چیز تقدیرِ الٰہی سے ہے، یہاں تک کہ آدمی کا ناکارہ (ناقابل) ہونا اور ہوشیار ہونا یعنی آدمی کی صفات: قابلیت وناقابلیت، صلاحیت وعدمِ صلاحیت اور عقل مندی اور بے وقوفی وغیرہ بھی اللہ کی تقدیر سے ہیں، پس دنیا میں جو کوئی جیسا اور جس حالت میں ہے وہ سب اللہ کی قضاء وقدر کے ماتحت ہے۔

العجز والكيس: عجز عین کے فتح کے ساتھ، معنیٰ ہیں: عدمِ قدرت یا جس چیز کا کرنا ضروری ہو اس کو ترک کر دینا یا مؤخر کر دینا یا اس سے مراد ہے طاعات یا تمام اُمورِ دنیا سے عاجز ہونا۔

والکیس: کاف کے فتح اور ''یا'' کے سکون کے ساتھ عجز کی ضد، اس کے معنی ہیں نشاط، باریک بینی، کمالِ عقل، اشیاء کو پہچاننا کہ کونسی نافع ہے اور کونسی ضار ہے۔

سوال: جب عجز و کیس حقیقی طور پر ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں تو تقابل کیوں کیا گیا ہے؟

طیبیؒ نے فرمایا: اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے مفہوم میں عموم پیدا ہو جائے گا یعنی دونوں لفظوں میں سے ہر لفظ کی ضد بھی ملحوظ ہے: گویا یہ فرمایا گیا عجز و قدرت اور کیس و بلادۃ ہر چیز تقدیر کے تحت ہے۔

عَنْ عَمْرِو بْنِ دِيْنَارٍ أَنَّهُ قَالَ سَمِعْتُ عَبْدَ اللهِ بْنَ الزُّبَيْرِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا يَقُوْلُ فِيْ خُطْبَتِهِ إِنَّ اللهَ هُوَ الْهَادِيْ وَالْفَاتِنُ.

ترجمہ: عمرو بن دینار کہتے ہیں میں نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کو خطبہ میں کہتے ہوئے سنا: اللہ تعالیٰ ہی ہدایت دینے والے اور گمراہ کرنے والے ہیں۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی لوگوں کو بھلائی کا راستہ بتلاتے ہیں اور مصالحِ دینیہ اور دنیوی کا الہام کرتے ہیں اور اعمالِ صالحہ کی توفیق عطا فرماتے ہیں، اسی طرح گمراہی میں لے جانا، ایمان سے محروم کر دینا یہ سب بھی اللہ کے اختیار میں ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ لوگوں کا مؤمن ہونا، کافر ہونا، نیک ہونا، بد ہونا، سب تقدیر الٰہی کے ماتحت ہے، جس کی تقدیر میں ایمان نہیں ہے اور تمام تر کوششوں کے باوجود ہدایت یافتہ نہیں ہوسکتا ہے جیسا کہ خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابوطالب، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سرپرست ہونے کے باوجود اس دنیا سے کفر کی حالت میں رخصت ہو گئے۔

مَالِكٌ عَنْ عَمِّهِ أَبِيْ سُهَيْلِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّهُ قَالَ كُنْتُ أَسِيْرُ مَعَ عُمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيْزِ فَقَالَ مَا رَأْيُكَ فِيْ هٰؤُلَاءِ الْقَدَرِيَّةِ قَالَ فَقُلْتُ رَأْيِيْ أَنْ تَسْتَتِيْبَهُمْ فَإِنْ قَبِلُوْا ذٰلِكَ وَإِلَّا عَرَضْتَهُمْ عَلَى السَّيْفِ قَالَ عُمَرُ وَذٰلِكَ رَأْيِيْ فِيْهِمْ قَالَ مَالِكٌ وَذٰلِكَ رَأْيِيْ فِيْهِمْ.

ترجمہ: امام مالکؒ اپنے چچا ابوسہیل بن مالک سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے

فرمایا: میں امیر المؤمنین عمر بن عبد العزیزؒ کے ساتھ سفر کر رہا تھا، تو انہوں نے مجھ سے معلوم کیا کہ قدریہ کے سلسلہ میں آپ کی کیا رائے ہے؟ کہتے ہیں میں نے جواب دیا کہ ان لوگوں سے توبہ طلب کی جائے، پس اگر وہ توبہ کو قبول کرلیں (تو بہتر ہے)؛ ورنہ ان کو تلوار پر پیش کرو، عمر بن عبد العزیزؒ نے فرمایا: ان کے بارے میں میری بھی یہی رائے ہے، امام مالکؒ فرماتے ہیں: میری بھی یہی رائے ہے قدریہ کے سلسلہ میں۔

قدریہ وہ جماعت ہے جو تقدیر کا انکار کرتی ہے یعنی اللہ نے ازل میں کسی چیز کو مقدر ومتعین نہیں فرمایا؛ بلکہ دنیا میں رونما ہونے والے واقعات وحوادثات اچانک یکا یک سامنے آجاتے ہیں، مسلم شریف میں ہے: "أنهم يزعمون أن لاقدر، وأن الأمر أنف"، حافظ ابنِ حجرؒ فرماتے ہیں: یہ لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اعمال کے وقوع سے پہلے انہیں نہیں جانتے؛ بلکہ ان کے وجود میں آجانے کے بعد ان کا علم ہوتا ہے، اور یہ کہ بندہ اپنے افعال کا خود خالق ہے، اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس امت کا مجوس قرار دیا ہے؛ کیونکہ مجوس تو دو خداؤں کے قائل ہیں جبکہ قدریہ بندہ کو افعال کا خالق قرار دے کر مختلف خداؤں کے قائل ہوگئے۔

قدریہ کی مختصر تاریخ

اس فرقہ کا بانی کون؟ کس نے اس کی داغ بیل ڈالی؟ اس سلسلہ میں شیخ ابوزہرہؒ نے ایک اُصولی بات کہی کہ کسی فرقہ کے بارے میں حتمی اور یقینی بات کہنا مشکل ہے، اس فرقہ کا بھی یہی حال ہے، قدریہ کی مختصر تاریخ لکھتے ہوئے امام ابنِ تیمیہؒ فرماتے ہیں: خلفاءِ راشدین کے زمانہ میں اس کا نام ونشان بھی نہیں تھا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے آخری دَور میں اس کا ظہور ہوا، اور خود صحابہؓ اس دَور میں موجود تھے، انہوں نے پوری قوت کے ساتھ اس کے استیصال میں حصہ لیا، جن میں ابنِ عباس، ابنِ عمر اور واثلہ ابن اسقع رضی اللہ عنہم کا نام قابلِ ذکر ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جس شخص نے سب سے پہلے مسئلۂ تقدیر پر گفتگو کی وہ

ایک نصرانی شخص تھا؛ لیکن قرینِ قیاس بات یہ ہے کہ قدریت مجوس کے ذریعہ اسلام میں آئی ہے، بصرہ میں ایک شخص جس کا نام سسّور یا سوسن تھا اس نے اسے ایجاد کیا، اس سے معبد جہنی نے اس کو سیکھا ہے اور اس کو فرقہ کی شکل دینے کی کوشش کی، اس نے اپنا مرکز عراق کو بنایا تھا اور پھر بعد میں حجاج نے اس کو فتنہ پردازی کے جرم میں قتل کرادیا تھا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس مسئلہ کی ابتداء اس وقت ہوئی جب عبداللہ ابنِ زبیر رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں ایک مرتبہ خانہ کعبہ کو آگ لگ گئی، تو کسی کی زبان سے نکلا کہ اللہ نے ایسا ہی مقدر کر رکھا تھا، اس پر کسی نے کہا: بھلا اللہ ایسا مقدر کیوں فرماتا، پھر تقدیر کی بحث شروع ہوگئی۔

قدریہ کا حکم:

جاننا چاہیے قدریہ کے دو گروہ ہیں: ایک وہ جو سرے سے اس بات کا انکار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو افعالِ عباد کے بارے میں کچھ علم نہیں ہے، وہ اچانک وجود میں آتے ہیں، اس کے بعد اللہ کو ان کا علم ہوتا ہے، تو ایسے قدریہ کی، علماء نے بالاتفاق تکفیر کی ہے۔

دوسرے وہ ہیں جو تقدیر کی نفی تو نہیں کرتے؛ البتہ وجودِ افعال میں تقدیر کو سبب نہیں مانتے؛ بلکہ بندہ کو قادر و خالق افعال سمجھتے ہیں، ایسے لوگوں کے بارے میں علماء کی رائے یہ ہے کہ ان کی تکفیر میں عجلت سے کام نہیں لینا چاہیے۔

قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں: صحابہؓ میں سے ابنِ عمر رضی اللہ عنہما اور تابعین میں سے حسن بصریؒ وغیرہ ان کی تکفیر کے قائل نہیں ہیں؛ بلکہ اکثر فقہاء اور متکلمین کا مسلک یہی ہے کہ یہ فساق کہلائیں گے نہ کہ کفار؛ کیونکہ یہ لوگ نصوص کا انکار نہیں کرتے ہیں؛ بلکہ ان میں تاویل کرتے ہیں۔

مذکورہ روایت میں امام مالکؒ نے اپنی رائے یہ بتلائی ہے کہ پہلے ان لوگوں سے سے اس عقیدۂ فاسدہ سے توبہ کرنے کی درخواست کی جائے، اگر مان جائیں تو بہتر ہے؛ ورنہ ان کو قتل کردیا جائے، قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں امام مالکؒ نے فرقہ قدریہ اور دوسرے گمراہ فرقوں کو قتل کا

حکم ان کے کفر کی وجہ سے نہیں دیا (کیونکہ ان کے نزدیک یہ فرقے فاسق ہیں کافر نہیں) بلکہ ان کے قتل کا حکم اس لیے دیا کہ ان کی وجہ سے روئے زمین پر فتنہ وفساد رونما ہوتا ہے۔

سوال: ترمذی شریف کی حدیث میں فرمایا گیا کہ قدریہ اور مرجیہ کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرقہ کافر ہے: صنفان من أمتي ليس لهما في الإسلام نصيب المرجيئة والقدرية.

اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث میں وعید اور دھمکی ہے یا یہ کہ ان کا ایمان میں کامل حصہ نہیں ہے۔

قدریہ کہنے کی وجہ تسمیہ:

قدریہ قدر کی طرف منسوب ہے، علامہ باجیؒ فرماتے ہیں ان کی وجہ تسمیہ کے بارے میں اختلاف ہے، بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ ان کو قدریہ اس لیے کہا جاتا ہے؛ کیونکہ یہ تقدیر کے منکر ہیں یا یہ کہ انہوں نے بندے کے لیے بھی قدر کو ثابت کردیا کہ وہ اپنے افعال کا خالق ہے، یا ممکن ہے کہ قدر کے بارے میں بہت زیادہ بحث ومباحثہ کرنے کی وجہ سے انہیں قدریہ کہا گیا ہے۔

جَامِعُ مَا جَاءَ فِيْ أَهْلِ الْقَدَرِ

(قدر کے بارے میں مختلف احادیث)

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَسْأَلُ الْمَرْأَةُ طَلَاقَ أُخْتِهَا لِتَسْتَفْرِغَ صَحْفَتَهَا وَلْتَنْكِحْ فَإِنَّمَا لَهَا مَا قُدِّرَ لَهَا.

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: عورت اپنی بہن کی طلاق کا مطالبہ نہ کرے؛ تاکہ خالی کرے اس کے برتن کو اور وہ نکاح کرے؛ کیونکہ اس کے حصہ کا (مال وغیرہ) صرف اتنا ہے جو اس کے لیے مقدر ہو چکا ہے۔

لاتسأل المرأة طلاق أختها: مطلب یہ ہے کہ ایک شخص کے پہلے سے ایک بیوی ہے، پھر وہ دوسری عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہے، تو اس عورت کے بارے میں یہ اس بات کا مطالبہ نہ کرے کہ اوّلاً پہلی والی کو طلاق دے دو، پھر میں تم سے نکاح کروں گی؛ کیونکہ یہ عورت سمجھتی ہے کہ جب ایک شخص کے دو بیویاں ہوں گی تو تمام اشیا بشمول محبت کے دو حصوں میں تقسیم ہو جائیں گی اور اگر پہلی بیوی کو طلاق دے گا تو سب کچھ میرے حصہ میں آجائے گا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: عورت ایسا مطالبہ نہ کرے؛ بلکہ اگر نکاح کرنا چاہتی ہے تو اپنے سوکن کے رہتے ہوئے نکاح کرلے اور اس کا یہ خیال کہ پہلی بیوی کے طلاق کے بعد سارا مال وغیرہ میرا ہو جائے گا، تو یہ خیال فاسد ہے؛ کیونکہ ہر شخص کو اتنا ہی ملتا ہے، جتنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لیے مقدر کیا جاتا ہے (علامہ باجیؒ فرماتے ہیں اسی آخری ٹکڑے کی وجہ سے یہ حدیث ابوابِ قدر میں ذکر کی گئی) تاہم اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو حافظ ابنِ حجرؒ فرماتے ہیں: اس نے حرام کا ارتکاب کیا ہے اور بعض علماء نے فرمایا: یہ نہی مصلحت اور شفقت پر محمول ہے؛ تاکہ اس کی سوکن کو رنج وغم نہ ہو اور اس پر ظلم نہ ہو۔ (اوجز المسالک:۱۶)

اور حدیث شریف میں بہن سے مراد دینی بہن ہے اور بہن کہنے کی وجہ یہ ہے کہ تاکہ عورت کو یہ خیال رہے کہ وہ اپنی بہن کے بارے میں ظلم اور اسے تکلیف پہنچانے کا مرد سے مطالبہ کیسے کرسکتی ہے۔

عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ كَعْبٍ الْقُرَظِيِّ أَنَّهُ قَالَ مُعَاوِيَةُ بْنُ أَبِيْ سُفْيَانَ وَهُوَ عَلَى الْمِنْبَرِ أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّهُ لَا مَانِعَ لِمَا أُعْطِيَ اللهُ وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعَ اللهُ وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْهُ الْجَدُّ مَنْ يُّرِدِ اللهُ بِهِ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ ثُمَّ قَالَ سَمِعْتُ هٰؤُلَاءِ الْكَلِمَاتِ مِنْ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى هٰذِهِ الْأَعْوَادِ.

ترجمہ: محمد بن کعب قرظی بیان کرتے ہیں کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب وہ منبر پر تشریف فرما تھے: اے لوگو! اللہ جب کوئی چیز عطا کرنا چاہیں تو

اسے کوئی روک نہیں سکتا اور جس چیز کو دینے سے روک لیں اسے کوئی عطا نہیں کر سکتا، اور کسی کوشش کرنے والے کی کوشش اس کے مقابلہ میں نفع نہیں دے سکتی، اور جس کے ساتھ اللہ بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں اسے فقہ (دین کی سمجھ) عطا فرماتے ہیں، پھر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کلمات اسی انداز سے سنے ہیں یا اسی منبر پر سنے ہیں۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی شخص کو کوئی چیز عطا کرنا چاہیں تو کوئی شخص اس کو روک نہیں سکتا، مثلاً کسی شخص کا رزق اللہ نے کسی مقام پر رکھ دیا ہے تو ساری رکاوٹوں کے باوجود اور مخالفتوں کے ہوتے ہوئے وہ اسے مل کر رہے گا، اور جب کسی شخص کی تقدیر میں کوئی چیز نہیں لکھی ہے تو چاہے ساری دنیا اس کی کوشش کر لے، وہ اسے مل نہیں سکتی۔

ولاینفع ذاالجد منه الجد: الجد بالفتح نصیبہ؛ حصہ۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں: اگر دنیا میں کسی شخص کے حصہ میں تمام دولتیں، عظمتیں، آل اولاد آجائیں، پھر بھی یہ تمام چیزیں ان پریشانیوں یا عذاب سے نجات نہیں دلا سکتی ہیں جو اس کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔

اور بکسر الجیم معنیٰ ہوں گے بندہ کی تمام تر محنتیں اور کوششیں اسے کامیابی نہیں دلا سکتیں، تا آنکہ توفیق الٰہی اور تقدیر الٰہی اس سے ہم آہنگ نہ ہوں۔

من یرد الله به خیراً یفقه في الدین: مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ جمیع فضل اور نعم بندے کو عطا کرنا چاہتے ہیں تو دین کی فہم عطا فرماتے ہیں؛ البتہ اس خیر و بھلائی کے درجات فہم و فراست کے اعتبار سے مختلف ہیں، گویا وہ انسان جو دین کی فہم اور اس مسائل کی واقفیت سے دُور ہے وہ بہت بڑی بھلائی سے محروم کر دیا گیا ہے۔

سمعت هؤلاء الکلمات: یعنی میں نے یہ کلمات آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرز اور انداز میں سنے ہیں، یا پھر مطلب ہے کہ اسی منبر پر سنے ہیں؛ کیونکہ حضرت معاویہ

رضی اللہ عنہ کا یہ خطبہ سفرِ حج کے دوران کا ہے۔

مَالِكٌ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّهُ كَانَ يُقَالُ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ كَمَا يَنْبَغِي الَّذِيْ لَا يُعَجِّلُ شَيْءٌ أَنَاهُ وَقَدَرَهُ حَسْبِيَ اللّٰهُ وَكَفٰى سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ دَعٰى لَيْسَ وَرَاءَ اللّٰهِ مَرْمٰى.

ترجمہ: امام مالکؒ کو یہ بات پہنچی ہے کہ اسلاف یوں کہا کرتے تھے سب خوبیاں خدا کے لیے ہیں جس نے ہر چیز کو مناسب و معتدل انداز میں پیدا کیا، کوئی چیز اپنے وقتِ مقرر سے پہلے نہیں ہوسکتی، میرے لیے اللہ کافی ہے اور کفایت کرنے والا ہے، اللہ نے سن لیا جس نے دعا کی اور اللہ کے علاوہ کوئی مقصد اور منتہیٰ نہیں ہے (جہاں رجوع کیا جائے)۔

تشریح: یہ علمائے شرع سے منقول ہے، ان سے حسنِ اعتقاد کی وجہ سے امام مالکؒ نے اپنی کتاب میں اسے داخل کیا۔

مَالِكٌ ﷺ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّهُ كَانَ يُقَالُ إِنَّ أَحَدًا لَنْ يَمُوْتَ حَتّٰى يَسْتَكْمِلَ رِزْقَهٗ فَاجْمِلُوْا فِي الطَّلَبِ.

ترجمہ: حضرت امام مالکؒ کو یہ بات پہنچی ہے کہ کہا جاتا ہے کہ کوئی جاندار ہرگز نہیں مرتا، یہاں تک کہ وہ اپنا رزق پورا کرلے، لہٰذا رزق کی تلاش اچھے طریقہ سے کرو۔

تشریح: قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾ یعنی جب بچہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے اسی وقت اس کا رزق لکھ دیا جاتا ہے، جو اپنے وقت سے نہ مقدم ہوسکتا ہے اور نہ مؤخر، اور نہ کم ہوسکتا ہے اور نہ زیادہ، اور جب تک اللہ کی طرف سے لکھے ہوئے رزق کو انسان پورا حاصل نہ کرلے اس دنیا سے نہیں جائے گا جب یہی بات ہے تو انسان کو رزق اور معاش کو کمانے کے لیے وہ طریقہ اپنانا چاہیے جو جائز اور حلال ہو، نیز حرص و لالچ، بددیانتی اور چوری وغیرہ سے دُور رہنا چاہیے؛ کیونکہ یہ چیزیں رزقِ مقدر کو بڑھا نہیں سکتیں۔

مَا جَاءَ فِيْ حُسْنِ الْخُلُقِ

حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ امام راغبؒ نے حسن کی تعریف کی ہے کہ: ہر مرغوب فیہ شیٔ کو حسن کہتے ہیں، اس کی طرف رغبت خواہ عقلاً ہو یا حساً اور عرفِ عام میں حسن ہر وہ چیز ہے جو انسان کی آنکھوں کو بھلی معلوم ہو۔

اور ''خُلق''، بضم الخاء واللام وسکون اللام، نام ہے دین، طبیعت، ملکہ وغیرہ کا۔ علامہ زرقانیؒ نے فرمایا: خلق کی حقیقت انسان کی باطنی صورت ہے جسے نفس کہتے ہیں، اور اس سے متصف ہونے والے اوصاف اس کی صورتِ ظاہری ہیں۔

علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں: انسان کے اخلاق واوصاف جن کے ذریعہ وہ دوسروں کے ساتھ پیش آتا ہے محمود اور مذموم دونوں طرح کے ہوتے ہیں۔

اخلاقِ محمودہ یہ ہیں کہ: فطرتِ انسان جن چیزوں کو اپنے لیے پسند کرتی ہے، غیروں کے ساتھ بھی ایسا ہی برتاؤ کرے، مصلاً عفو ودرگزر، جود وسخا، صبر وتحمل، رحمت وشفقت، الفت ومحبت اور نرم گفتار وغیرہ اور اخلاقِ مذمومہ ان کی ضد ہیں۔

ابنِ بطالؒ نے یہاں ایک اختلاف بیان کیا ہے کہ حسنِ اخلاق فطری شیٔ ہے یا کسبی یعنی انسان کی تخلیق کے وقت ہی ان کو ودیعت کردیا گیا ہے یا مجاہدہ وغیرہ کے ذریعہ ان کا حصول ممکن ہے؟ کیا انسان محنت وکوشش کے ذریعہ اخلاقِ حسنہ سے اپنے باطن کو مزین و آراستہ کرسکتا ہے؟

تو بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حسنِ اخلاق فطری شیٔ ہے جو تخلیقِ انسانی کے وقت ہی اس کی جبلت میں ودیعت کردی گئی ہے، ان کی دلیل عبداللہ ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ: ''إن الله قسم أخلاقكم كما قسم أرزاقكم'' یعنی ربِّ کریم نے انسان کے اخلاق کو اسی طرح تقسیم کردیا ہے جیسے کہ اس کے رزق کو متعین کردیا ہے۔

اور ایک دوسری حدیث ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی حضرت اشج رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا: ”إن فيك خصلتين يحبهما الله الحلم والأناة“ انہوں نے دریافت کیا یا یہ صفاتِ قدیم ہیں یا جدید؟ (یعنی میری پیدائش کے وقت سے ہیں یا بعد میں پیدا ہوئی ہیں) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قدیم ہیں۔

ملا علی قاریؒ نے شرح ”الشمائل“ میں بھی اسی اختلاف کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: اکثر لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اخلاقِ حسنہ کسب اور فطرت کے درمیان ہیں؛ کیونکہ حدیثِ اشجؓ میں ان کا یہ سوال کرنا کہ یہ فطری اور قدیم ہیں یا جدید؟ یہ سوال کسبی ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب فطری ہونے پر ہے، لہٰذا ملا علی قاریؒ نے فرمایا: اخلاق اصل کے اعتبار سے جبلی اور فطری ہیں؛ لیکن کمیّۃً اور کیفیۃً زیادتی ونقصان کا احتمال رکھتے ہیں اور علمی وعملی مشق وریاضت کے ساتھ ان میں اضافہ کیا جاسکتا ہے جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ”إنما بعثت لأتمم مكارم الأخلاق“ اس پر دلالت کرتا ہے؛ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: میری بعثت کا مقصد اخلاق کی تکمیل ہے اور تکمیل اس چیز کی ہوتی ہے جس میں نقص اور کمی کا احتمال ہو۔

اخلاق سب فطری وجبلی ہیں اور درجۂ فطرت میں نہ کوئی خلق مذموم ہے نہ محمود؛ بلکہ مواقع استعمال سے ان میں مدح وذم آجاتی ہے، من اعطیٰ للّٰہ ومنع للّٰہ فقد استکمل الایمان. اس میں اعطاء ومنع دونوں کے ساتھ للّٰہ کی قید ہے جس سے معلوم ہوا سخاوت مطلقاً محمود نہ بخل مطلقاً مذموم؛ بلکہ اگر خدا کے لیے ہوں تو دونوں محمود؛ ورنہ دونوں مذموم۔

اخلاقِ حسنہ کی اہمیت:

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیم میں ایمان کے بعد جن چیزوں پر بہت زور دیا ہے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ آدمی اخلاقِ حسنہ اختیار کرے اور اصلاحِ اخلاق کا کام

بعثتِ نبویؐ کے اہم مقاصد میں سے ہے اور ہونا بھی چاہیے تھا؛ کیونکہ انسان کی زندگی اور اس کے نتائج میں اخلاق کی بڑی اہمیت ہے، اگر انسان کے اخلاق اچھے ہوں تو اس کو اپنی زندگی بھی قلبی سکون اور خوشگواری کے ساتھ گزرے گی اور دوسروں کے لیے بھی اس کا وجود رحمت اور چین کا سامان ہوگا، اس طرح ایک پُرامن اور پُرسکون سماجی زندگی وجود میں آئے گی اور اس کے برعکس اگر آدمی کے اخلاق بُرے ہوں تو خود بھی وہ زندگی کے لطف و مسرت سے محروم رہے گا اور جن سے اس کا واسطہ اور تعلق ہوگا ان کی زندگیاں بھی بے مزہ اور تلخ ہوں گی۔ یہ تو خوش اخلاقی اور بداخلاقی کے دنیوی نتائج ہیں جن کا ہم آپ روزمرہ مشاہدہ اور تجربہ کرتے رہتے ہیں؛ لیکن مرنے کے بعد والی زندگی میں ان دونوں کے نتیجے ان سے بدرجہا اہم نکلنے والے ہیں، آخرت میں خوش اخلاقی کا نتیجہ ارحم الراحمین کی رضا اور رحمت ہے اور بداخلاقی کا انجام خداوندِ قہار کا غضب اور دوزخ کی آگ ہے۔ (معارف الحدیث)

عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ أَنَّهُ قَالَ اٰخِرُ مَا أَوْصَانِيْ بِهِ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِيْنَ وَضَعْتُ رِجْلِيْ فِي الْغَرْزِ أَنْ قَالَ لِيْ أَحْسِنْ خُلُقَكَ لِلنَّاسِ يَا مُعَاذُ بْنُ جَبَلٍؓ.

ترجمہ: حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں آخری نصیحت جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے کی جس وقت میں پالان میں اپنا قدم رکھ رہا تھا، یہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: اے معاذ! لوگوں کے ساتھ حسنِ اخلاق سے پیش آنا۔

تشریح: ۹ھ میں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو جب یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بہت سی نصیحتیں کی تھیں جن میں سب سے آخری نصیحت یہ تھی کہ جب تم یمن پہنچو اور وہاں لوگوں سے تمہارا واسطہ ہو تو ان سے نرمی، محبت، خندہ پیشانی سے پیش آنا؛ تاکہ لوگ اسلام سے مانوس ہوں ان کے ساتھ سختی و درشتی کا معاملہ مت کرنا کہ لوگ متنفر ہو جائیں۔

یہاں اعتراض یہ ہے کہ حدیث میں ''ناس'' کو بطورِ عموم ذکر کیا گیا ہے جس میں مؤمنین غیر مؤمنین سب شامل ہیں؛ حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن میں ﴿وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ﴾ کا حکم ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں حکم مختلف حالتوں کے ہیں یعنی دعوت وتبلیغ اور اشاعتِ دین کی غرض سے لوگوں سے ملاقات ہو تو حکمت وموعظتِ حسنہ کا دامن مضبوطی سے پکڑے رہنا چاہیے؛ البتہ اگر حالت جہاد ہو یا احکام اللہ کی پامالی ہو رہی ہو تو نرمی وغفلت کو قطعاً برداشت نہ کیا جائے۔

لغت: غرز: بفتح الغين وسكون الراء الركاب يالان.

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا زَوْجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهَا قَالَتْ مَا خُيِّرَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ أَمْرَيْنِ قَطُّ إِلَّا أَخَذَ أَيْسَرَهُمَا مَالَمْ يَكُنْ إِثْمًا فَإِنْ كَانَ إِثْمًا كَانَ أَبْعَدَ النَّاسِ مِنْهُ وَمَا انْتَقَمَ رَسُوْلُ اللهِ لِنَفْسِهٖ إِلَّا أَنْ تُنْتَهَكَ حُرْمَةُ اللهِ فَيَنْتَقِمُ لِلّٰهِ بِهَا.

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں جب بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دو چیزوں کے درمیان اختیار دیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے آسان کو منتخب کیا جب کہ وہ گناہ نہ ہو اور اگر وہ اثم ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں میں اس سے سب سے زیادہ دُور رہتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات کے لیے کبھی بدلہ نہیں لیا؛ مگر جب اللہ کے احکام کی پامالی کی جاتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے لیے بدلہ لیتے تھے۔

ماخير رسول الله صلى الله عليه وسلم: علامہ باجیؒ نے اس عبارت کی تشریح میں متعدد احتمالات بیان کیے ہیں۔

(۱) جب بھی اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو افعالِ تکلیفہ کے سلسلہ میں اختیار دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ ان اعمال کا انتخاب کیا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے

لیے آسان اور سہل ہوں (۲) جب بھی اللہ تعالیٰ نے اس امت کے عاصیوں کے بارے میں سزا مقرر کرنے کا اختیار دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے گناہ گاروں کے لیے آسان سزا کو منتخب فرمایا (۳) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور اسلام کے مخالفین کی طرف سے جب بھی امن وسلامتی اور جنگ کے درمیان اختیار دیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امن وسلامتی کو اپنایا (البتہ اس کا تعلق حکمِ جہاد کے نزول سے پہلے سے ہے)۔

حافظ ابنِ حجرؒ نے فرمایا کہ یہ بھی احتمال ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو امت کے لیے عبادت کے اندر مجاہدہ اور مشقت اور میانہ روی کے بارے میں اختیار دیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے درمیانہ روی کو اپنایا۔

مالم یکن اثما: اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمورِ دنیا اور بندوں کے جانب سے پیش کیے گئے اختیارات میں سے سہل کو انتخاب فرمایا: کیونکہ اللہ کی جانب سے پیش کیے جانے والے اُمور میں گناہ کا احتمال نہیں ہوسکتا، یا پھر یہ تاویل کیجائے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ان اعمال کو رکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے لیے وہ چیزیں منتخب فرمائی جو ان کے لیے آسان ہوں، نیز گناہ کا سبب بھی نہ بنیں۔

نوٹ: اگر مخیر اللہ تعالیٰ ہیں، تو مستثنیٰ منقطع ہوگا اور اگر اختیار دینے دینے والے بندے اور دنیوی لوگ ہیں تو مستثنیٰ متصل ہے۔

فإن کان إثما کان أبعد النـاس: بندوں کی طرف سے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے متعدد اُمورر کھے جاتے تو آسان کو پسند فرمالیتے تھے؛ لیکن جب وہ سہل اور آسان عمل بذاتِ خود گناہ یا باعثِ گناہ ہوتا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم شدت کے ساتھ اس کی مخالفت کرتے اور ظاہر ہے جس نبی کی بعثت کا مقصد ہی گناہ اور برائیوں کو ختم کرنا ہو وہ بھلا گناہ کو کیسے اختیار کرسکتا ہے۔

وماانتقم رسول الله لنفسه: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ کریمانہ اور ذاتِ

مشفقانہ پر لکھنے کے لیے اقلام کی روشنائیاں اور دنیا جہان کے اوراق ناکافی ہیں، کتنے واقعات بیان کیے جائیں جو رحم دلی اور شفقت ومحبت کا زندہ ثبوت ہیں؟ پس سفر طائف میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی اذیت اور اس کے جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جو کلمات ہیں ان سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حلم اور بردباری کا کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

إلا أن تنتهك حرمة الله: البتہ شریعت کے معاملہ میں انتہائی سخت رویہ رکھتے تھے یعنی اگر اللہ کے کسی حکم کو پامال کیا جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم غضب سے پُر ہو جاتے تھے، اس جرم کی جو سزا ہوتی اس میں ذرا کوتاہی نہیں کرتے اگرچہ مجرم اپنے خاندان کا فرد اور آپ کا قریبی ہی کیوں نہ ہو؛ چنانچہ جب فاطمہ مخزومیہ نے چوری کی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حد جاری کرنے کے لیے ان کا ہاتھ کاٹنا چاہا تو لوگوں نے اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو سفارش کے لیے بھیجا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سفارش کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انتہائی سخت کلمات میں فرمایا: اگر چوری کرنے والی فاطمہ بنتِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوتی، تب بھی میں حد جاری کر کے رہتا۔

أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيْهِ.

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ لایعنی چیزوں کو ترک کردے۔

تشریح: یہ حدیث ایمان کے بنیادی اُصول کی حیثیت رکھتی ہے، حدیثِ پاک میں ایک مؤمن کامل کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ ان چیزوں سے دُور رہتا ہے جو اس کے لیے آخرت میں نفع بخش نہ ہو؛ چنانچہ ایک سچے مؤمن کو اپنے کردار، گفتار، غرض ہر گوشہ سے، لغویات وفضولیات سے دُور رہنا چاہیے۔

ابنِ عربیؒ فرماتے ہیں: جب بندہ صحیح طور پر لوازمات وواجبات کی ادائیگی پر قادر نہیں

ہے تو لغویات میں اپنے کو کیسے لگا سکتا ہے، نیز اس حدیث سے وقت کی اہمیت بھی معلوم ہوتی ہے کہ مؤمن کا شیوہ نہیں ہے کہ وہ اپنا قیمتی وقت لایعنی اور بے کار باتوں میں ضائع کرے؛ بلکہ اپنے مختصر قیمتی لمحات کو دنیا و آخرت کی بھلائی کو جمع کرنے میں صرف کرے۔

مَالِكٌ أَنَّهُ بَلَغَهُ عَنْ عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهَا قَالَتِ اسْتَأْذَنَ رَجُلٌ عَلَى رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَتْ عَائِشَةُ: وَأَنَا مَعَهُ فِي الْبَيْتِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِئْسَ ابْنُ الْعَشِيْرَةِ ثُمَّ أَذِنَ لَهُ قَالَتْ عَائِشَةُ فَلَمْ أَنْشَبْ أَنْ سَمِعْتُ ضِحْكَ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَعَهُ فَلَمَّا خَرَجَ الرَّجُلُ قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللهِ قُلْتَ فِيْهِ مَاقُلْتَ ثُمَّ لَمْ تَنْشَبْ أَنْ ضَحِكْتَ مَعَهُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ مِنْ شَرِّ النَّاسِ مَنِ اتَّقَاهُ النَّاسُ لِشَرِّهِ.

ترجمہ: امّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ایک شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کی اجازت طلب کی، وہ فرماتی ہیں اور میں گھر میں موجود تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قبیلہ کا بُرا آدمی ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اندر آنے کی اجازت دے دی، تھوڑی ہی دیر میں نے سنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ساتھ ہنس رہے ہیں، جب وہ آدمی واپس چلا گیا تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپؐ نے پہلے تو اس کے بارے میں ایسا ویسا کہا تھا، پھر آپ تھوڑی دیر نہیں ٹھہرے کہ اس کے ساتھ مسکرانے لگے، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگوں میں سب سے زیادہ بُرا وہ شخص ہے جس کے شر کی وجہ سے لوگ اس سے بچتے ہوں۔

تشریح: ایک شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کی اجازت طلب کی، اس دوران آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تم اندر چلی جاؤ، جو شخص اجازت طلب کر رہا ہے وہ قوم کا بُرا آدمی ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اجازت

دے دی، کچھ دیر گزری تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ساتھ مسکرانے لگے، جب وہ آدمی چلا گیا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے تشویشاً معلوم کیا کہ یا رسول اللہ! اس کے آنے سے پہلے تو اس کے بارے میں کہہ چکے تھے کہ وہ بُرا آدمی ہے اور اس کے آنے کے بعد آپ اس کے ساتھ تبسم فرمارہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً فرمایا کہ لوگوں میں سب سے زیادہ بُرا وہ شخص ہے جس کے شر اور بُرائی کی وجہ سے لوگ اس سے بچتے اور دور بھاگتے ہوں۔

حدیث میں چند فوائد ہیں:

(۱) حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی بُرا آدمی ہو اس کے شر سے لوگوں کو تکلیف ہوسکتی ہے تو اس کی بُرائی پر لوگوں کو مطلع کرنا غیبت میں شمار نہ ہوگا؛ کیونکہ مصلحت کے وقت غیبت جائز ہے۔

(۲) شر سے بچنے کے لیے ممکن تدبیر کرنا جائز ہے، مثلاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکرا کر اور تبسم کے ساتھ بات چیت کی، ایسے لوگوں سے خندہ پیشانی اور عمدہ اخلاق سے ملنا جائز اور بہتر ہے؛ لیکن ان کی تعریف کرنا صریح کذب اور منافقت شمار ہوگا۔

(۳) إن من شر الناس إلخ: اس کا تعلق کس سے ہے؟ اس بارے میں محدثین نے دو احتمال ظاہر فرمائے ہیں: ایک یہ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسکرانے کی وجہ معلوم کی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگوں میں بُرا شخص وہ ہے جس کے شر کی وجہ سے لوگ اس سے بچیں، لہٰذا اگر میں اس سے سختی اور بداخلاقی سے گفتگو کرتا تو وہ مجھ سے متنفر ہو جاتا اور آپ صل اللہ علیہ وسلم نے معلوم کیا، کیا تم نے مجھے کبھی کسی کے ساتھ بداخلاقی کے ساتھ پیش آتے دیکھا ہے؟ یعنی میرے پاس کوئی آتا ہے میں اس کے ساتھ ہمیشہ اچھا برتاؤ کرتا ہوں۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس کے شر اور بُرائی کی وجہ سے میں اس کے ساتھ بشاشت وانبساط کے ساتھ بات چیت کررہا تھا؛ تاکہ اس کے شر سے حفاظت رہے۔

بعض علماء نے فرمایا اس شخص کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خندہ پیشانی کے ساتھ ملنا

اس کو ایمان کی طرف مائل کرنے کے لیے تھا؛ کیونکہ ان حضرات کے خیال میں وہ کافر تھا۔

علامہ خطابیؒ فرماتے ہیں: یہ حدیث علم، ادب اور اخلاق کو جامع ہے۔

لغات: ابن العشيرة: المراد بالعشيرة القبلية، أو العشيرة أدْنىٰ من الرجل واضافة الابن إليها كإضافة الأخ للعرب في يا أخا للعرب.

عَنْ كَعْبِ الْأَحْبَارِ أَنَّهُ قَالَ إِذَا أَحْبَبْتُمْ أَنْ تَعْلَمُوْا مَا لِلْعَبْدِ عِنْدَ رَبِّهِ فَانْظُرُوْا مَاذَا يَتْبَعُهُ مِنْ حُسْنِ الثَّنَاءِ.

ترجمہ: حضرت کعبِ احبارؒ فرماتے ہیں جب تم یہ جاننا چاہو کہ اللہ تعالیٰ کے پاس بندہ کے لیے کیا ہے؟ تو دیکھو اس کے پیٹھ پیچھے اس کی تعریف کیسی ہے (یعنی لوگ اس کی مدح کرتے ہیں یا مذمت)۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جب یہ دیکھنا ہو کہ فلاں بندہ اللہ کے نزدیک محبوب ہے یا مبغوض، اس کے لیے انعامات ہیں یا عذاب وعقاب، تو اس بات پر غور کرو کہ لوگوں کی زبانوں پر اس شخص کے بارے میں کیا تاثرات ہیں؛ کیونکہ لوگوں کا کسی شخص کی اس کے پیچھے تعریف کرنا اس کے صلاح وتقویٰ کی علامت اور اس کے عمدہ اخلاق کی ضمانت ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کی خوبیوں کو لوگوں کی زبانی بیان کراتے ہیں، اس کے برعکس جن کا انجام اچھا نہیں ہوتا، اس کی بُرائی لوگوں کی زبان پر رکھ دی جاتی ہے۔

واضح رہے اس شخص کو نیک اور متقی نہیں کہا جا سکتا ہے جس کی تعریف لوگ اس کے ڈر اور شر کی وجہ سے کرتے ہوں؛ بلکہ ایسا شخص معاشرہ کا بدترین شخص ہے۔

ملاحظہ: یہ روایت موقوف ہے یا ممکن ہے اسرائیلیات کے قبیل سے ہو؛ کیونکہ کعبِ احبار کتبِ قدیمہ کے عالم تھے۔

عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيْدٍ أَنَّهُ قَالَ بَلَغَنِيْ أَنَّ الْمَرْءَ لَيُدْرِكُ بِحُسْنِ خُلُقِهِ دَرَجَةَ الْقَائِمِ بِاللَّيْلِ الظَّامِئِ بِالْهَوَاجِرِ.

ترجمہ: یحییٰ بن سعیدؒ فرماتے ہیں: مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ آدمی خوش خلقی کے باعث

رات بھر قیام کرنے اور دن بھر بھوکا رہنے والے کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔

تشریح: جس طرح ایک نیک بندہ راتوں کو اٹھ کر تہجد میں لمبے لمبے قیام کرتا ہے اور مشقت اٹھاتا ہے اور دن میں روزہ رکھ کر اپنی تمام خواہشات کو مار دیتا ہے، اسی طرح ایک عمدہ اخلاق والا شخص بھی لوگوں کے تکلیف دینے پر اسے برداشت کرتا رہتا ہے اور اپنی طرف سے بھی زبان اور دیگر اعضاء سے دوسروں کو تکلیف نہیں دیتا؛ اسی لیے اسے مذکورہ شخص کے درجہ میں گردانا گیا ہے یعنی جتنا ثواب قائم اللیل اور صائم النہار کو ملتا ہے اسی طرح ایک اچھے اخلاق والے کو نوازا جائے گا؛ کیونکہ روزہ نماز ذاتی افعال ہیں جو عمل کرنے والے کی ذات تک محدود رہتے ہیں، جبکہ حسنِ اخلاق ایک متعدی عمل ہے جس کے ذریعہ دوسرے مستفیض ہوتے ہیں۔

لغات: الظامي العطشان ظِمئ (س) ظمأً: سخت پیاسا ہونا۔

هو اجر جمعُ هاجرةٍ– شدة الحر خصوصاً في الصوم.

مَالِكٌ عَنْ يَحْيىٰ بْنِ سَعِيْدٍ أَنَّهُ قَالَ سَمِعْتُ سَعِيْدَ بْنَ الْمُسَيَّبِ يَقُوْلُ: أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِخَيْرٍ مِنْ كَثِيْرٍ مِنَ الصَّلٰوةِ وَالصَّدَقَةِ قَالُوْا بَلىٰ قَالَ إِصْلَاحُ ذَاتِ الْبَيْنِ وَإِيَّاكُمْ وَالْبِغْضَةَ فَإِنَّهَا هِيَ الْحَالِقَةُ.

ترجمہ: یحییٰ بن سعید کہتے ہیں میں نے سعید بن مسیب کو فرماتے ہوئے سنا، کیا میں تمہیں اس بھلائی کے بارے میں خبر نہ دوں جو کثرتِ صلاۃ وصدقہ سے بہتر ہے؟ لوگوں نے کہا: جی بالکل، سعید بن مسیّب نے فرمایا: آپس میں دشمنی رکھنے والوں کے درمیان صلح کرانا اور تم لوگ بغض سے دُور رہو؛ اس لیے کہ وہ مونڈنے والا ہے۔

تشریح: ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: بسا اوقات لوگوں کے درمیان ایسا جھگڑا وفساد برپا ہو جاتا ہے جس میں جان ومال سب داؤ پر لگ جاتے ہیں، اس وقت لوگوں کے درمیان جا کر صلح وآشتی کی بات کرنا اس وقت عبادت کرنے سے بہتر ہے؛ کیونکہ نماز وغیرہ فرض ہو تو اس کی بعد میں قضا ہو سکتی ہے، جب کہ اس وقت جھگڑا وفساد سے ہونے والے نقصان کی

تلافی ممکن نہیں ہے، اور اگر نماز اور صدقہ سے نفلی مراد ہو تو ان کو چھوڑ کر لوگوں کے درمیان امن وامان اور صلح قائم کرا دینا جزوی اعتبار سے بہتر ہے؛ کیونکہ ذاتی عبادت کا ثواب اپنے تک محدود رہتا ہے، جبکہ لوگوں کے حال کی اصلاح کر دینا اس کا فائدہ متعدی ہے۔

نیز یہ کہ ان عبادات کا تعلق حقوق اللہ سے ہے اور آپسی فساد کی وجہ سے جو ہلاکت ہوگی اس کا تعلق حقوق العباد سے ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض اعتبار سے..... پروردگار کے نزدیک حقوق اللہ سے زیادہ حقوق العباد کی اہمیت ہے، لہٰذا یہ کہنا بہتر ہوگا کہ جنس عمل کو ان عبادات پر جزوی فضیلت بہر حال حاصل ہے۔

اصلاح ذات البین: لفظ ذات البین اضداد میں سے ہے؛ چنانچہ ذات البین ان عمدہ خصلتوں کو بھی کہا جاتا ہے، جو آپس میں پائی جاتی ہیں، مثلاً محبت ومودت، صلہ رحمی وغیرہ اس وقت مطلب یہ ہوگا کہ لوگوں کے درمیان جو اچھی عادتیں اور خصلتیں پائی جاتی ہیں، ان کو اور بہتر کرنا اور ان میں اضافہ کرنا۔

اور دوسرے معنیٰ ہیں وہ احوال جن میں باہمی طور پر لوگ مبتلا ہوتے ہیں جیسے بغض وعداوت جنگ وجدل وغیرہ اب مطلب یہ ہوگا اگر کچھ لوگ آپس میں بُرے حالات کا شکار ہوں، مثلاً ایک دوسرے میں جھگڑا فساد یا بغض وعناد ہو تو ان کے جھگڑے وفساد کو صلح وآشتی کی طرف لانے اور بغض وعناد کو الفت ومحبت میں بدلنے کی کوشش کی جائے۔

وإياكم والبغضة؛ فإنها هي الحالقة: بغض کے معنیٰ دل میں کسی کے لیے عداوت اور دشمنی پالنا اور حالقة کے اصل معنیٰ مونڈنے والی اور یہاں مراد ہے، تباہ کرنے والی اور جڑ سے اکھاڑ دینے والی، مطلب یہ ہے بغض وکینہ، جھگڑا وفساد، عداوت ودشمنی ایسی بُری خصلتیں ہیں جن سے دین اس طرح برباد اور ختم ہو جاتا ہے جیسے استرے سے سر کے بال بالکل صاف ہو جاتے ہیں۔ (مرقاۃ المفاتیح:۹)

مَالِكٌ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ حُسْنَ الْأَخْلَاقِ.

ترجمہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میری بعثت حسنِ اخلاق کی تکمیل کے لیے ہوئی ہے۔

تشریح: اس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیغمبر بنائے جانے اور لوگوں کی طرف بھیجے جانے کے مقصد اور ہدف کو واضح فرمایا ہے یعنی وہ تعلیمات جو مجھے دی گئی ہیں، ان کا مقصد یہ ہے کہ لوگ ان پر عمل کر کے اپنے اخلاق کو بہتر سے بہتر بنا سکیں۔

اشکال: اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کی بعثت کا مقصد صرف حسنِ اخلاق کی تعلیم پر منحصر ہے؟

جواب: حسنِ اخلاق کے دو معنیٰ ہو سکتے ہیں: (۱) اگر حسنِ اخلاق سے مراد عوام میں مشہور معنیٰ لوگوں سے اچھی طرح پیش آنا ہو تو یہ طرزِ کلام، حسنِ اخلاق کی تاکید کے لیے ہوگا (۲) اور اگر یہی مراد لیا جائے کہ بعثت کا مقصد صرف حسنِ اخلاق کی تکمیل ہے، تو پھر اخلاق عام معنیٰ میں ہوگا یعنی ایک انسان کے معاملات اپنے رب، لوگوں اور تمام مخلوقات کے ساتھ بہتر ہو جائیں۔

مَا جَاءَ فِي الْحَيَاءِ

الحياء في اللغة: تغيير وانكسار يعتري الإنسان من خوف مايعاب به، وقد يطلق على مجرد الترك.

وفي الشرع: خلق يبعث على اجتناب القبيح ويمنع من التقصير في حق ذي الحق.

لغوی اعتبار سے حیا ایسا انفعال ہے جو کسی ایسے خیال و فعل کے نتیجہ میں پیدا ہو جو انسان کو فعل مذموم سے باز رکھتا ہے۔

اور شرعاً حیا ایسی صفت ہے جو فعل قبیح سے رکنے پر اُبھارے اور صاحبِ حق کے حق میں کوتاہی کرنے سے روک دے۔

حیا ایک عمدہ صفت ہے جو بندہ کو محسن کی شکر گزاری اور اس کی اطاعت پر اُبھارتی ہے اور بُرے کاموں سے دُور رکھتی ہے جس بندہ کے اندر جتنی زیادہ حیا ہوتی وہ اتنا ہی اللہ سے ڈرتا ہے اور اس کے حکموں کی پامالی سے بچتا ہے؛ اس لیے حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے: حیا پوری کی پوری خیر ہے اور دوسری جگہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: حیا صرف بھلائی لے کر آتی ہے، نیز حیا کو ایمان کا ایک شعبہ قرار دیا ہے یعنی اس کے بغیر ایمان کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔

اشکال: حیا ایک فطری اور غیر اختیاری صفت ہے جو مسلم اور غیر مسلم سب میں پائی جاتی ہے، اور ایمان ایک اختیاری چیز ہے، پھر اس کے شعبہ ایمان سے ہونے کے کیا معنیٰ ہوئے؟

جواب: حیاء کی دو قسمیں ہیں:

(۱) حیاءِ طبعی اور فطری: جو ہر انسان کے اندر پائی جاتی ہے، حتیٰ کہ غیر مسلم بھی بعض افعالِ مذمومہ کو لوگوں سے ڈر سے چھوڑ دیتا ہے یہ حیاءِ طبعی ہے۔

(۲) حیاءِ کسبی اور ایمانی: اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ انسان بُرے کاموں سے بچنے اور اچھے کاموں کو انجام دینے میں اس بات کو سامنے رکھے کہ یہ میرے ایمان کا تقاضہ اور اسلام کا حکم ہے اور یہی حیا شریعت میں مقصود اور محمود ہے۔

اشکال: کبھی کبھی انسان بوجہ حیا گناہ میں مبتلا ہوجاتا ہے، مثلاً غسلِ جنابت کی نوبت آئی اور لوگوں سے شرم کی وجہ سے غسل نہیں کیا اور نماز قضا ہوگئی؛ حالانکہ حدیث میں کہا گیا ہے: ''الحیاء خیرہ کلہ''.

جواب: درحقیقت یہ حیا نہیں؛ بلکہ بزدلی اور بے ہمتی ہے، کمزوریٔ طبع کی بنا پر نماز قضاء کردی، اور اگر اسے حیا کہا بھی جائے تو زیادہ سے زیادہ اسے عرفاً حیا کہہ سکتے ہیں۔

حیاءِ شرعی کا معیار:

شیخ محی الدین ابنِ عربیؒ نے فرمایا: حیاء وہی محمود اور مقصود ہے جو حد میں رہ کر ہو جو حیا

شرعی حد بندی سے باہر ہو اسے حیا کہنا صحیح نہیں ہے، مثلاً اپنی بیوی کے چہرہ پر پردہ ڈالنے کی تاکید کرنا یہ تقاضۂ حیا شرعی ہے؛ لیکن احرام کی حالت میں بھی منہ چھپائے رہنے کی تاکید کرنا حیاء سے خارج ہے؛ کیونکہ اگر اس میں حیاء ہوتی تو اس کو شریعت منہ کھولنے کی اجازت ہرگز نہ دیتی۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِكُلِّ دِيْنٍ خُلُقٌ وَخُلُقُ الْإِسْلَامِ الْحَيَاءُ.

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہر مذہب کا ایک مزاج ہوتا ہے اور اسلام کا مزاج حیا ہے۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ ہر مذہب کی ایک نمایاں صفت ہوتی ہے جو اس کی خصوصیت اور اس کے ماننے والوں کا خاصہ ہوتا ہے، اسی طرح دینِ اسلام کا مزاج، اس کی خصوصیت، اس کا قوام اور نظام حیاء ہے؛ چونکہ دینِ اسلام تمام مذاہب سے اشرف ہے؛ اس لیے اخلاق کی سب سے عمدہ قسم حیا اس کا خاصہ قرار پائی۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام اہلِ مذاہب کے نزدیک حیاء کے علاوہ دوسرے اوصاف غالب رہتے ہیں اور مذہبِ اسلام کو ماننے والوں میں دوسرے عمدہ اوصاف کے ساتھ حیاء کا عنصر غالب رہتا ہے۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ عَلٰى رَجُلٍ وَهُوَ يَعِظُ أَخَاهُ فِي الْحَيَاءِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَعْهُ فَإِنَّ الْحَيَاءَ مِنَ الْإِيْمَانِ.

ترجمہ: عبداللہ ابنِ عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے شخص کے پاس سے گزرے جو اپنے بھائی کو حیاء کے سلسلہ میں نصیحت کر رہا تھا، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے کہا اسے چھوڑ دے؛ اس لیے کہ حیاء ایمان کا شعبہ اور جزو ہے۔

تشریح: نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک راستہ سے گزرے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ اپنے بھائی کو حیاء کے سلسلہ میں لعن طعن کر رہا تھا اور اسے حیاء کم کرنے کے بارے میں نصیحت کر رہا تھا، غالباً اس کا بھائی کثیر الحیاء تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص سے فرمایا: اگر تمہارا بھائی حیا والا ہے تو اس میں کوئی بُرائی نہیں، اسے حیاء کے خلاف نصیحت کرنا بند کرو، یہ ایک عمدہ اور محمود صفت ہے؛ بلکہ ایمان کا جز اور اس کا شعبہ ہے یعنی جس طرح ایمان بندہ کو معاصی سے روکتا ہے اسی طرح حیاء بھی روکتی ہے، گویا حیاء کو از قبیل ایمان کہنا اسم الشیئ باسم ماقام مقامه کے قبیل سے ہے۔

مَاجَاءَ فِي الْغَضَبِ

(غصہ کا بیان)

کسی سے بدلہ لینے کے لیے قلب کے اندر جب خون جوش مارتا ہے اس کو حالتِ غضب سے تعبیر کیا جاتا ہے، بسا اوقات اس کی وجہ سے انسان حد اعتدال سے نکل جاتا ہے، فحش کلامی اور مذموم حرکتوں کا ارتکاب کرتا ہے، اور بغض و کینہ اور دیگر بُرائیاں اسی غصہ پر مرتب ہوتی ہیں، اور یہ غضب شیطان کے اُکسانے کا اثر ہوتا ہے، تاہم اگر غصہ اپنے محل میں ہو تو یہ صفتِ مذمومہ نہیں ہے؛ کیونکہ ہتک اوامر کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی غصہ آتا تھا؛ اس لیے اس بات کا خیال رہے کہ غصہ میں اتنی شدت نہ ہو کہ حد سے متجاوز ہو جائے جس کی وجہ سے برائیاں جنم لینے لگیں اور معاشرہ کی خرابی کا باعث بن جائے۔

قرآن و حدیث میں زیادہ غصہ کرنے والے کی مذمت اور کاظم و غضب کو بہادر اور مستحق اجر و ثواب قرار دیا گیا ہے۔

عَنْ حُمَيْدِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ أَنَّ رَجُلًا أَتَىٰ إِلىٰ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللهِ عَلِّمْنِيْ كَلِمَاتٍ أَعِيْشُ بِهِنَّ وَلَا تُكْثِرْ عَلَيَّ فَأَنْسىٰ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَغْضَبْ.

ترجمہ: ایک شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: اے اللہ

کے نبیؐ! مجھے کچھ ایسے کلمات سکھا دیجیے جن پر عمل کر کے میں (نیکی وبھلائی والی) زندگی گزارتا رہوں اورزیادہ مت سکھلایئے (شاید مجھے یاد نہ ہوسکے) توآپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ غصہ مت کرو۔

تشریح: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مخاطب کی طبیعت کے موافق نصیحت فرماتے تھے؛ تاکہ بروقت اس پر تنبیہ ہوجائے؛ اس لیے ممکن ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سائل کے متعلق اس بات کا احساس ہوا ہو کہ یہ غصہ والا شخص ہے؛ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''لاتغضب'' فرمایا، یا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سائل کی درخواست کا خیال کرتے ہوئے ایک ایسا جامع جملہ بطورِ نصیحت ارشاد فرمایا جو تمام برائیوں کے خاتمہ کا سبب ہے؛ کیونکہ غصہ ہی کے سبب انسان جھگڑا وفساد، ہٹ دھرمی، تشدد وتعصب پر آمادہ ہوجاتا ہے، جو انسان کو معاشرتی اور اخلاقی اعتبار سے پستی میں دھکیل دیتی ہیں، نیز مبتلا بہ کی طبیعت میں ہمیشہ انقباض رہتا ہے، أعاذنا الله منه.

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَيْسَ الشَّدِيْدُ بِالصُّرَعَةِ إِنَّمَا الشَّدِيْدُ الَّذِيْ يَمْلِكُ نَفْسَهُ عِنْدَ الْغَضَبِ.

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: طاقتور اور پہلوان وہ شخص نہیں ہے جو لوگوں کو پچھاڑ دے؛ بلکہ طاقتور وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے۔

تشریح: اس ارشادِ گرامی کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ اصل میں اگر کوئی چیز انسان کی سب سے بڑی دشمن اور اس کے مقابلہ میں سب سے زیادہ طاقتور ہے تو وہ خود اس کا نفس ہے، پس اگر کوئی شخص اپنے بڑے سے بڑے اور طاقتور دشمن کو پچھاڑ دے تو یہ بہادری کی بات نہیں؛ بلکہ غیض وغضب کی حالت میں سب سے بڑے دشمن (نفس) پر قابو رکھنا، یہ کمال کی بات ہے۔

بایں وجہ غصہ پینے والے شخص کو نیکوکاروں اور مستحقین جنت میں شمار کیا گیا ہے؛

کیونکہ غصہ کے وقت میں دشمن پر قادر ہونے کے باوجود اپنے نفس پر کنٹرول کر لینا اور عفو ودرگزر کا پہلو اختیار کرنا یہ ایک مخلص مؤمن کی ہی علامت ہے۔

لغت: صرعة... من يغلب كثيرا في المصارعة، صرع (ف) صرعًا: غالب آجانا، پچھاڑ دینا۔

مَاجَاءَ فِي الْمُهَاجَرَةِ

هاجر مهاجَرَة: ترکِ تعلق کر لینا، رشتہ ختم کر لینا اور یہاں مراد ہے ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان سے تین دن سے زیادہ سلام وکلام اور ملنا جلنا چھوڑے رکھنا اور صحبت وہم نشینی کے تعلق کو منقطع کر دینا۔

عَنْ أَبِي أَيُّوبَ الْأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللهُ تَعَالىٰ عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ يَهْجُرَ أَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثِ لَيَالٍ يَلْتَقِيَانِ فَيُعْرِضُ هٰذَا وَيُعْرِضُ هٰذَا وَخَيْرُهُمَا الَّذِي يَبْدَأُ بِالسَّلَامِ.

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کسی بھی مسلمان کے لیے حلال نہیں ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی سے تین راتوں سے زیادہ ملنا جلنا چھوڑ رکھے جب کہیں وہ ملتے ہیں تو یہ اس سے منہ پھیر لیتا ہے اور وہ اس سے اعراض کرتا ہے اور ان میں سے بہتر وہ ہے جو سلام میں پہل کرے۔

تشریح: شریعتِ مطہرہ نے آپسی میل جول اور اتحاد واتفاق کو بڑی اہمیت دی ہے، شفقت ومحبت، ہمدردی اور بھائی چارگی کو قائم رکھنے کی تاکید فرمائی ہے، نیز اس بات کو پُرزور انداز میں بیان کیا ہے کہ کسی مسلمان کو دوسرے مسلمان سے ہرگز تکلیف نہ پہنچے، تاہم انسان چونکہ مدنی الطبع ہے اور ایک جگہ اجتماعی طور پر زندگی گزارنے اور روزمرہ کے معاملات کی وجہ سے آپس میں نزاع وناراضگی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور ایک دوسرے سے شکایت پیدا ہونے کی وجہ سے دُوریاں پیش آجاتی ہیں؛ اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب اس طرح کی صورتِ حال پیش آجائے تو اسے طول مت دو؛

بلکہ تین دن گزرنے سے پہلے پہلے اس خفگی اور ناراضگی کو ختم کرکے اپنے تعلقات کو بحال کرلو، اور اگر حالات وتعلقات استوار نہ ہوں گے تو دونوں ایک دوسرے سے اعراض کریں گے جوکہ ایذاءرسانی کا سبب ہے اور ایذاءِ مسلم حرام ہے، لٰہذا تین دن سے زائد ملاقات اور سلام وکلام کا ترک بھی حرام ہے اور اسی تعلق کی درستگی کی ترغیب کے لیے فرمایا: جو پہلے سلام وکلام شروع کرے وہ بہترین شخص ہے۔

اب یہاں علماء کے درمیان اختلاف ہوگیا کہ کیا صرف سلام کرنے سے ہجرانِ ممنوع ختم ہوجائے گا یا پھر اسی طرح کے تعلقات بحال ہونے ضروری ہیں جیسے پہلے تھے؟ تو اکثر علماء نے تو اسی موقف کو اختیار کیا ہے کہ صرف سلام کرنے سے ہجرانِ ممنوع سے نکل جائے گا جیسا کہ حدیث میں صرف ابتداء بالسلام کا ذکر ہے؛ لیکن امام احمد بن حنبلؒ اور قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں: ہجران ممنوع کی حد کو ختم کرنے کے لیے سابقہ معاملات اور تعلقات کا بحال ہونا ضروری ہے، صرف سلام کافی نہیں ہے۔ مفتی تقی عثمانی صاحب نے لکھا ہے کہ ہجران ممنوع یہ ہے کہ سلام وکلام دونوں ترک کردے، پس اگر سلام کرے؛ مگر ضرورت کے باوجود کلام سے احتراز کرے یا دوسرا مخاطب کرے اور جواب نہ دے تو ہجرانِ ممنوع کی حد سے خارج نہ ہوگا؛ کیونکہ ترکِ کلام کا اہتمام بھی باعثِ تکلیف ہے اور حدیث کا مقصد ہی ایذاء سے بچانا ہے۔

اور رہا حدیث میں صرف ابتداء بالسلام کا ذکر تو اس کا مقصد سلام پر اقتصار نہیں؛ بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب بھی مسلمان بات کرتا ہے تو سلام کرتا ہے، اب مطلب یہ ہوا کہ جو شخص بھی تعلقات کی درستگی کے لیے سلام میں پہل کرے وہ بہترین شخص ہے۔

البتہ دوست واحباب کی طرح خوش وخرم ہونا ضروری نہیں؛ کیونکہ یہ ایک غیر اختیاری امر ہے، بس ضرورت کلام کے وقت انقباض سے ہی سہی اگر بات کرے تو ہجرانِ ممنوع نہ ہوگا۔ (تکملہ: ۱۰ر)

قوله: أن يهجر أخاه فوق ثلاث ليال: حدیث میں اگرچہ لیل کا تذکرہ ہے؛

لیکن اس سے رات ودن دونوں مراد ہیں جیسا کہ ترمذی کی حدیث میں صرف ''ثلاث'' بغیر لیل ونہار کے مذکور ہے۔

حرمتِ ہجران کو تین دن سے زائد کے ساتھ اس لیے مقید کیا ہے چونکہ غیظ وغضب، غیرت وحمیت، تند وبے صبری انسانی خمیر میں پیوست ہے، پس اگر کسی وجہ سے اظہارِ خفگی کی خاطر تین دن تک ملنا جلنا چھوڑے رکھے تو یہ حرام نہیں ہوگا، اتنی مدت کو اس لیے صرف نظر کیا گیا ہے؛ تاکہ انسان کے جذبات کی بھی تسکین ہوجائے۔

واضح رہے تین دن سے زائد ہجران اور ترکِ کلام اس وقت ممنوع ہوگا جب اس کا باعث نفسانی خواہشات اور دنیاوی اغراض ہوں، ہاں! اگر ترکِ تعلق کسی دینی امر اور حمیتِ اسلامی کے سبب ہو تو وہ جائز ہے جیسا کہ عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ نے اپنے بھتیجے کو خذف (انگلیوں سے کنکر پھینکنے) سے منع کرنے کے باوجود وہ باز نہیں آیا تو انہوں نے اس سے قطع تعلق کرلیا تھا اور فرمایا: ''لا أكلملك أبداً'' پس اہلِ بدعت، فساق وفجار اور ترکِ سنت پر اصرار کرنے والے سے قطع تعلق اس وقت تک جائز ہے جب تک وہ توبہ نہ کرلیں، اسی طرح جس شخص کے بارے میں یہ یقین ہو کہ فلاں سے تعلق رکھنے سے معصیت یا لایعنی اُمور میں پڑنے کا اندیشہ ہے تو کنارہ کشی اختیار کی جاسکتی ہے، تاہم اس بات کا خیال رہے کہ ترکِ تعلق عمدہ پیرایہ اور اچھے طریقہ سے ہونا چاہیے، ایسا نہ ہو کہ اس شخص کی بُرائی، غیبت، کینہ اور بغض وغیرہ کو مشغلہ بنالیا جائے، واللہ اعلم۔ (تکملہ تحفۃ الالمعی، مظاہر حق)

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَبَاغَضُوْا وَلَا تَحَاسَدُوْا وَلَا تَدَابَرُوْا وَكُوْنُوْا عِبَادَ اللهِ إِخْوَانًا وَلَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ يَهْجُرَ أَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثِ لَيَالٍ.

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: آپس میں بغض وعداوت مت رکھو، ایک دوسرے سے حسد مت کرو اور ایک دوسرے سے منھ مت پھیرو یا آپس میں پیٹھ پیچھے بُرائی مت کرو اور آپس میں اللہ کے

بندے بھائی بن کر رہو اور کسی مسلمان کے لیے حلال نہیں ہے وہ اپنے مسلمان بھائی سے تین دن سے زیادہ میل جول کو چھوڑے رکھے۔

تشریح: حدیث پاک کے اندر جن باتوں کا ذکر ہے اور جن سے منع کیا گیا ہے ان کا معاشرہ کے اندر انفرادی اور اجتماعی زندگی کے بہتر بنانے سے براہِ راست تعلق ہے، ان ہدایت پر عمل کیا جائے تو معاشرتی خرابی سے نجات حاصل ہوسکتی ہے؛ چنانچہ:

اوّلاً فرمایا: ''لاتباغضوا'' ایک دوسرے کے تئیں دل میں بغض نہ رکھو، بغض ایک کیفیت ہے جو غصہ کی حالت میں کسی سے بدلہ لینے کی قدرت نہ ہونے کی صورت میں دل میں پیدا ہوجاتی ہے، اس کے دو درجہ ہیں: ایک اختیاری یعنی کسی کی بدخواہی دل میں رکھی جائے اور کسی طرح ایذاء پہنچانے اور انتقام کی تدابیر کی جائیں یہ ناجائز ہے، پس ضروری ہے کہ اس طرح کے اسباب سے بچا جائے جس سے یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے، دوسرا غیر اختیاری کہ کوئی رنج کی بات پیش آنے اور انتقام اور ایذا کے خیال کے بغیر اگر کسی سے ملنے کو طبیعت نہیں چاہتی تو یہ بغض نہیں؛ بلکہ انقباض طبعی ہے جو گناہ نہیں؛ لیکن پھر بھی انسان یہ کوشش کرے کہ کسی سے انقباض طبعی بھی نہ رہے۔

ولاتحاسدو: آپس میں حسد نہ کرو، حسد یہ ہے کہ کسی کی اچھی حالت ناگوار گزرے اور پھر یہ آرزو کرے یہ نعمت اس سے زائل ہوجائے، اس کا محرک یا تو تکبر وغرور ہوتا ہے یا عداوت خباثت کہ بلاوجہ خدا تعالیٰ کی نعمت میں بخل چاہتا ہے کہ جس طرح میں محروم ہوں یہ بھی محروم ہوجائے، حسد کے تین درجہ ہیں: ایک کیفیتِ نفسانیہ جس میں انسان معذور ہے، دوسرے اس کے مقتضاء پر عمل اس میں گناہ گار ہوگا اور تیسرے مقتضاء کی مخالفت اس پر ماجور ہوگا۔

تاہم اگر کوئی زوالِ نعمت کی تمنا کے بغیر اپنے لیے اسی طرح کی نعمت کی حرص کرتا ہے، اس طرح کہ یہ بھلائی مجھے بھی نصیب ہوجائے تو قبیح نہیں؛ بلکہ یہ غبطہ اور رشک کہلاتا ہے اور یہ شرعاً جائز ہے؛ بلکہ اگر وہ واجبی اُمور ہوں تو ان کی تمنا واجب اور استحبابی اُمور میں مستحب ہے۔

ولاتدابرو: علماء نے اس کی دو تشریحات پیش کی ہیں، ایک وہ جس کو خود امام مالکؒ

نے اختیار فرمایا کہ ''تدابر'' کے معنیٰ قطع تعلق کے ہیں، بایں طور کے جب دو مسلمان بھائی ملتے ہیں تو ایک دوسرے سے اعراض کر لیتے ہیں، ایک دوسرے کی طرف پیٹھ پھیر لیتے ہیں اور دوسرے معنیٰ یہ ہیں کہ ایک دوسرے کی پیٹھ پیچھے بُرائی مت کرو۔

وکونوا عباد الله: کا مطلب یہ ہے کہ تم سب اللہ کے بندے ہو اور عبودیت میں سب برابر ہو، نیز تم سب اخوۃ کی ایک زنجیر سے منسلک ہو، لہٰذا تمہاری اس حیثیت کا تقاضا یہ ہے کہ ایک دوسرے کے درمیان حسد، بغض اور غیبت جیسی بُرائیوں کو حاصل کر کے اپنے دلوں میں افتراق اور اپنی صفوں میں انتشار پیدا نہ کرو؛ بلکہ اپنے مرتبہ عبودیت پر اتحاد و یکجہتی کے ساتھ قائم رہو اور آپس میں بھائی بھائی بن کر رہو۔ (مظاہر حق: ۵۳۶/۴)

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ تَعَالىٰ عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ فَإِنَّ الظَّنَّ أَكْذَبُ الْحَدِيْثِ وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا تَحَسَّسُوْا وَلَا تَنَافَسُوْا وَلَا تَحَاسَدُوْا وَلَا تَبَاغَضُوْا وَلَا تَدَابَرُوْا وَكُوْنُوْا عِبَادَ اللهِ إِخْوَانًا.

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بدگمانی قائم کرنے سے اجتناب کرو؛ کیونکہ بدگمانی باتوں کا سب سے بڑا جھوٹ ہے (غیر متعلق اُمور، بلاضرورت دوسروں کے احوال) کی ٹوہ میں نہ لگو کسی کی جاسوسی نہ کرو، آپس میں حرص، حسد اور بغض نہ رکھو، ترکِ تعلق نہ کرو اور اللہ کے بندے بھائی بھائی بن کے رہو۔

تشریح: اس حدیث میں مزید چند اختلاف و انتشار کو جنم دینے والی بُرائیوں کی طرف اشارہ ہے۔

إیاکم والظن: یہاں ظن سے مراد سوءِ ظن اور بدگمانی ہے، مطلب یہ ہے کہ کسی مسلمان کے بارے میں بلا دلیل اور بغیر کسی وجہ کے کوئی بُرا اعتقاد نہ رکھا جائے کہ فلاں شخص چور ہے یا شرابی ہے وغیرہ، اور اس سے دشمنی شروع کر دی جائے؛ البتہ اگر کسی کے بارے میں محض اتفاقاً کوئی بُرا خیال آیا اور گزر گیا تو وہ معفو عنہ ہے؛ اس لیے کہ حدیث شریف میں

حدیث النفس کے بارے میں عفو ودرگزر کا حکم ہے، پس حدیث میں وہ بدگمانی مراد ہوگی جو دل میں بیٹھ جائے اور اس پر یقین کرلیا جائے، پس اس طرح کا گمان کرنا حرام ہوگا۔

علامہ زرقانی نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اسرارِ قلوب اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، لہٰذا کسی کو یہ حق نہیں کہ محض وہم وگمان کی وجہ سے کسی کے بارے میں بُرا اعتقاد رکھے۔ (زرقانی: ۴)

نیز اس کا مقصد حد درجہ مسلمان کی عزت کو محفوظ رکھنا ہے۔

بعض علماء نے فرمایا ہے بدگمانی اس وقت گناہ ہوگا جب کہ اس کا ذکر کیا جائے اور اس کو زبان پر لایا جائے، نیز اس بدگمانی کو ثابت کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی معقول وجہ اور دلیل نہ ہو اور اگر اس کے ثبوت کے لیے کوئی معقول وجہ قرینہ موجود ہو تو ایسی بدگمانی پر مواخذہ نہیں ہے اور حقیقتاً یہ بدگمانی بھی نہیں ہے۔ (حاشیہ ترمذی)

حدیث کے اس ٹکڑے کا دوسرا مطلب ملّا علی قاریؒ نے یہ بیان کیا ہے کہ اُمورِ اعتقادیہ اور قطعیہ میں گمان کرنے سے بچو، مثلاً کوئی حکم قطعی طور پر ثابت ہے، اسے قطعی ہی مانو، اس کے بارے میں تذبذب کا شکار مت ہو۔ (مرقات: ۹)

اور خطابیؒ نے فرمایا کہ: حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ان ظنی دلائل کو مت چھوڑو جن پر بہت سارے مسائل کی بنیاد ہے۔

فإن الظن اكذب الحديث: یہاں بدگمانی کو جھوٹ سے تعبیر کیا گیا؛ چنانچہ جب کوئی شخص کسی کے بارے میں بدگمانی کرتا ہے تو وہ یہ فیصلہ کرلیتا ہے کہ فلاں شخص ایسا ایسا ہے اور وہ حقیقت میں ایسا ہوتا نہیں ہے، تو خلافِ واقعہ ہوا اور اسی کا نام جھوٹ ہے اور اسے بدترین جھوٹ اس لیے کہا گیا؛ تاکہ اس کی قباحت دلوں میں بیٹھ جائے۔ (مظاہر حق)

قوله أكذب الحديث میں حدیث سے مراد حدیث النفس یعنی وہ باتیں ہیں جو بلا اختیار قلب میں آتی ہیں اور گزر جاتی ہیں جو معفو عنہ ہیں اور قوله فإن الظن سے مراد وہ ظن ہے جو ذہن میں بیٹھ جائے اور اس پر یقین کرلیا جائے جو ممنوع ہے، پس یہ ظن ممنوع حدیث النفس سے بدتر ہوا۔ (عون الترمذی)

ولا تجسسوا ولا تحسسوا: شرح زرقانی میں ہے کہ علامہ ابن البرؒ نے فرمایا یہ دونوں لفظ ایک ہی معنیٰ رکھتے ہیں: لوگوں کے عیوب اور ان کی بُرائیوں کی تلاش وجستجو میں نہ پڑو اور جو عیوب معلوم ہو گئے ہیں ان کا اظہار نہ کرو، اسی کو علامہ خطابیؒ نے بیان کیا ہے، ابنِ انباریؒ نے فرمایا: دوسرا پہلے کی تاکید ہے اور امام اوزاعیؒ نے یحییٰ بن ابی کثیرؒ سے بیان کیا ہے کہ بالجیم لوگوں کے عیوب تلاش کرنا اور بالحا لوگوں کی باتوں کو سننا۔

اور بعض لوگوں نے یہ فرق بیان کیا ہے کہ ''بالجیم'' لوگوں کے عیوب تلاش کرنا دوسروں کے لیے اور ''بالحا'' اپنے لیے۔

امام نوویؒ ماوردی کی ''احکام السلطانیہ'' سے ذکر کیا ہے کہ اگر کوئی شخص چوری چھپے کوئی گناہ کرتا ہے تو وہ محتسب کے لیے بھی اس کے پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں ہے؛ البتہ اگر اس کا ضرر دوسروں تک متعدی ہو جیسے کسی کو قتل کرنے کی شازش یا کسی عورت سے زنا کرنے کا منصوبہ وغیرہ تو اس صورت میں کوئی ایسا طریقہ اپنایا جا سکتا ہے جس سے اس کے غلط ارادوں کی خبر مل سکے اور لوگوں کو ضرر سے بچایا جا سکے۔

علامہ خطابیؒ نے فرمایا ہے کہ مصلحت کے پیش نظر اربابِ حکومت لوگوں کی پوشیدہ رگرمیوں کو جاننے کی کچھ گنجائش ہے، اسی طرح اس شخص کے لیے جو شادی کرنے یا کسی پڑوس میں رہنے یا کسی کے ساتھ سفر کا ارادہ رکھتا ہے؛ البتہ اتنا ضرور ہے اس کی غرض ہم آہنگی پیدا کرنا ہو نہ کہ دوسرے کی فضیحت کرنا، واللہ اعلم۔ (اوجز:۱۶/۱۲۱، زرقانی، شرح نووی)

ولا تنافسوا: حرص مت کرو۔ علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ حرص سے مراد دنیوی اُمور میں حرص کرنا ہے۔ علامہ ابنِ عبدالبرؒ فرماتے ہیں اس سے مراد دنیوی اُمور میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنا، لوگوں سے تکبر سے پیش آنا، اللہ کی طرف سے دی گئی نعمتوں پر حسد کرنا ہے۔ (ہٰکذا فی الزرقانی) لہٰذا یہ ایک صفتِ مذمومہ ہے جبکہ اگر یہ تنافس خیر کے اُمور اور بھلائی کے کاموں میں ہو تو قابلِ مدح ہے جیسا کہ قرآن میں حکم دیا گیا ہے: ﴿وَفِیْ ذٰلِكَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ﴾

عَنْ عَطَاءِ بْنِ عَبْدِ اللهِ الْخُرَاسَانِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَصَافَحُوْا يَذْهِبُ الْغِلُّ وَتَهَادَوْ تَحَابُّوْا وَتَذْهِبُ الشَّحْنَاءُ.

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ایک دوسرے سے مصافحہ کرو (آپس کا) کینہ ختم ہوجائے گا، اور ہدیہ لینے دینے کا رواج ڈالو، آپس میں محبت پیدا ہوگی اور عداوت جاتی رہے گی۔

تشریح: سابقہ حدیثوں میں ان صفاتِ مذمومہ کا بیان تھا جو آپسی اختلاف، عداوت ودشمنی اور جھگڑے وفساد کا محرک بن جاتی ہیں، اب مذکورہ حدیث میں ان صفات کا ذکر ہے جن کے اختیار کرنے سے آپس میں اتحاد واتفاق، عقیدت ومحبت پیدا ہوجاتی ہے۔

تصافحوا صافحه مصافحة کے معنیٰ ہیں: اپنے ہاتھ کے رُخ کو دوسرے کے ہاتھ کے رُخ کے ساتھ ملانا۔

سلام کرنے کے بعد مصافحہ کرنا زیادتی محبت کا سبب ہے اور اس کے ذریعہ آپس کا بغض وکینہ ختم ہوجاتا ہے، گویا جب ایک مؤمن دوسرے مؤمن کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے تو وہ دونوں معاہدہ کرتے ہیں کہ ہم آپس میں دوست ہیں، یہ تو معاشرتی فائدہ ہے، نیز مصافحہ اُخروی اجر وثواب کا بھی ذریعہ ہے، ترمذی شریف کی حدیث میں ہے جب دو مسلمان ملتے ہیں اور مصافحہ کرتے ہیں تو ان کے ایک دوسرے سے جدا ہونے سے پہلے ان کی مغفرت کردی جاتی ہے۔

ملاحظہ: آج کل ملاقات کے وقت غفلت برتی جاتی ہے کہ لوگ سلام کرتے ہوئے مصافحہ کرتے ہیں، جبکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ اوّلاً سلام کیا جائے، پھر مصافحہ کرتے ہوئے دعا پڑھی جائے۔

تهادوا تحابوا: آپس میں ہدیہ لیا دیا کرو محبت پیدا ہوگی اور آپسی عداوت کا خاتمہ ہوجائے گا؛ کیونکہ جب ایک شخص دوسرے کو کوئی چیز دیتا ہے تو اس کا اکرام کرتا ہے، پس ظاہر ہے جب ایک مسلمان بھائی اپنے دوسرے بھائی کا اکرام کرے گا اور اس کے لیے اپنے مال کو صَرف کرے گا تو محبت پیدا ہوگی اور عداوت ودشمنی محو ہوجائے گی۔

لغات: غل: بکسر الغین العداوۃ والحقد الکامن دشمنی وکینہ۔

تحابوا: أحب بعضهم بعضا.

شحناء: بفتح الشین وسکون الحاء الحقد والعداوۃ والبغضاء.

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يُفْتَحُ أَبْوَابُ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْإِثْنَيْنِ وَالْخَمِيْسِ فَيُغْفَرُ لِكُلِّ عَبْدٍ مُّسْلِمٍ لَا يُشْرِكُ بِاللهِ شَيْئًا إِلَّا رَجُلٌ كَانَتْ بَيْنَهُ وَبَيْنَ أَخِيْهِ شَحْنَاءُ فَيُقَالُ انْظُرُوْا هٰذَيْنِ حَتّٰى يَصْطَلِحَا انْظُرُوْا هٰذَيْنِ حَتّٰى يَصْطَلِحَا.

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: پیر اور جمعرات کے دن جنت کے دروازے کھولے جاتے ہیں اور ہر اس مسلمان بندے کی مغفرت کردی جاتی ہے جو اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں کرتا سوائے اس شخص کے جس کے اور اس کے بھائی کے درمیان دشمنی اور عداوت ہو؛ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے ان دونوں کو مہلت دے دو، یہاں تک کہ صلح کرلیں۔

تشریح: اس حدیث میں آپسی عداوت ودشمنی کو قائم رکھنے والوں کے لیے وعید ہے یعنی جب تمام نیک بندوں کو انعام سے نوازا جاتا ہے تو ایسے لوگوں کو محرومی کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو آپس میں بغض رکھتے ہیں، گویا حدیث میں اس سے بچنے کی تاکید ہے۔

یفتح أبواب الجنة: علامہ باجی مالکیؒ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ بڑے بڑے گناہ ان دونوں دنوں میں معاف کردیئے جاتے ہیں اور بہت سے لوگوں کے درجات کو بلند کیا جاتا ہے، گویا ابوابِ جنت کا کھولا جانا کنایہ ہے مغفرت، رفعِ درجات اور انعام کے دیئے جانے سے۔ (المنتقی: ۷)

علامہ زرقانی، علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں ممکن ہے فتح ابواب حقیقت پر محمول ہو؛ کیونکہ جنت کے دروازے بند ہیں۔ ملا علی قاریؒ نے فرمایا: اس سے مراد جنت کے طبقات اور بالاخانوں کا کھلنا ہے۔

لکل عبد مسلم لایشرك باللہ: دونوں عبد کی صفت ہیں اور اس سے مراد مؤمن کامل ہے۔

إلا رجل بالرفع محذوف عبارت اس طرح ہوگی: یغفر ذنب کل رجل إلا ذنب رجل یعنی مضاف کو حذف کر دیا۔ رفع کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ "إلّا" کو "غیر" کے معنیٰ میں مان کر "عبد" کی صفت قرار دے دیا جائے؛ لیکن مُلّا علی قاریؒ نے رفع کی قراءت کو شاذ کہا ہے۔

اور نصب کی قراءت متواتر ہے، محذوف عبارت یوں ہوگی: یغفر کل رجل إلا رجلًا.

فیقال انظروا هٰذین أي أمهلوا یعنی دونوں کی مغفرت اور انعام واکرام کو مؤخر کردیا جائے، تا آنکہ دونوں آپس میں صلح صفائی کرلیں، واضح رہے کہ اجر وثواب کو اس وقت موقوف رکھا جائے گا جب تک ہر ایک دوسرے سے صفح وصلح نہ کرلے۔

مؤطا کے نسخہ میں حدیث کا آخری ٹکڑا دو مرتبہ ذکر کیا گیا ہے، علامہ زرقانیؒ نے فرمایا تاکید کے لیے ہے، علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں حدیث کا مقصد عداوت پر اصرار کرنے سے ڈرانا ہے، ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں یہ صلح صرف ریاء اور دکھلاوے کے طور پر نہ ہو؛ بلکہ اس طرح ہو کہ دشمنی کا بیج بالکل ختم ہوجائے۔

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالىٰ عَنْهُ أَنَّهُ قَالَ يُعْرَضُ أَعْمَالُ الْعِبَادِ كُلَّ جُمْعَةٍ مَرَّتَيْنِ يَوْمَ الْإِثْنَيْنِ وَيَوْمَ الْخَمِيْسِ فَيُغْفَرُ لِكُلِّ عَبْدٍ مُّؤْمِنٍ إِلَّا عَبْدًا كَانَتْ بَيْنَهُ وَبَيْنَ اَخِيْهِ شَحْنَاءُ فَيُقَالُ اتْرُكُوْا هٰذَيْنِ حَتّٰى يَفِيْئَا أَوِ ارْكُوْا هٰذَيْنِ حَتّٰى يَفِيْئَا.

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں ہر ہفتہ، پیر اور جمعرات کو بندوں کے اعمال پیش کیے جاتے ہیں، پس ہر بندے کی مغفرت کردی جاتی ہے سوائے اس بندہ کے جس کے اور اس کے بھائی کے درمیان عداوت ہو؛ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے ان دونوں کو چھوڑ دو، یہاں تک کہ باز آجائیں اور ان کی مغفرت کو مؤخر کردو، یہاں تک کہ لوٹ آئیں۔

تشریح: یہ روایت بظاہر موقوف ہے؛ لیکن حکماً یہ مرفوع کے درجہ میں ہے؛ کیونکہ حدیث کا مضمون غیر مدرک بالقیاس ہے جو صرف شارع سے سن کر ہی بیان کیا جا سکتا ہے۔

یعرض الأعمال: کوکب الدری میں مولانا گنگوہیؒ نے فرمایا عرض اعمال کے معنیٰ صرف انتظامِ اُمور کے طور پر پیش ہونا ہے ویسے تو اللہ تعالیٰ ہر چیز کو اس کے وجود سے پہلے سے ہی جانتے ہیں، لہٰذا ان کے علم میں لانے کے لیے عرض کی ضرورت نہیں ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: عرض اعمال سے مراد فرشتوں کے صحیفوں سے لوحِ محفوظ میں منتقل ہونا ہے ۱۲

حلیمیؒ فرماتے ہیں: مراد اللہ کے سامنے پیش کرنا ہے اور رہے فرشتے تو وہ دن اور رات دونوں وقتوں میں اعمال لے جاتے ہیں؛ نیز ممکن ہے فرشتوں کی جماعتوں کی باری ہو؛ چنانچہ ایک جماعت پیر سے جمعرات اعمال لکھتی ہے اور پھر پیش کرتی ہے اور دوسری جماعت جمعرات سے پیر تک اعمال لکھتی ہے اور لکھا ہوا پیش کرتی ہے اور یہ عرض صوری ہے؛ ورنہ اللہ سبحانہٗ ان تمام چیزوں سے بے نیاز ہیں۔

اور عرض اعمال کا مقصد یہ ہے کہ اللہ بنی آدم کے اعمالِ صالحہ پر فرشتوں کے سامنے فخر کرتے ہیں، نیز یہ کہ فرشتوں کو اعمالِ صالحہ اور قبیحہ میں تمیز سکھلانا ہوتا ہے۔

کل جمعة: جمعہ سے مراد پورا ہفتہ ہے۔

حتی یفأ أي یرجع یعنی مقاطعت و متارکت ختم ہوجائے اور محبت و مودت کی طرف لوٹ آئے۔

اِرْکُوْا أي أخروا من رکاه یرکوه إذا أخرّ.

○❖○

کِتَابُ اللِّبَاسِ

لباس اصل میں مصدر ہے؛ لیکن اس کو ملبوس کے معنیٰ استعمال کیا جاتا ہے، قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِىْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ط﴾ لباس قدرت کی ایک عظیم اور بیش قیمت نعمت ہے؛ کیونکہ اسی کے ذریعہ انسان اور جانوروں کے درمیان امتیاز ہوتا ہے، اور انسان کی تہذیب وشائستگی نمایاں ہوتی ہے، نیز اس سے برہنگی کی ستر پوشی ہوتی ہے جس کے کھلے رہنے کو انسان فطرتاً قبیح محسوس کرتا ہے۔

جاننا چاہیے کہ لباس کے تین درجے ہیں:

(۱) واجب، یعنی ہر انسان کے لیے اتنا لباس زیب تن کرنا لازم اور ضروری ہے جس سے ستر کو چھپا سکے اور اس کی مقدار مردوں کے لیے ناف سے لے کر گھٹنوں تک ہے، اور عورتوں کے لیے چہرے، ہتھیلیوں اور قدموں کے علاوہ پورا بدن ڈھانپنا ضروری ہے۔

(۲) لباس زینت: یعنی مقدارِ واجب سے زائد کپڑے جن کو انسان زیب وزینت کے طور پر استعمال کرتا ہے جیسا کہ قرآنِ کریم میں ارشادِ باری ہے ﴿خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ﴾ یعنی ایسا لباس زیب تن کرنا جس سے بدہیئت، بےتہذیب اور ناشائستہ معلوم نہ ہو یہ مباح یا مستحب ہے۔

(۳) لباس ممنوع یعنی وہ لباس جو مقدارِ واجب سے کم ہو، اسی طرح اتنا باریک کہ جس سے جسم کی برہنگی نمایاں ہو اسی طرح تصویر والا لباس۔

واضح رہے کہ بسا اوقات لباس مباح بھی ناجائز اور حرام ہو جاتا ہے، مثلاً کوئی شخص عمدہ اور اچھا لباس بطورِ تحدیثِ نعمت پہنتا ہے، تو ماجور ہوگا اور اگر بطورِ تکبر اور دوسروں پر

برتری ظاہر کرنے کے لیے پہنتا ہے تو یہ حرام وناجائز ہے۔

فائدہ: لباس کی دوسری قسم یعنی مباح اس کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ لباس جو دنیا کی اقوام میں رائج ہوتا ہے، دوسرا وہ لباس جو صدیوں سے آج تک اتقیاء وصلحاء کا پسندیدہ رہا ہے۔

دونوں طرح کے لباس بہرحال جائز ہیں؛ البتہ مومن کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ صلحاء اور اتقیاء والے لباس کو اختیار کرے؛ کیونکہ وہ لباس معزز ہونے کے ساتھ ساتھ عبادت کی ادائیگی میں آسانی پیدا کرتا ہے اور خشوع کو باقی رکھتا ہے۔

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ الْأَنْصَارِيِّ أَنَّهُ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ غَزْوَةِ بَنِيْ أَنْمَارٍ قَالَ جَابِرٌ فَبَيْنَا أَنَا نَازِلٌ تَحْتَ الشَّجَرَةِ إِذَا رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللهِ هَلُمَّ إِلَى الظِّلِّ قَالَ فَنَزَلَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُمْتُ إِلٰى غِرَارَةٍ لَنَا فَالْتَمَسْتُ فِيْهَا شَيْئًا فَوَجَدْتُّ فِيْهَا جِرْوَ قِثَّاءٍ فَكَسَرْتُهُ ثُمَّ قَرَّبْتُهُ إِلٰى رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ أَيْنَ لَكُمْ هٰذَا قَالَ فَقُلْتُ خَرَجْنَا بِهِ يَا رَسُوْلَ اللهِ مِنَ الْمَدِيْنَةِ قَالَ جَابِرٌ وَعِنْدَنَا صَاحِبٌ لَنَا نُجَهِّزُهُ يَذْهَبُ يَرْعٰى ظَهْرَنَا قَالَ فَجَهَّزْتُهُ ثُمَّ أَدْبَرَ يَذْهَبُ فِي الظَّهْرِ وَعَلَيْهِ بُرْدَانِ لَهُ قَدْ خَلِقَا قَالَ فَنَظَرَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَيْهِ فَقَالَ أَمَا لَهُ ثَوْبَانِ غَيْرَ هٰذَيْنِ فَقُلْتُ بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللهِ لَهُ ثَوْبَانِ فِي الْعَيْبَةِ كَسَوْتُهُ إِيَّاهُمَا قَالَ فَادْعُهُ فَمُرْهُ فَلْيَلْبَسْهُمَا قَالَ فَدَعَوْتُهُ فَلَبِسَهُمَا ثُمَّ وَلّٰى يَذْهَبُ قَالَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا لَهُ ضَرَبَ اللهُ عُنُقَهُ أَلَيْسَ هٰذَا خَيْرًا لَهُ قَالَ فَسَمِعَهُ الرَّجُلُ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللهِ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ فَقُتِلَ الرَّجُلُ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ.

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم غزوۂ انمار کے لیے آپ صلی اللہ علیہ

وسلم کے ساتھ نکلے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں اسی دوران کہ ایک درخت کے نیچے ٹھہرا ہوا تھا اچانک میری نظر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر پڑی، وہ کہتے ہیں میں نے عرض کیا اے رسولِ خدا! درخت کے سایہ میں تشریف لے آئیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فروکش ہوگئے، پھر میں اپنے تھیلے کی طرف بڑھا اور میں نے اسے تلاش کیا تو میں نے اس میں ٹیڑھی ککڑیاں پائیں؛ چنانچہ میں نے ان کو توڑ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کردیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ تم کہاں سے لائے ہو؟ کہتے ہیں میں نے عرض کیا یارسول اللہ! میں انہیں مدینہ سے اپنے ساتھ لے آیا ہوں، حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے مزید کہا ہمارے ساتھ ایک شخص ہے جسے ہم نے اپنے جانوروں کی دیکھ بھال کے لیے تیار کیا ہے، کہتے ہیں: چنانچہ میں نے اسے تیار کرلیا، پھر وہ چلا گیا جانوروں میں اور اس کے جسم پر دو چادریں تھیں جو بوسیدہ ہوچکی تھیں، حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اس کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو فرمایا کیا اس کے پاس اِن دونوں کے علاوہ اور کپڑے ہیں؟ میں نے کہا جی ہاں یا رسول اللہ! تھیلے میں ہیں جو میں نے اسے عطا کیے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسے بلاؤ اور اسے کہو کہ وہ انہیں (دوسرے نئے) کپڑوں کو پہن لے، پس میں نے اسے بلایا اور اس نے وہ کپڑے پہن لیے، پھر وہ دوبارہ مڑ کر جانے لگا، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسے کیا ہوگیا ہے؟ اللہ اس کی گردن مارے، کیا یہ اس کے لیے بہتر نہیں ہے (یعنی ان نئے کپڑوں کو پہننا پرانے کے مقابلہ میں) حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ گفتگو اس نے سن لی اور اس نے کہا: اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ کے راستہ میں (یعنی اللہ میری گردن ماری جائے اللہ کے راستہ میں) جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا (ہاں) اللہ کے راستہ میں کہتے ہیں کہ پھر وہ اللہ کے راستہ میں شہید کردیا گیا۔

تشریح: في غزوة أنمار: غزوہ انمار کو مؤرخین نے مستقلاً ذکر نہیں کیا ہے، اسی

کو بعض نے غزوہ بنی امر کہا ہے، ابنِ سعدؒ نے فرمایا غطفان کی جانب ایک غزوہ بنی اُمر کے نام سے ہجرت کے پچیس مہینہ بعد ہوا ہے، شاید یہ وہی ہے اور بعض نے فرمایا محرم کی دس تاریخ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کے ساتھ بنی ثعلبہ اور محارب کی طرف نکلے تھے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر ملی کہ یہ دو قبیلے جنگ کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جمع ہوئے ہیں۔

وعلیه بردان له قد خَلِقا: وہ شخص جس کو حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے مویشیوں کی نگہبانی کے لیے رکھا تھا وہ دو بوسیدہ کپڑے پہنے ہوئے تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اسے دیکھا تو فرمایا کیا اس کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی کپڑا نہیں ہے۔

علامہ باجیؒ فرماتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات اس لیے فرمائی؛ کیونکہ وہ انتہائی بدنما معلوم ہو رہی تھیں اور شاید آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی وسعتِ حال کا اندازہ بھی ہو، اس سے معلوم ہوا کہ انسان کے پاس گنجائش اور وسعتِ حال ہو تو اپنی ہیئت وحالت کو بدنما بنانا بہتر نہیں ہے؛ بلکہ جب اللہ نے نعمتوں سے نوازا ہے تو اس کا اثر ظاہر ہونا چاہیے، تاہم اتنی بات ضرور ہے کہ اظہارِ نعمت بطورِ تکبر اور دوسروں کو نیچا دکھانے کے لیے نہ ہو؛ ورنہ تو یہ حرام کا ارتکاب کرنا ہوگا، بہرحال آپ کے ارشاد سے معلوم ہوا کہ حدودِ شرع میں رہ کر زینت اختیار کرنا جائز ہے یا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اس لیے تنبیہ کی کہ یہ جنگ کا موقع ہے، ہوسکتا ہے یہاں کفار کے جاسوس ہوں اور جب وہ اس خستہ حالی کو دیکھیں تو مسلمانوں کی کمزوری اور اپنی قوت کا اعتقاد کرلیں اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لیے پُرعزم ہوجائیں۔

فقال رسول اللہ "ماله ضرب الله عنقه" یہ جملہ عرب میں کسی منکر شخص کے لیے بولا جاتا ہے، مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناگواری کا اظہار فرمایا کہ جب اس کے پاس عمدہ کپڑے موجود ہیں تو کیوں پھٹے پُرانے کپڑوں کو پہنے ہوئے تھا۔

فسمعه الرجل: مذکورہ جملہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بارے میں کہا

تو اس نے سن لیا اور اس کو اس بات کا یقین تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا قبول ہوتی ہے؛ اس لیے اس نے وضاحت سے معلوم کیا کہ کیا میری گردن میدانِ جہاد میں ماری جائے گی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بطورِ دعا فرما دیں، ہاں! میدانِ جہاد میں، حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں وہ شخص اللہ کے راستہ میں ہی شہید ہوا۔

لیکن ابونعیمؒ کہتے ہیں کہ وہ اس غزوہ میں شہید نہیں ہوا؛ بلکہ یمامہ کی جنگ میں شہید ہوا؛ کیونکہ اس غزوہ میں قتال کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔

لغات: جرو قثاء جرو بکسر الجیم الصحیح ٹیڑھے یا ابتدائی پھل کو کہتے ہیں۔ قثّاء ککڑی۔

خَلَقَا (ن، س، ک) الثوب: کپڑے کا پرانا اور بوسیدہ ہونا۔

خِرارة جمعه غرائر تھیلا، برتن۔

ظهر: سواری، یہاں مراد اونٹ وغیرہ۔ العَيْبَةُ: چمڑے کا تھیلا۔

عَنْ مَالِكٍ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَالَ إِنِّي لَأُحِبُّ أَنْ أَنْظُرَ إِلَي الْقَارِيْ أَبْيَضَ الثِّيَابِ.

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ میں قاری کو سفید لباس والا دیکھنا زیادہ پسند کرتا ہوں۔

تشریح: یہاں قاری سے مراد مشہور قاریِ قرآن بھی ہوسکتا ہے؛ لیکن اس دَور میں قراء بھی اہل العلم والدین ہوتے تھے، حضرت فرماتے ہیں میری خواہش یہ ہے کہ لوگ سفید لباس میں رہیں، اس کی دو وجہ ہوسکتی ہیں: اوّل یہ کہ یہ لوگ امت کا ممتاز اور نمایاں طبقہ ہے؛ اس لیے ان کے لباس عمدہ وممتاز ہوں اور وہ سفید لباس ہے جیسا کہ حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "خير ثيابكم اللبياض".

یا پھر سفید کپڑوں سے مراد صاف ستھرے اور گندگی وغیرہ سے محفوظ کپڑے ہیں؛ اس لیے کپڑوں کی صفائی ستھرائی پہننے والے کے تقویٰ وطہارت کی دلیل ہوتی ہے اور چونکہ ان

لوگوں کو اکثر وبیشتر امام بنایا جاتا ہے اور امام کے لیے یہی مناسب ہے، نیز سفید کپڑے پر گندگی اور میل زیادہ نظر آتا ہے جس کی وجہ سے ان کے صاف کرنے کا اہتمام زیادہ ہوتا ہے۔

عَنِ ابْنِ سِيْرِيْنَ قَالَ قَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ إِذَا وَسَّعَ اللهُ عَلَيْكُمْ فَأَوْسِعُوْا عَلٰى أَنْفُسِكُمْ جَمَعَ رَجُلٌ عَلَيْهِ ثِيَابَهُ.

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب اللہ تعالیٰ تم پر کشادگی کرے تو تم اپنی ذات پر وسعت سے کام لو آدمی اپنے لیے کپڑوں کو جمع کرے۔

تشریح: جب اللہ کسی شخص کو نعمتوں سے نوازیں تو انسان ان کو استعمال کرے اور ان انعامات کا اثر اس کی زندگی میں نمایاں ہو؛ چنانچہ اس کا رہن سہن، لباس وغیرہ سب اچھا ہو؛ کیونکہ ’’إن الله يحب أن يرى أثر نعمته على عبده‘‘ لیکن ان تمام چیزوں کا مقصد اللہ کا شکر ادا کرنا ہو، تکبر وریاکاری ہرگز مقصود نہ ہو۔

جمع رجل عليه ثيابه: ابنِ منیر کہتے ہیں دراصل یہ شرطیہ جملہ ہے ’’إن جمع رجل عليه ثيابه فحسن‘‘ یا پھر خبر ہے امر کے معنیٰ میں ’’أي ليجمع عليه ثيابه‘‘. خلاصہ یہ ہے کہ جب کسی کے پاس وسعت اور کشادگی ہو تو اس کے لیے کپڑوں کے اندر اضافہ کرنا بُرا نہیں ہے یعنی انسان مختلف مواقع میں زیب تن کرنے کے لیے الگ الگ قسم کے لباس بنا سکتا ہے، تاہم اس بات کا خیال رہے کہ اسراف اور فضول خرچی نہ ہو جو اکثر ان مواقع پر دیکھنے میں آتی ہے۔

مَا جَاءَ فِيْ لُبْسِ الثِّيَابِ الْمُصَبَّغَةِ وَالذَّهَبِ

(رنگین کپڑوں اور سونے کو پہننے کا بیان)

سابقہ حدیثوں میں سفید کپڑا پہننے کی فضیلت کو بیان کیا گیا تھا، اب یہاں رنگین کپڑوں کو استعمال کرنے کا حکم ہے۔

رنگین کپڑے بلا اختلافِ ائمہ مرد وعورت دونوں کے زیب تن کرنا جائز ہے، سوائے

چند رنگوں کے جیسے سرخ رنگ، مردوں کو اس رنگ کا کپڑا پہننے کے بارے میں آٹھ اقوال ہیں، صحیح یہ ہے کہ مکروہِ تنزیہی ہے؛ کیونکہ یہ رنگ مردوں کی شایانِ شان نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص سرخ جوڑا پہن کر حاضر ہوا اور اس نے سلام کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب عنایت نہیں فرمایا۔

اسی طرح گیروا اور زعفرانی رنگ کے پہننے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے؛ کیونکہ یہ رنگ سادھو سنت پہنتے ہیں، ان کی مشابہت سے بچنے کے لیے اس رنگ سے منع فرمایا گیا ہے؛ لیکن زعفرانی رنگ کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے، حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما، امام مالکؒ اور اکثر فقہاءِ مدینہؒ اس کے جواز کے قائل ہیں۔

ان کی دلیل ہے کہ ابنِ عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: إني رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم يصبغ بالصفرة وهذا عام في الزعفران وغيره.

اور از روئے قیاس زعفران ایک خوشبو ہے مشک کی طرح جو عورتوں پر حرام نہیں ہے، تو مردوں کے لیے بھی ممنوع نہیں ہوگی۔

اور ان احادیث میں ممانعت وارد ہے اس کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یا تو ممانعت کا حکم مُحرِم کے لیے ہے یا پھر اس سے مراد جسم پر لگانا ہے؛ اس لیے کہ اس میں تشبہ بالنساء ہے، ان کے علاوہ جمہور امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ وغیرہ کے نزدیک مکروہ ہے، ان کی دلیل: عن أنس قال نهى النبي صلى الله عليه وسلم أن يتزعفر الرجل حدیث ہے جو عام ہے محرم اور غیر محرم دونوں کے لیے۔

دوسرا حکم اس حدیث میں سونا پہننے کے بارے میں ہے۔

سونا پہننا مردوں کے لیے بالاتفاق حرام ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سونا اور ریشم میری امت کے مردوں کے لیے حرام ہیں اور عورتوں کے لیے حلال ہیں۔

اور جب سونے کی حرمت بالغ مردوں کے بارے میں ثابت ہوگئی، مذکر بچوں کو بھی اس کا پہننا حرام ہوگا۔

فتح القدیر میں ہے: لأن التحريم لما ثبت في حق الذكور وحرم اللبس حرم الإلباس كالخمر لما حرم شربها حرم شقيها. (فتح القدير: ۱۰/۲۶)

عَنْ نَافِعٍ أَنَّ عَبْدَ اللهِ بْنِ عُمَرَ كَانَ يَلْبَسُ الثَّوْبَ الْمَصْبُوْغَ بِالْمَشْقِ وَالْمَصْبُوْغَ بِالزَّعْفَرَانِ.

ترجمہ: نافعؒ سے روایت ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سرخ مٹی سے رنگا ہوا اور زعفران سے رنگا ہوا کپڑا پہنتے تھے۔

زعفرانی اور سرخ کپڑا پہننے کے بارے میں یہ امام مالکؒ کی دلیل ہے۔

قَالَ مَالِكٌ عليه الرحمة: وَأَنَا أَكْرَهُ أَنْ يَلْبَسَ الْغِلْمَانُ شَيْئًا مِنَ الذَّهَبِ لِأَنَّهُ بَلَغَنِيْ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنْ تَخَتُّمِ الذَّهَبِ فَأَنَا أَكْرَهُهُ لِلرِّجَالِ الْكَبِيْرِ مِنْهُمْ وَالصَّغِيْرِ.

سونا پہننا مردوں کے لیے بالاتفاق حرام ہے اور جو چیز بالغ مردوں کے لیے حرام ہے بچوں کو پہنانا بھی حرام ہے۔

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں جب نص کے ذریعہ سونا اور ریشم امت کے مردوں کے لیے حرام ہوگیا، بالغ آزاد کی قید کے بغیر، لہٰذا بچوں کے لیے بھی یہ چیزیں حرام ہوں گی اور گناہ ان لوگوں پر ہوگا جو ان کو پہنائیں گے۔ (شامی: ۹)

قَالَ مَالِكٌ عليه الرحمة: فِي الْمَلَاحِفِ الْمُعَصْفَرَةِ فِي الْبُيُوْتِ لِلرِّجَالِ وَفِي الْأَفْنِيَةِ قَالَ: لَا أَعْلَمُ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا حَرَامًا وَغَيْرُ ذٰلِكَ مِنَ اللِّبَاسِ أَحَبُّ إِلَيَّ.

ترجمہ: حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں: گھروں اور صحنوں میں مردوں کے لیے زرد لحاف اور چادر استعمال کرنا جائز ہے، فرماتے ہیں میں ان میں سے کسی چیز کو حرام نہیں جانتا اور اس رنگ کے علاوہ لباس میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہیں۔

تشریح: زرد اور زعفرانی کپڑوں کے بارے میں اصلاً امام مالکؒ کی دو روایتیں ہیں: (۱) زرد کپڑے مطلقاً جائز ہیں (۲) ایسے کپڑوں اور چادروں کا استعمال اور گھر اور

صحن میں جائز ہے اور محفل اور بازار میں مکروہ ہے۔

بہر صورت امام مالکؒ نے اخیر میں فرمایا: میرے نزدیک بھی ان کپڑوں کے علاوہ دوسرے کپڑوں کو استعمال کرنا زیادہ بہتر ہے۔

مَا جَاءَ فِيْ لُبْسِ الْخَزِّ

خز: خاء کے فتحہ کے ساتھ جمعہ خزوز اس کا اطلاق اون اور ریشم سے بنے ہوئے کپڑوں پر بھی ہوتا ہے اور خالص ریشم کے کپرے پر بھی۔ (القاموس الوحید)

بہرحال مسلمان مردوں کے لیے ریشم کا استعمال عام حالات میں ائمہ اربعہ کے نزدیک بالاتفاق ناجائز ہے اور حالتِ اضطرار میں بالاتفاق جائز ہے؛ البتہ بیماری اور جنگ وسفر وغیرہ میں خالص ریشمی لباس مردوں کے لیے جائز ہے یا نہیں اس میں اختلاف ہے۔

امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک اس صورت میں بھی خالص ریشمی لباس کا استعمال جائز نہیں ہے۔

امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور صاحبینؒ کے نزدیک اس صورت میں خالص ریشمی لباس کا استعمال مردوں کے لیے جائز ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کی دلیل وہ روایات ہیں جن میں مطلقاً ریشمی لباس کے استعمال کی ممانعت وارد ہوئی ہے، ترمذی کی روایت ہے: **حرم لباس الحرير والذهب على ذكور أمتي و أحل لإناثهم.**

امام شافعیؒ کی دلیل عبدالرحمٰن بن عوف اور زبیر بن العوام کی روایت ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کو سفر میں خارش یا کسی اور مرض کی وجہ سے ریشمی قمیص کے استعمال کی اجازت دی تھی **أن رسول الله صلى الله عليه وسلم رخص لعبد الرحمٰن بن عوف والزبير بن العوام في القميص الحرير في السفر من حكمة بهما أووجع كان بهما"**

جواب: حنفیہؒ اس روایت کو ان حضرات کی خصوصیت پر محمول کرتے ہیں۔

وفي إعلاء السنن: فقول أبي حنيفة في الباب أورع وأحوط وقولهما أوسع وأقوىٰ وأضبط.

مذکورہ حکم خالص ریشم کا ہے، بہرحال وہ کپڑا جس میں ملاوٹ ہو بایں طور کہ کپڑے کا تانا ریشم کا ہے؛ لیکن بانا غیر ریشم مثلاً سوت کا ہے، تو اس کا پہننا جائز ہے؛ کیونکہ کپڑے میں اعتبار بانے کا ہے اور بانا ریشم اور غیر ریشم سے مخلوط ہے تو غلبہ کا اعتبار ہوگا اور اگر بانا خالص ریشم کا ہے تو چاہے تانا کسی چیز کا بھی ہو اس کا پہننا ناجائز ہے۔

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا زَوْجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهَا كَسَتْ عَبْدَ اللهِ بْنَ الزُّبَيْرِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا مِطْرَفَ خَزٍّ كَانَتْ عَائِشَةُ تَلْبَسُهُ.

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے بھانجے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کو خز کا ایک کپڑا پہنایا جیسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا خود پہنتی تھیں۔

تشریح: حدیث شریف سے خز پہننے کا جواز معلوم ہوتا ہے، خز کا اطلاق اگرچہ خالص ریشمی اور مخلوط دونوں طرح کے کپڑوں پر ہوتا ہے؛ لیکن یہاں سے خز سے مراد یا تو وہ کپڑا ہے جس کا تانا ریشم کا ہے اور بانا غیر ریشم کا ہے، اس طرح کا کپڑا تمام ائمہ کے نزدیک جائز ہے، اور یہ تاویل اس لیے ضروری ہے؛ کیونکہ خالص ریشم جس طرح بالغ مردوں کو پہننا حرام ہے، اسی طرح چھوٹے بچوں کو پہنانا بھی حرام ہے اور یہ بات بعید ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ایک ممنوع کپڑا کسی کو پہنائیں۔

یا پھر وہ کپڑا مراد ہے جس میں ریشم کی صرف دھاریاں تھیں یا ریشم چار اُنگلیوں کی مقدار یا اس سے کم تھی؛ کیونکہ ریشم کی اتنی مقدار مردوں کے لیے استعمال کرنا جائز ہے۔ واللہ اعلم

لغت: مطرف بكسر الميم وضمه، رداء أو ثوب من خز مربع ذو أعلام (ج) مطارف.

مَا يُكْرَهُ لِلنِّسَاءِ لِبَاسُهُ مِنَ الثِّيَابِ

(وہ کپڑے جو عورتوں کے لیے مکروہ ہیں)

عورتوں کے لیے ہر رنگ کے کپڑے زیب تن کرنا جائز ہے، بشرطیکہ وہ کسی امرِ شرعی کے خلاف نہ ہوں، مثلاً نہ اتنے باریک ہوں کہ جن سے اعضاء دکھائی پڑیں اور نہ اتنے چست ہوں جن سے حجمِ جسم ظاہر ہو۔

دَخَلَتْ حَفْصَةُ بِنْتُ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَلٰى عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعَلٰى حَفْصَةَ خِمَارٌ رَقِيْقٌ فَشَقَّتْهُ عَائِشَةُ وَكَسَتْهَا خِمَارًا كَثِيْفًا.

ترجمہ وتشریح: حفصہ بنتِ عبدالرحمٰن حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس آئیں اور وہ ایک باریک اوڑھنی اوڑھے ہوئے تھیں، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے وہ اوڑھنی ان کے سر سے لے کر پھاڑ دی (ممکن ہے کہ اس کی خفت کی وجہ سے اندرونی بال نظر آرہے ہوں) اور اس کے بدلے میں موٹی اوڑھنی ان کو اُڑھا دی؛ تاکہ ان کی دلجوئی بھی ہو جائے اور آئندہ کے لیے نصیحت ہو جائے کہ باریک کپڑا استعمال نہیں کرنا چاہیے۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ أَنَّهُ قَالَ نِسَاءٌ كَاسِيَاتٌ عَارِيَاتٌ مَائِلَاتٌ مُمِيْلَاتٌ لَا يَدْخُلْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يَجِدْنَ رِيْحَهَا وَرِيْحُهَا يُوْجَدُ مَسِيْرَةَ خَمْسِ مِائَةِ سَنَةٍ.

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کچھ عورتیں جو لباس پہننے والی ہیں (حقیقتاً) برہنہ ہوتی ہیں، مردوں کی طرف مائل ہونے والی ہیں اور مردوں کو اپنی طرف مائل کرنے والی ہیں، ہرگز جنت میں داخل نہیں ہوں گی اور نہ اس کی خوشبو پائیں گی؛ حالانکہ اس کی خوشبو پانچ سو سال کی مسافت سے محسوس کی جاتی ہے۔

تشریح: حدیث شریف میں باریک لباس زیب تن کرنے والی عورتوں کے لیے

سخت وعید ہے کہ جنت میں ان کا دخول تو کجا اس کی خوشبو جو پانچ سو سال کی مسافت سے آنے لگتی ہے وہ بھی نصیب نہ ہوگی؛ اس لیے مؤمن عورتوں کو دنیوی خواہشات کی خاطر اپنی آخرت داؤ پر نہیں لگانی چاہیے۔

کاسیات: یعنی یہ عورتیں کپڑے تو پہنتی ہیں مگر وہ اتنے باریک ہوتے ہیں کہ جن سے اعضاءِ جسم جھلکتے ہیں تو بظاہر تو وہ کپڑے زیب تن کیے ہیں؛ لیکن حقیقت میں برہنہ ہیں یا پھر اس قدر چھوٹے کپڑے پہنتی ہیں جن سے بعض جسم چھپتا ہے اور بعض اعضاء کھلے رہتے ہیں یا ایسے کپڑے استعمال کرتی ہیں جو جسم پر اس طرح چپک جاتے ہیں کہ حجم اعضاء ظاہر ہونے لگتا ہے۔

مائلات ممیلات: اور یہ عورتیں ایسے کپڑے اس لیے پہنتی ہیں؛ کیونکہ ان کے دل مردوں کی طرف مائل رہتے ہیں اور وہ خود چاہتی ہیں مردان کی طرف مائل ہوں۔

اور بعض لوگوں نے ''مائلات'' سے مراد ''مائلات عن الحق واطاعة الله'' لیا ہے یعنی حق اور طاعتِ الٰہی سے منہ موڑنے والی۔

ممیلات: مردوں کو اپنی طرف مائل کرنے والیاں، یا دوسری عورتوں کو اپنے جیسے فعل کی طرف مائل کرنے والیاں، شاید یہ اس لیے فرمایا؛ کیونکہ عورتوں کے اندر یہ خصلت کثرت سے پائی جاتی ہے کہ وہ دوسری عورتوں کے لباس و پوشاک سے بہت جلد متاثر ہوتی ہیں اور اسی کے رنگ میں ڈھلنے کی کوشش کرتی ہیں۔

لایدخل الجنة: یعنی انہیں دخولِ اوّلیں حاصل نہ ہوگا؛ بلکہ وہ اس بے حیائی کی سزا پا کر جنت میں جاسکتی ہیں۔

عَنِ ابْنِ شِهَابٍ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَامَ مِنَ اللَّيْلِ فَنَظَرَ فِيْ أُفُقِ السَّمَاءِ فَقَالَ مَاذَا فَتَحَ اللهُ اللَّيْلَةَ مِنَ الْخَزَائِنِ وَمَاذَا وَقَعَ مِنَ الْفِتَنِ كَمْ مِنْ كَاسِيَةٍ فِي الدُّنْيَا عَارِيَةٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَيْقِظُوْا صَوَاحِبَ الْحُجَرِ.

ترجمہ: حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم رات میں تہجد کے لیے بیدار ہوئے تو

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آسمان پر نظر ڈالی اور فرمایا: اس رات اللہ نے کتنے خزانے کھولے اور کتنے فتنے واقع ہوئے، کتنی ہی لباس پہننے والی عورتیں قیامت کے دن برہنہ ہوں گی، ان حجرے والی عورتوں کو جگاؤ۔

تشریح: ماذا فتح الله الليلة من الخزائن: علامہ ابنِ عبدالبرؒ فرماتے ہیں: خزائن سے مراد وہ کشادگیٔ رزق ہے جو اللہ نے اس امت کو کفار کے علاقوں پر فتح یابی کے ذریعہ بخشی تھی۔

بعض علماء کا کہنا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ جب خزائن رزق کی کشادگی ہوتی ہے تو فتنے بڑھتے ہیں؛ کیونکہ وسعتِ مال زیادتی فتنہ کا سبب ہے۔

وماذا وقع من الفتن: علامہ باجیؒ فرماتے ہیں: فتن سے مراد دنیوی مال کے فتنے ہیں یا فتن سے مراد وہ فتنے ہیں جو اس امت میں پیدا ہوں گے جیسے سفکِ دماء، قابلِ احترام چیزوں کی پامالی اور مسلمانوں کے احوال کا فساد۔

ابنِ بطالؒ نے فرمایا: فتوحات کے ذریعہ خزائن کی کشادگی ہوگی تو اس امت میں مال کا فتنہ پیدا ہو جائے اور لوگ اس میں تنافس کریں اور اس کی وجہ سے قتل وقتال واقع ہوگا۔

كاسية في الدنيا عارية يوم القيامة: حافظ ابنِ حجرؒ نے اس کی مختلف توجیہات پیش کی ہیں:

(۱) دنیا میں جو عورتیں اتنا باریک لباس پہنتی ہیں جس سے ان کے اعضاءِ جسم نمایاں ہوتے ہیں قیامت کے دن برہنگی کے ذریعہ سزا دی جائے گی، سزائے مثل کے طور پر۔

(۲) وہ عورتیں جن کو اللہ تعالیٰ نے پہننے کے لیے عمدہ ملبوسات عطا کیے؛ لیکن وہ اللہ کا شکر نہیں بجالاتی ہیں، قیامت کے دن نامۂ اعمال کو ثواب سے عاری پائیں گی۔

(۳) کچھ عورتیں وہ ہوتی ہیں جو لباس پہنتے ہوئے بھی اعضاءِ جسم کا مظاہرہ کرتی ہیں، مثلاً اب اتنے مختصر کپڑے پہنتی ہیں جن سے مکمل اعضاء نہیں چھپتے یا دوپٹہ وغیرہ کو سینے کی بجائے پیچھے ڈال لیتی ہیں۔

ایقظوا صواحب الحجر: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وعظ کا رُخ چونکہ عورتوں کی طرف تھا؛ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ازواجِ مطہرات کو بھی بیدار کرنے کا حکم دیا کہ تم بھی عبادت سے غافل مت ہوجاؤ اور یہ گمان نہ ہوجائے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں ہیں؛ اس لیے وعیدیں ان کے لیے نہیں ہیں؛ بلکہ خاص وعام ہر مسلمان عورت کو آخرت کے بارے میں فکرمند رہنا چاہیے۔

مَا جَاءَ فِيْ إِسْبَالِ الرَّجُلِ ثَوْبَهُ

(مردوں کے لیے اسبالِ ثواب کا حکم)

اسبل اسبل أی ارخاء کے معنیٰ لٹکانا، زیادہ مقدار میں ہونا۔

اور شریعتِ مطہرہ میں اس سے مراد مردوں کا اپنے کپڑوں کو معتد بہ مقدار سے زائد لٹکانا۔

اکثر احادیث میں اگرچہ ازار کا لفظ آیا ہے؛ لیکن حافظ ابنِ حجرؒ فرماتے ہیں: اسبال کے حکم میں ازار، آستین، دامن اور عمامہ وغیرہ بھی شامل ہیں۔

اسبالِ ثواب کا تفصیلی حکم:

(۱) اگر کوئی شخص اپنی لنگی وغیرہ کو بقصد بطر وتکبر اپنے ٹخنوں سے نیچے لٹکائے تو بالاتفاق یہ مکروہِ تحریمی ہے اور ایسے شخص کے لیے سخت وعید ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی طرف نظرِ رحمت نہیں فرمائیں گے۔

(۲) اور اگر کسی شخص کا کپڑا بلا قصد واختیار نیچے لٹک جاتا ہے یا پھر کسی عذر کے سبب کپڑے کو ٹخنے سے نیچے لٹکانا پڑتا ہے مثلاً کوئی زخم ہے جس کی وجہ سے مکھیاں تنگ کرتی ہیں وغیرہ تو ایسے شخص کے لیے ٹخنہ سے نیچے تک لنگی وغیرہ لٹکانا مباح ہے، جیسا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا: أحد شقي إزاري يسترخي إلا أن أتعاهد ذلك منه فقال النبي صلى الله عليه وسلم لَسْتَ

ممن یصنعه خیلاء. اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حالتِ ذہول میں اگر اسبال ہو جائے تو وعید میں شامل نہیں ہوگا۔

(۳) اگر کوئی شخص اپنے ازار کو ٹخنوں سے نیچے لٹکا تا ہے اور اس کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ بطورِ تکبر اور فخر کے نہیں تو اس کے لیے کیا حکم ہے؟ اس بارے میں علماء کے درمیان کچھ اختلاف ہے۔

امام شافعیؒ، حنفیہ میں سے علامہ عینیؒ، ملا علی قاریؒ، حافظ ابنِ حجرؒ اور امام نوویؒ وغیرہ حضرات کے نزدیک اسبال مکروہِ تحریمی اس وقت ہوگا جب اس میں خیلاء کی شرط پائی جائے؛ کیونکہ احادیث میں وعید خیلاء یعنی تکبر کے ساتھ اسبال کی صورت میں ہے اور جن احادیث میں مطلق حکم ہے اس کو مقید پر محمول کیا جائے گا، نیز ان کا استدلال حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یہ کہہ کر وعید سے خارج رکھا کہ تم متکبرین میں سے نہیں ہو، اور اگر کوئی شخص بلا قصد تکبر اسبال کرتا ہے تو ان حضرات کے نزدیک مکروہِ تنزیہی ہے۔

اس کے برخلاف اکثر حنفیہؒ کے نزدیک قصد و بلا قصد تکبر دونوں صورتوں میں اسبال مکروہِ تحریمی ہے، دراصل اسبال اِزار ہی تکبر کی علامت سمجھا جائے گا خواہ اس کی نیت کچھ بھی ہو، تحقیق یہ ہے کہ جب شریعت میں اصل علت میں خفاء ہوتا ہے تو حکم ظاہر پر رکھ دیا جاتا ہے جیسا کہ سفر میں اصل علت مشقت ہے؛ لیکن اس کا اندازہ مشکل تھا؛ اس لیے اصل سفر پر حکم کا مدار رکھ کر رخصت دے دی گئی، اسی طرح اس بات کا پتہ لگانا دشوار ہے کہ ٹخنوں سے نیچے ازار کو تکبر کے لیے پہنتا ہے یا بغیر تکبر کے، لہٰذا حکم صرف لٹکانے پر رکھ دیا، اب جو شخص اسبال ازار کرتا ہے تو اس کو مطلقاً ممنوع قرار دیا جائے گا۔

اور فریقِ مخالف نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی روایت سے جو اجازت دی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا سوال یہ نہیں تھا کہ میں بلا قصد و تکبر اسبال کرتا ہوں؛ بلکہ انہوں نے یہ دریافت کیا تھا کہ میرے پابندی کرنے کے باوجود میرا اِزار ڈھول

میں قدموں پر آجاتا ہے اور ڈھول میں کوئی وعید اور ممانعت نہیں ہے جیسا کہ پیچھے گزرا اور جن احادیث میں ''خیلاء'' کی قید ہے وہ اتفاقی ہے یعنی لوگ عموماً اسی لیے اسبال کرتے ہیں۔

لہٰذا مؤمن کے لیے نصف ساق تک لنگی وغیرہ پہننا مستحب اور ٹخنوں تک جائز اور ٹخنوں سے متجاوز مکروہِ تحریمی ہے۔

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ تَعَالىٰ عَنْهُمَا أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الَّذِيْ يَجُرُّ ثَوْبَهُ خُيَلَاءَ لَا يَنْظُرُ اللهُ إِلَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ.

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص اپنے کپڑے کو تکبر کے طور پر لٹکائے اللہ تعالیٰ بروزِ قیامت اس کی طرف نظرِ کرم نہیں فرمائیں گے۔

خیلاء: التکبر والعجب خال (س) فلان خیلًا: تکبر کرنا، مغرور ہونا۔

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ تَعَالىٰ عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يَنْظُرُ اللهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِلىٰ مَنْ يَّجُرُّ إِزَارَهُ بَطَرًا.

بطرًا: بطر (س) بطراً، وقع في الكبريا غلا في المرح والزهو.

عَنْ عَلَاءِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ يَعْقُوْبَ أَنَّهُ قَالَ سَأَلْتُ أَبَا سَعِيْدٍ الْخُدْرِيِّ عَنِ الْإِزَارِ فَقَالَ أَنَا أُخْبِرُكُمْ بِعِلْمٍ سَمِعْتُ مِنْ رَّسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ إِزْرَةُ الْمُؤْمِنِ إِلىٰ أَنْصَافِ سَاقَيْهِ لَا جُنَاحَ عَلَيْهِ فِيْمَا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْكَعْبَيْنِ مَا أَسْفَلَ مِنْ ذٰلِكَ فَفِي النَّارِ لَا يَنْظُرُ اللهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِلىٰ مَنْ جَرَّ إِزَارَهُ بَطَرًا.

ترجمہ: علاء بن عبدالرحمٰن اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے ازار کے حکم کے بارے میں دریافت کیا، تو حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں تمہیں ایسے علم کی خبر دے رہا ہوں جس کو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے مؤمن کی ازار نصف ساق تک ہو، اور کوئی گناہ نہیں ہے

پنڈلی اور ٹخنے تک ہونے میں، اور جو اس سے بھی نیچے ہو تو وہ جہنم میں ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی طرف نظرِ کرم نہیں فرمائیں گے جو اپنی لنگی وغیرہ کو تکبر اُلٹکائے۔

تشریح: مذکورہ احادیث میں تکبر وغرور کی وجہ سے اسبالِ ازار کی ممانعت بیان کی گئی ہے، نیز اس میں تشبہ بالنساء بھی ہے اور ممکن ہے کہ کپڑے کے زیادہ نیچے لٹکنے کی وجہ سے نجاست وگندگی میں ملوث ہو جائے، اسی طرح زائد از حاجت ہونے کی وجہ سے اسراف بھی ہے۔

لاینظر اللہ: مراد نظرِ شفقت نہیں فرمائیں گے جبکہ اس دن ہر شخص اللہ کے رحم وکرم کی آس لگائے ہوگا۔

ما أسفل من ذلك ''ما موصولة وبعض الصلة محذوف أي ماكان أسفل من الكعبين'' کپڑے کا جو حصہ ٹخنوں سے نیچے ہوگا وہ جہنم میں ہوگا۔

علامہ خطابیؒ فرماتے ہیں: کپڑے سے پہننے والے کے بدن سے کنایہ ہے یعنی ٹخنوں سے نیچے قدموں کا وہ حصہ جہاں تک کپڑا لٹکے گا وہ جہنم میں ہوگا، پس یہ تسمیۃ الشیٔ باسم مجاورتہ کی قبیل سے ہے۔

یا پھر من الکعبین میں ''من'' سببیہ ہے اور مطلب یہ ہے اپنے ٹخنوں کے سبب آدمی جہنم میں جائے گا یا یہ کہ اس کے اس کو اہلِ نار کے افعال میں شمار کیا جائے گا۔

علامہ باجیؒ فرماتے ہیں: أنه لباس يوصل إلى النار.

مَا جَاءَ فِيْ إِسْبَالِ الْمَرْأَةِ ثَوْبَهَا

عَنْ أَبِيْ بَكْرِ بْنِ نَافِعٍ عَنْ أَبِيْهِ نَافِعٍ مَوْلَى ابْنِ عُمَرَ عَنْ صَفِيَّةَ بِنْتِ أَبِيْ عُبَيْدٍ أَنَّهَا أَخْبَرَتْهُ عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهَا قَالَتْ حِيْنَ ذُكِرَ الْإِزَارُ فَالْمَرْأَةُ يَا رَسُوْلَ اللهِ قَالَ تُرْخِيْهِ شِبْرًا قَالَتْ أُمُّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا إِذًا يَنْكَشِفُ عَنْهَا قَالَ فَذِرَاعًا لَا تَزِيْدُ عَلَيْهِ.

ترجمہ: صفیہ بنتِ ابوعبید خبر دیتی ہیں کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسبالِ ازار کا

ذکر فرمایا تو آپ صلی اللہ علیہ کی زوجہ مطہرہ حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا نے دریافت کیا کہ عورت کے لیے کیا حکم ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ اپنے کپڑے کو ایک بالشت تک لٹکائے، امِّ سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: پھر اگر کھل جائے؟ فرمایا: ایک زراع، اس سے زائد نہ کرے۔

تشریح: اس بات پر تمام علماء کا اتفاق ہے، گزشتہ باب میں ذکر کردہ وعیدیں صرف مردوں کے حق میں ہیں، علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ عورتوں کے لیے اسبال کے جواز پر علماء کا اتفاق ہے اور اس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا کے سوال کا منشاء یہ تھا کہ ٹخنوں سے نیچے کپڑا لٹکانے کی جو وعید ہے صرف مردوں کے بارے میں ہے یا عورتیں بھی اس میں داخل ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح مردوں کی تین حالتیں ہیں: (۱) حالت استحباب کہ ازار کو نصف ساق تک رکھنا (۲) حالتِ جواز ٹخنوں سے اوپر تک رکھنا (۳) ممنوع ٹخنوں سے نیچے لٹکانا، اسی طرح عورتوں کے لیے دو حالتیں ہیں: (۱) حالت استحباب وہ یہ ہے کہ عورتوں کے لیے مردوں کی حالت استحباب سے ایک بالشت زائد کپڑا وغیرہ لٹکانا مستحب ہے (۲) حالتِ جواز ہے کہ ایک ذراع کی مقدار کپڑے کو لٹکائے اور اس سے بھی زائد مقدار کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے؛ کیونکہ اس میں اسراف ہے، نیز نجاست وغیرہ سے ملوث ہونے کا اندیشہ ہے، ممکن ہے آج کل مروج برقعوں کی لمبی لمبی آستینیں اور زمین پر گھسٹتے ہوئے ان کے دامن اسبالِ مرأۃ کا مصداق ہوں۔

مَا جَاءَ فِي الْاِنْتِعَالِ

(جوتا پہننے کا بیان)

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يَمْشِيَنَّ أَحَدُكُمْ فِي نَعْلٍ وَّاحِدَةٍ لِيَنْتَعِلْهُمَا جَمِيعًا أَوْ لِيَخْلَعْهُمَا جَمِيعًا.

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی ایک جوتے میں نہ چلے یا تو دونوں پہنے یا دونوں کو اُتار دے۔

تشریح: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں اشیاء کی حرمت وحلت کو بیان فرمایا ہے وہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ آدابِ زندگی بھی سکھلائے ہیں جن کی پیروی کرنے سے انسان تہذیب وشائستگی کا پیکر بن سکتا ہے، انہیں آداب میں سے ایک ادب یہ ہے کہ انسان کو جوتے چپل کا استعمال کرنا چاہیے اور جب جوتا پہنے تو دونوں پیروں میں پہنے، ایک پیر میں جوتا پہن کر چلنا ممنوع ہے۔

ایک پیر میں پہننا اور دوسرے میں نہ پہننا اور پھر اسی حالت میں چلنا پھرنا وقار کے خلاف ہے اور چلنے میں مشقت بھی ہے؛ کیونکہ دونوں قدموں میں اونچ نیچ ہونے کی وجہ سے جسمانی توازن برقرار نہیں رہتا جو باعثِ تکلیف ہوسکتا ہے، بعض علماء نے ممانعت کی وجہ یہ بتائی ہے کہ یہ شیطان کی چال ہے، بعض نے کہا بعید عن الاعتدال ہونے کی وجہ سے ممنوع ہے اور کچھ کی رائے یہ ہے کہ اس طرح چلنا وجہِ شہرت وامتیاز ہے، اس طرح چلنے سے لوگوں کی نگاہیں اُٹھیں گی اور حدیث میں لباسِ شہرت سے منع فرمایا ہے۔

تعارض: ترمذی کی روایت میں ہے: "ربما مشى النبي صلى الله عليه وسلم في نعل واحدة" آپ صلی اللہ علیہ وسلم بسا اوقات ایک چپل پہن کر چلتے تھے، یہ حدیث، حدیثِ باب سے متعارض ہے۔

جواب: (۱) عمومی احوال میں ممانعت ہے اور خصوصی حالات میں اجازت ہے، مثلاً چلتے ہوئے تسمہ وغیرہ ٹوٹ جائے تو اسے اُتار کر ہاتھ میں لے کر ایک چپل میں چلتے ہوئے ٹھیک کر سکتے ہیں (۲) ایک چپل ایک کنارے اور دوسری دوسرے کنارے پر ہے تو اس کے پاس جانے کے لیے ایک چپل پہنے ہوئے چل سکتے ہیں (۳) حدیثِ باب قولی ہے جو اصل ضابطہ ہے اور دوسری روایت فعلی ہے جو بیانِ جواز اور عذر پر محمول ہے۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ تَعَالىٰ عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ

إِذَا انْتَعَلَ أَحَدُكُمْ فَلْيَبْدَأْ بِيَمِينِهِ فَإِذَا نَزَعَ فَلْيَبْدَأْ بِشِمَالِهِ وَلْتَكُنِ الْيُمْنٰى أَوَّلَهُمَا تُنْعَلُ وَاٰخِرَهُمَا تُنْزَعُ.

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کوئی جوتا پہنے تو دائیں جانب سے شروع کرے اور جب اُتارے تو بائیں جانب سے شروع کرے؛ تاکہ پہنتے وقت دایاں پیر مقدم رہے اور اُتارے وقت دایاں پیر مؤخر رہے۔

تشریح: جوتا چپل پہنتے وقت مسنون یہ ہے کہ دائیں پیر میں پہنا جائے اور پھر بائیں پیر میں اور اُتارتے وقت اس کے برعکس کیا جائے، یہی آپ کا عمل تھا اور اسی کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی ہے۔

إذا انتعل أحدكم فليبدأ باليمنىٰ: جوتا پہنتے وقت دایاں پیر مقدم ہو اور اُتارتے وقت دایاں پیر مؤخر ہو؛ تاکہ بائیں کی بہ نسبت دایاں پیر جوتے میں زیادہ دیر تک رہے، گویا یہ دائیں پیر کے احترام اور اعزاز کا طریقہ ہے، ہر جگہ دائیں کی تکریم ہی مقصود ہوتی ہے؛ کیونکہ ضابطہ ہے ہر فضیلت والے کام کو دائیں سے شروع کرنا مستحب ہے اور بغیر عظمت والے کام کو بائیں سے شروع کرنا چاہیے۔

تنعل: بزنة المجهول وهو خبر كان.

عَنْ كَعْبِ الْأَحْبَارِ رَضِيَ اللهُ تَعَالىٰ عَنْهُ أَنَّ رَجُلًا نَزَعَ نَعْلَيْهِ فَقَالَ لِمَ خَلَعْتَ نَعْلَيْكَ لَعَلَّكَ تَأَوَّلْتَ هٰذِهِ الْاٰيَةَ ﴿فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى﴾ ثُمَّ قَالَ كَعْبٌ أَتَدْرِيْ مَا كَانَتْ نَعْلَا مُوْسىٰ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ مَالِكٌ لَا أَدْرِيْ مَا أَجَابَهُ الرَّجُلُ فَقَالَ كَعْبٌ كَانَتَا مِنْ جِلْدِ حِمَارٍ مَيِّتٍ.

ترجمہ: حضرت کعب احبارؒ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے اپنے جوتے اُتارے تو حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا کہ تو نے اپنے جوتوں کو کیوں اُتارا ہے؟ شاید تو نے قرآن کی آیت ﴿فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ (الاٰية)﴾ کی تاویل کی ہے، پھر فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جوتے کس چیز کے تھے؟ امام مالکؒ

کہتے ہیں مجھے یہ معلوم نہیں کہ اس آدمی نے کیا جواب دیا؟ (البتہ) حضرت نے خود فرمایا: وہ مردار گدھے کی کھال کے تھے۔

تشریح: کعبِ احبارؒ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ مسجد میں داخل ہونے کے لیے اپنے جوتے اُتار رہا ہے، انہوں نے اس سے معلوم کیا کہ تو جوتے کیوں اُتار رہا ہے؟ شاید تو نے سورۂ طٰہٰ کی آیت کو دلیل بنایا ہے کہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام جب وادیِ طویٰ میں تشریف لے گئے تو اللہ نے انہیں جوتے اُتارنے کا حکم دیا تو نے بھی یہ خیال کیا کہ میں اللہ کے گھر میں داخل ہو رہا ہوں، مجھے بھی جوتے اُتارنے چاہئیں، جبکہ موسیٰ علیہ السلام سے جوتے اُتارنے کا حکم بطورِ تقدیس مقام کے نہیں تھا؛ بلکہ اس لیے تھا کہ ان کے جوتے مردار گدھے کی کھال کے بنے ہوئے تھے اور تیرے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہے۔

لم خنعت نعليك: علامہ باجیؒ کہتے ہیں: دراصل کعبِ احبار کا یہ سوال اس کے فعل پر نکیر کرنے کے لیے تھا؛ کیونکہ ممکن ہے کہ اس شخص کا خیال یہ ہو کہ مسجد یا حرم میں داخل ہونے کے لیے اور تصحیح صلاۃ کے لیے خلعِ نعل ضروری ہے؛ اس لیے بطورِ سوال انکار کیا؛ کیونکہ مسجد وغیرہ میں داخل ہونے اور نماز کے صحیح ہونے کے لیے جوتوں کا اتارنا ضروری نہیں، بشرطیکہ ان پر کوئی نجاست لگی ہوئی نہ ہو، تاہم ادب یہی ہے کہ جوتوں کو اُتار دیا جائے۔ (المنتقی ۹:)

كانتا من جلد حمار ميت: حضرت کعبِ احبارؒ قتادہ، عکرمہ وغیرہ کچھ حضرات کا خیال یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو خلعِ نعلین کا حکم اس لیے دیا گیا تھا کہ ان کے نعلین مردار گدھے کی خال کے تھے؛ چنانچہ حکم ہوا کہ ناپاک جوتوں کو اُتار دو؛ تاکہ نجس جوتوں سے ارضِ مقدس نہ روندی جائے۔

اور حسن بن ابی الحسن بصری اور مجاہد رحمہم اللہ فرماتے ہیں: خلعِ نعلین کا حکم اس لیے دیا گیا تھا؛ تاکہ ان کے قدم ارضِ مقدسہ اور مبارکہ کے فیوضات کو حاصل کر لیں۔

بعض لوگوں نے کہا کہ برہنہ پائی میں تواضع ہے؛ اسی لیے اسلاف کی عادت ننگے پیر طوافِ کعبہ کرنے کی رہی ہے۔

مَا جَاءَ فِيْ لُبْسِ الثِّيَابِ

(کپڑوں کو پہننے کی کیفیت اور کپڑوں کی اقسام کا بیان)

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ أَنَّهُ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ لِبْسَتَيْنِ وَعَنْ بَيْعَتَيْنِ عَنِ الْمُلَامَسَةِ وَعَنِ الْمُنَابَذَةِ وَعَنْ أَنْ يَحْتَبِيَ الرَّجُلُ فِيْ ثَوْبٍ وَّاحِدٍ لَيْسَ عَلٰى فَرْجِهِ مِنْهُ شَيْئٌ وَعَنْ أَنْ يَشْتَمِلَ الرَّجُلُ بِالثَّوْبِ الْوَاحِدِ عَلٰى أَحَدِ شِقَّيْهِ.

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے کپڑا پہننے کی دو ہیئتوں سے اور دو طرح کی بیعوں سے (آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا) بیعِ ملامسہ سے اور بیع منابذہ سے اور منع فرمایا کہ آدمی اس طرح ایک کپڑے میں گوٹ مار کر بیٹھے کہ اس کے موضعِ سطر پر کپڑے کا کوئی حصہ نہ ہو اور اس بات سے منع فرمایا ہے کہ آدمی اپنے ایک پہلو پر ایک کپڑا لپیٹ لے (دوسرا پہلو کھلا رہے)۔

تشریح: حدیث شریف میں لف ونشر غیر مرتب ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے کپڑا پہننے کی دو ہیئتوں سے منع فرمایا اور پھر دو قسم کی بیعوں سے روکا؛ لیکن تفصیل کرتے ہوئے بیعوں کی تفصیل اوّلاً بیان کی، پھر ہیئتِ لباس کو ذکر فرمایا۔

نھی عن بیع الملامسۃ: لامس ملامسۃ ایک دوسرے کو چھونا، ملامسہ جاہلیت میں مروج ایک بیع تھی جس کی تفسیر حدیث شریف میں یہ بیان کی گئی: أن یلمس کل واحد منھا ثوب صاحبہ بغیر تأمل، وفي الھدایۃ یتساومان فإذا لمسھا المشتري... لزم البیع.

یعنی دو شخص آپس میں بھاؤ تاؤ کر رہے تھے، اسی دوران ان میں سے ایک نے دوسرے کے سامان کو چھولیا تو بیع لازم ہوگئی، خواہ رضامندی ہو یا نہ ہو، اسلام نے اس

طرح کی بیعوں سے منع فرمایا ہے؛ کیونکہ ان میں غرر ودھوکہ ہے، اور صحتِ بیع کی اہم شرط رضامندی مفقود ہے۔

وعن بيع المنابذة: نابذة منابذة پھینکنا، یہ بھی جاہلیت کی ایک بیع ہے، جس کی حدیث شریف میں صورت یہ بیان کی گئی: المنابذة أن ينبذ كل واحد منهما ثوبه إلى الأخر وإن لم ينظر أحدهما إلى ثوب صاحبه. یعنی بھاؤ کے دوران ہی سامان ایک دوسرے کی جانب پھینک دیا جائے تو بیع لازم ہوجاتی تھی، اس کے ممنوع ہونے کی علت بھی غرر وعدمِ رضا ہے۔

وعن أن يحتبي الرجل في ثوب واحد: احتباء حبوابنا کر بیٹھنا اس کی شکل یہ ہے کہ انسان سرین کے بل بیٹھے اور اپنے گھٹنوں کو کھڑا کر کے چاروں طرف سے کوئی کپڑا لپیٹ لے، جبکہ شرم گاہ پر کوئی مستقل کپڑا نہ ہو تو چونکہ اس میں انکشافِ عورت کا اندیشہ ہے؛ اس لیے اس کو ممنوع قرار دیا گیا ہے؛ البتہ حافظ ابنِ حجرؒ فرماتے ہیں کہ اس کا تقاضہ یہ ہے کہ اگر شرم گاہ کو چھپانے کا مستقل اہتمام کیا جائے تو پھر یہ صورت ممنوع نہ ہوگی۔ (فتح الباری)

وعن استمل الرجل بالثواب الواحد: اشتمل بالثوب کے معنیٰ کپڑے میں لپٹ جانا، اس کی دو تفسیریں بیان کی جاتی ہیں: (۱) ایک کپڑے کو بدن پر اس طرح لپیٹ لینا کہ دونوں ہاتھ اندر بند ہوجائیں؛ چونکہ اس صورت میں انسان بعض اوقات ٹھوکر وغیرہ کی وجہ سے مشقت میں پڑسکتا ہے؛ اس لیے یہ صورت مکروہ ہوگی۔

(۲) تہبند وغیرہ باندھنا اور اس کا ایک کونہ اٹھا کر کندھے پر ڈالنا جس سے انکشافِ عورت ہوجائے، اشتمال کی یہ صورت حرام ہوگی۔ (نعمت المنعم: ۲/ ۱۸)

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ تَعَالىٰ عَنْهُمَا أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللهُ تَعَالىٰ عَنْهُ رَأىٰ حُلَّةً سِيَرَاءَ تُبَاعُ عِنْدَ بَابِ الْمَسْجِدِ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللهِ لَوِ اشْتَرَيْتَ هٰذِهِ الْحُلَّةَ فَلَبِسْتَهَا يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَلِلْوَفْدِ إِذَا قَدِمُوْا عَلَيْكَ فَقَالَ

رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّمَا يَلْبَسُ هٰذِهٖ مَنْ لَّا خَلَاقَ لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ ثُمَّ جَاءَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْهَا حُلَلٌ فَأَعْطٰى عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ مِنْهَا حُلَّةً فَقَالَ عُمَرُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ أَكَسَوْتَنِيْهَا وَقَدْ قُلْتَ فِيْ حُلَّةِ عُطَارِدٍ مَا قُلْتَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ أَكْسُكَهَا لِتَلْبِسَهَا فَكَسَاهَا عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ أَخًا لَهٗ مُشْرِكًا بِمَكَّةَ.

ترجمہ: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے مسجد کے دروازہ کے پاس ایک ریشمی جوڑا بکتے ہوئے دیکھا تو عرض کیا یارسول اللہ! کتنا بہتر ہوگا اگر آپ اس جوڑے کو خرید لیں اور جمعہ کے دن اور وفود کی آمد کے وقت اسے زیب تن فرمالیا کریں، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ لباس وہ شخص پہنتا ہے جس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اسی قسم کے کچھ جوڑے آئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں سے ایک جوڑا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو عطا فرمایا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے (اسی طرح کا) جوڑا عطا کر رہے ہیں؛ حالانکہ آپ نے حلۂ عطارد کے بارے میں ایسا ایسا کہا تھا (یعنی آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً فرمایا: میں تمہیں یہ اس لیے عطا نہیں کر رہا کہ تم خود اسے پہنو، پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے مکہ کے اپنے مشرک بھائی کو دے دیا۔

حلة سيرا قال أبوعبيد... الحلة إزار ورداء: حلہ ایک لنگی اور چادر کو کہتے ہیں جسے اُردو میں جوڑا کہتے ہیں۔

سيرا بكسر السين وفتح الياء قال الأصمعي: ثياب فيها خطوط من حرير أوقز وقال الخليل: ثوب مضلع بالحرير وعن سبويه هو الحرير الصافي. یعنی سیرا اس کپڑے کو کہتے ہیں جو یا تو خالص ریشم کا ہو یا اس میں ریشم کی

دھاریاں ہوں؛ اسی لیے اس کے پہننے والے کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا خلاق له في الآخرة علامہ زرقانی فرماتے ہیں: یہ بطورِ غضب فرمایا ہے؛ ورنہ تو مؤمن گناہ گار ہی کیوں نہ ہو اس کا دخول جنت میں ضرور ہوگا۔

کسوتنیها وقد قلت في حلة... یعنی پہلے جب میں نے اسی قسم کے جوڑے خریدنے کے بارے میں عرض کیا تھا، تو آپ نے وعید سنائی تھی اور اب اسی قسم کا جوڑا مجھے عطا کر رہے ہیں (ممکن ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس لیے معلوم کیا ہو کہ ہوسکتا ہے اب حکم بدل گیا ہو)؛ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا حکم وہی ہے اور میں جو تمہیں دے رہا ہوں، یہ تمہارے استعمال کے لیے نہیں، جب حضرت نے یہ بات سنی تو اپنے ایک ماں شریک مشرک بھائی جو مکہ میں رہتا تھا اسے دے دیا۔

حدیث سے معلوم ہوتا ہے تقریبات وغیرہ کے لیے اپنی وسعت کے مطابق الگ الگ جوڑے بنانا جائز ہے؛ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نکیر کپڑے کے ریشمی ہونے کی وجہ سے تھی نہ کہ عمر رضی اللہ عنہ کے خریدنے کا مشورہ دینے پر۔

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ رَأَيْتُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ وَهُوَ يَوْمَئِذٍ أَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْمَدِيْنَةِ وَقَدْ رَقَّعَ بَيْنَ كَتِفَيْهِ بِرُقَعٍ ثَلَاثٍ لَبَّدَ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ.

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؒ فرماتے ہیں: میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا جس زمانہ میں وہ امیر المؤمنین تھے کہ ان کے کندھوں کے درمیان تین پیوند لگے ہوئے تھے جن میں بعض بعض کے اوپر ملصق تھے۔

تشریح: اس روایت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دنیا اور اس کی لذات سے بے رغبتی کی ایک جھلک ہے یعنی ایک ایسا شخص جو آدھی دنیا کا بادشاہ ہے؛ لیکن اس کے لباس کا عالم یہ ہے کہ اس میں کبھی تین پیوند ہوتے ہیں اور کبھی ان کی مقدار بائیس (۲۲) تیئس (۲۳) تک پہنچ جاتی تھی اور پیوند بھی ایسی جگہ لگے ہوئے تھے جہاں سب کی نظریں پڑتی ہیں، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو عزت اور

شان عطا فرمائی ہے، وہ شاندار کپڑوں اور عالی مکانات کی وجہ سے نہیں؛ بلکہ اسلام کی وجہ سے ہے۔

لہٰذا مؤمن کے لیے بہتر یہ ہے کہ سادہ اور تواضع کی زندگی گزارے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: من ترك ثوب جمال، وهو يقدر عليه، وفي رواية تواضعًا، كساه الله حلة الكرامة. (الحديث)

لغات: رُقَعٌ واحد رقعة، رقع الثوب اصلحه: کپڑے کو درست کرنا۔ لبد تلبیداً: چپکانا، پیوند لگانا۔

صِفَةُ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

(نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حسن و جمال کا ذکر)

اللہ رب العزت نے اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حسنِ سیرت کے جملہ اوصاف کے ساتھ لازوال اور لاثانی حسنِ صورت سے بھی نواز کر دنیا میں بھیجا تھا جس طرح آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا حسنِ سیرت سراپا معجزہ ہے، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حسن و جمال بھی آپ کا عظیم معجزہ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسا دنیا میں نہ کبھی آیا ہے اور نہ کبھی آئے گا؛ کیونکہ سیرت اور صورت دونوں کا حسن آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکا؛ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ پر ایمان کے ساتھ ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حسنِ جمال پر بھی ایمان لانا ضروری ہے، جیسا کہ امام جلال الدین سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ اس بات پر ایمان ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وجودِ اقدس وحسن وجمال میں بے نظر و بے مثال تخلیق فرمایا ہے، یوں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جمال جہاں آرا کو کماحقہٗ بیان کرنا ناممکن اور نورِ مجسم کی تصویر کشی محال ہے؛ لیکن اپنی ہمت اور وسعت کے موافق صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کو ضبط فرمایا ہے جس کا بیان باب کی حدیث میں ہے۔

عَنْ رَبِيعَةَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّهُ سَمِعَهُ يَقُوْلُ كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ بِالطَّوِيْلِ الْبَائِنِ وَلَا بِالْقَصِيْرِ وَلَيْسَ بِالْأَبْيَضِ الْأَمْهَقِ وَلَا بِالْآدَمِ وَلَيْسَ بِالْجَعْدِ الْقَطِطِ وَلَا بِالسَّبْطِ بَعَثَهُ اللهُ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى رَأْسِ أَرْبَعِيْنَ سَنَةً فَأَقَامَ بِمَكَّةَ عَشْرَ

سِنِيْنَ وَبِالْمَدِيْنَةِ عَشْرَ سِنِيْنَ وَتَوَفَّاهُ اللّٰهُ عَلٰى رَأْسِ سِتِّيْنَ سَنَةً وَلَيْسَ فِيْ رَأْسِهٖ وَلِحْيَتِهٖ عِشْرُوْنَ شَعْرَةً بَيْضَاءَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ بہت لمبے قدم کے تھے اور نہ پستہ قد تھے (جسے ٹھگنا کہتے ہیں؛ بلکہ میانہ قدر کھتے تھے) اور رنگ کے اعتبار سے نہ بالکل سفید تھے چونے کی طرح اور نہ بالکل گندمی کہ سانولہ پن آجائے (بلکہ چودھویں رات کے چاند سے زیادہ روشن پُرنور اور ملاحت لیے ہوتے تھے) آپ کے بال نہ بالکل پیچدار اور گھنگھریالے تھے اور نہ بالکل سیدھے (بلکہ ہلکی سی پیچیدگی اور گھنگھریالا پن تھا چالیس برس کی عمر ہونے پر اللہ نے آپ کو نبی بنایا اور پھر دس برس آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ رہے اور دس سال مدینہ میں رہے اور پھر ساٹھ سال کی عمر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصال فرمایا اس وقت آپ کے سر اور ڈاڑھی میں بیس بال بھی سفید نہ تھے۔

تشریح: اس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قیامِ مکہ کی مدت دس سال مذکور ہے جبکہ دوسری روایات میں ۱۳ ر سال ہے، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت عمر مبارک اکثر روایات کے مطابق ۶۳ ر سال تھی اور اس روایت میں ساٹھ سال ہے۔

اس کا سہل جواب یہ ہے کہ دونوں مقام پر صرف دہائیوں کو ذکر کیا گیا ہے کسر کو چھوڑ دیا گیا ہے۔

لغات: طویل (ج) طوال صیغہ صفت: لمبا، طویل۔ البائن صیغۂ صفت (ض) ظاہر ہونا۔ القصیر (ج) قصار صیغہ صفت (ک) پستہ قد ہونا۔ الأبیض (ج) بیض صیغۂ صفت (ض) سفید ہونا الامهق (ج) مُهْق صیغۂ صفت (س) چونے کی طرح سفید ہونا۔ الجعد صیغہ صفت (ج) جعاد (ک) بالوں کا گھنگھریالا ہونا۔ ادام (ج) أُدْمٌ صیغہ صیغۂ صفت (س،ک) سانولا ہونا، گندمی رنگ کا ہونا۔ الْقَطَطُ (ج) اقطاطا

قِطاط (س) بالوں کا بہت زیادہ گھنگھریالا ہونا۔ السبط (ج) سِباط (س،ک) بالوں کا بالکل سیدھا ہونا۔

صِفَةُ عِيْسىٰ بْنِ مَرْيَمَ

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ قَالَ أَرَانِي اللَّيْلَةَ عِنْدَ الْكَعْبَةِ فَرَأَيْتُ رَجُلًا اٰدَمَ كَأَحْسَنِ مَا أَنْتَ رَاءٍ مِنْ أُدُمِ الرِّجَالِ لَهُ لِمَّةٌ كَأَحْسَنِ مَا أَنْتَ رَاءٍ مِنَ اللِّمَمِ قَدْ رَجَّلَهَا وَهِيَ تَقْطُرُ مَاءً مُتَّكِئًا عَلىٰ رَجُلَيْنِ أَوْ عَلىٰ عَوَاتِقِ رَجُلَيْنِ يَطُوْفُ بِالْكَعْبَةِ فَسَأَلْتُ مَنْ هٰذَا فَقِيْلَ لِيْ هٰذَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ثُمَّ إِذَا أَنَا بِرَجُلٍ جَعْدٍ قَطِطٍ أَعْوَرَ الْعَيْنِ الْيُمْنىٰ كَأَنَّهَا عِنَبَةٌ طَافِيَةٌ فَسَأَلْتُ مَنْ هٰذَا فَقِيْلَ لِيْ هٰذَا الْمَسِيْحُ الدَّجَّالُ.

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مجھے ایک رات دکھلایا گیا کہ میں کعبۃ اللہ کے پاس ہوں، میں نے ایک گندمی رنگت والے آدمی کو دیکھا، تم نے جتنے گندمی رنگت والے دیکھے ہیں، ان میں سب سے زیادہ حسین، ان کے لمبے بال تھے، تم نے جتنے لمبے بال والے دیکھے ہیں ان میں سب سے زیادہ خوبصورت انہوں نے اپنے بالوں میں کنگھی کر رکھی تھی اور ان سے قطرہ قطرہ پانی ٹپک رہا تھا، دو آدمیوں کے سہارے یا ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے بیت اللہ کا طواف کر رہے تھے، میں نے پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ مسیح ابنِ مریم ہیں، پھر میں نے ایک آدمی کو دیکھا سخت گھنگھریالے بال دائیں آنکھ سے کانا، گویا اس کی آنکھ پھولے ہوئے انگور کی مانند تھی، میں نے معلوم کیا یہ کون ہے؟ کہا گیا یہ مسیح الدجال ہے۔

تشریح: ایک شب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دجال دونوں کو دیکھا، یہ رویت خواب میں ہوئی یا بیداری میں دونوں کا احتمال ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دجال کو دکھائے جانے کا مقصد یہ ہے؛ تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اوصاف، حلیہ، اُن کے نزول اور دجال کے خروج کی صحیح طور پر نشان دہی کر سکیں؛ کیونکہ قربِ قیامت میں دونوں کے درمیان جنگ ہوگی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے متبعین فتح یاب ہوں گے اور دجال اور اس کی ذریت کو اللہ ہلاک فرمادیں گے اور آخرت میں اس کو جہنم کا ایندھن بنا دیا جائے گا۔

عیسیٰ علیہ السلام کو مسیح کہنے کی وجہ:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مسیح اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ مریض کو مسح کرتے تھے اور صحت یاب ہوجاتا تھا یا خود عیسیٰ علیہ السلام پیدائش کے وقت برکت سے مسح کیے گئے تھے، جس کی وجہ سے وہ شیطان سے محفوظ رہے اور دجال کو مسیح کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی ایک آنکھ بالکل ممسوح یعنی سپاٹ ہے یا پھر اس لیے کہ ساری دنیا کی زمین کو مسح کرے گا یعنی اس کا چکر لگائے گا۔

لغات: عنبة طافية، عنبة انگور اور طافية کے ایک معنیٰ ہیں پھولی ہوئی اور دوسرے معنیٰ ذهب ضوءها یعنی جس کی روشنی ختم ہوجائے۔

آدم بمد الهمزة: اسم گندمی رنگ والا جمعه أُدْمٌ.

لمة: شعر جاوز سحمة الأذنين وہ بال جمع کانوں کی لو سے متجاوز اور کندھوں سے اوپر اوپر تک ہوں جمع لِمَمْ.

قطر (ن) قطرًا ٹپکنا۔

عواتق عاتقة کی جمع کندھا، شانہ۔

أعور: نابینا، قليل البصر أو فاقده، أومن ذهب بصر إحدي عينيه جمعه عُورٌ.

مَا جَاءَ فِي الْفِطْرَةِ

الْفِطْرَةُ: بکسر الفاء وسکون الطاء کے معنیٰ سنتِ قدیمہ کے ہیں جس کو انبیاء نے اختیار کیا ہے اور تمام شرائع جس پر متفق ہیں، گویا کہ وہ اسی فطری امر پر پیدا کیے گئے تھے۔(زرقانی)

شیخ نے بذل میں فرمایا کہ فطرۃ سے مراد وہ سنن انبیاء ہیں جن کی اقتداء کا حکم دیا گیا ہے، گویا ہم انہیں سنن پر پیدا کیے گئے ہیں، یا فطرت سے مراد دین ہے کما قال تعالیٰ: فِطْرَةَ اللهِ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا یعنی وہ دین جس پر اللہ نے پہلے انسان کو پیدا کیا۔

حافظ ابنِ حجرؒ فرماتے ہیں: اُمورِ فطرت سے متعلق احادیث میں بہت سے مصالح دینی اور دنیوی مخفی ہیں، مثلاً ہیئت وحالت کو سنوارنا، مکمل طریقہ سے بدن کی صفائی، دونوں طہارتوں کے وقت احتیاط، اسی طرح ان کریہہ بوؤں کو دُور کرنا جن سے لوگوں کو کوفت ہوتی ہے اور یہ سب وہ اُمور ہیں جن کو انسان فطری تقاضہ کے طور پر اختیار کرتا ہے، نیز ان اُمورِ فطرت کا مقصد شعائر کفار ونصاریٰ کی مخالفت اور اُمورِ شریعت کی مکمل پابندی ہے۔

اسی لیے اُمورِ فطرت میں سے بعض چیزیں وہ ہیں جن کو اگر تمام شہر والے چھوڑنے پر متفق ہو جائیں تو ان سے قتال کیا جائے گا۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ خَمْسٌ مِنَ الْفِطْرَةِ تَقْلِيمُ الْأَظْفَارِ وَقَصُّ الشَّارِبِ وَنَتْفُ الْإِبِطِ وَحَلْقُ الْعَانَةِ وَالْاِخْتِتَانِ.

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: پانچ چیزیں فطرت کے قبیل سے ہیں: ناخون کاٹنا، مونچھ کاٹنا، بغل کے بال اکھاڑنا، زیرِ ناف بال مونڈنا اور ختنہ کرنا۔

تشریح: اس حدیث میں پانچ اُمورِ فطرت ذکر کیے گئے ہیں جبکہ ابوداؤد وغیرہ کی روایت میں اس کے علاوہ کا بھی ذکر ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حصر مقصود نہیں ہے؛

بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض مواقع پر پانچ اور بعض موقعوں پر دس اور اس سے زیادہ کو بھی بیان فرمایا ہے۔

(۱) تقلیم الاظفار: ناخون کاٹنا، ناخون کاٹنے کو اُمورِ فطرت میں سے شمار کیا گیا ہے؛ کیونکہ بسا اوقات کھیت وغیرہ میں کام کرتے ہوئے ان میں مٹی لگ جاتی ہے اور ناخنوں کے بڑے ہونے کی صورت میں ان کی صفائی میں دشواری ہوتی ہے، کبھی تو اس کی وجہ سے کھال تک پانی پہنچنا بھی مشکل ہوجاتا ہے، لہٰذا ناخن کاٹنے سے صفائی ستھرائی بھی رہے گی، نیز وضو وغسل وغیرہ کے وقت وصولِ ماء میں بھی پریشانی نہیں ہوگی۔

ناخون کاٹنے کا طریقہ:

حافظ ابنِ حجرؒ نے فرمایا ناخن کاٹنے کی ترتیب کے بارے میں احادیث میں کوئی تفصیل منقول نہیں ہے، بہت سے طریقے علماء ومحدثین نے اپنی کتابوں میں ذکر کیے ہیں، وہ مشائخ کا طریقہ تو ہوسکتا ہے؛ لیکن سنت نہیں ہے۔

ناخن کاٹنے کا وقت:

طحطاویؒ نے ''مراقی الفلاح'' میں بیان کیا ہے کہ ناخن کاٹنا مونچھ صاف کرنا، اور زیرناف بال مونڈنا، ہفتہ میں ایک بار مستحب ہے اور جمعہ کے دن زیادہ بہتر ہے، اور یہ ممکن نہ ہو تو پندرہ دن میں یہاں تک کہ اگر چالیس دن تک چھوڑے رکھے تو گناہ گار ہوگا جیسا کہ مسلم شریف کی روایت میں بیان کیا گیا ہے: عن أنس قال وقت لنا في قص الشارب وتقليم الأظفار ونتف الإبط وحلق العانة أن لا تترك أكثر من أربعين ليلة. (رواہ مسلم)

(۲) قص الشارب: مونچھ کاٹنا (مونچھ کے بارے میں تفصیلی گفتگو کتاب اصلاح الشعر کے تحت آئے گی)۔

(۳) نتف الإبط: بغل کے بال اکھاڑنا بھی اُمورِ فطرت میں سے ہے؛ کیونکہ بغل

کے بال جب بڑے ہوجاتے ہیں تو ان میں پسینہ کی وجہ سے بدبو پیدا ہوجاتی ہے۔
بغل کے بال اکھاڑے جائیں یا تحلیق بھی کافی ہے؟ تو اس سلسلہ میں علامہ ابنِ دقیق العیدؒ فرماتے ہیں جن لوگوں نے لفظ کا خیال رکھا، انہوں نے اکھاڑنے کو سنت قرار دیا اور جن علماء نے معنیٰ پر غور کیا انہوں نے ہر اس چیز کی اجازت دی ہے جو بالوں کو زائل کرسکے، پس اگر پاؤڈر وغیرہ کے ذریعہ بھی بال صاف کردیے جائیں تو سنت ادا ہوجائے گی؛ چنانچہ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: اکھاڑنا اصل سنت ہے، تاہم دوسری چیزوں سے بھی سنت ادا ہوجائے گی؛ لیکن حدیث شریف میں جو اکھاڑنے کا حکم دیا گیا ہے اس میں حکمت یہ ہے کہ بغل کے اندر پسینہ کی وجہ سے بدبو پیدا ہوجاتی ہے؛ چنانچہ جب بال اکھاڑے جائیں گے تو اس کے مسامات کمزور ہوجاتے ہیں جبکہ حلق کرنے میں بال مضبوط ہوجاتے ہیں اور ان میں مزید بدبو پیدا ہوجاتی ہے، نیز بغل کی کھال کی کمزوری ہوتی ہے جہاں استرا چلانے میں زخم لگنے کا خطرہ ہے۔

(۴) وحلق العانة: زیر ناف بال صاف کرنا، طحطاویؒ نے مراقی الفلاح میں فرمایا ہے: عانة وہ بال ہیں جو مرد کے ذکر کے اوپر اور اس کے اِردگرد ہوتے ہیں، اسی طرح عورت کی شرم گاہ کے اِردگرد کے بال بھی اس میں شامل ہیں اور رہے دبر کے اِردگرد کے بال، تو ان کو صاف کرنا بھی مستحب ہے؛ کیونکہ ممکن ہے کہ نکلنے والی نجاست بالوں میں لگ جائے جو استنجاء سے صاف نہ ہوسکے، امام نوویؒ فرماتے ہیں مرد اور عورت دونوں کے لیے زیر ناف بالوں کو استرے سے صاف کرنا سنت ہے؛ لیکن دوسری جگہ فرمایا مرد کے لیے تو حلق بہتر ہے اور عورت کے لیے بال اکھاڑنا، تاہم اگر کسی بھی مزیل شعر چیز کو استعمال کرلے تو سنت ادا ہوجائے گی۔

(۵) والإختتان والختن قطع بعض مخصوص من عضو مخصوص.
مرد کا ختنہ یہ ہے کہ اس کھال کو کاٹ دیا جائے جس میں حشفہ چھپا ہوا ہوتا ہے، اور عورت کا ختنہ یہ ہے کہ اس کھال کو کاٹ دینا جو گھنڈی کی طرح فرج کے اوپری حصہ میں ہوتی ہے؛

لیکن مرد کے حشفہ کے اوپر کی پوری کھال کاٹی جائے گی جبکہ عورت کی تھوڑی سی کاٹی جائے گی۔

ختنہ کرنے کا حکم:

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ امام شافعیؒ اور اکثر علماء کے نزدیک ختنہ کرانا مرد اور عورت دونوں کے لیے واجب ہے، المغنی میں ہے مردوں کے لیے ختنہ کرنا واجب ہے اور عورتوں کے لیے بہتر ہے، امام محمدؒ فرماتے ہیں: مردوں کے لیے حکم زیادہ سخت ہے، عورتوں کے مقابلہ میں۔

امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ختنہ کرنا واجب نہیں؛ بلکہ سنت ہے، درمختار میں علامہ حصکفیؒ نے فرمایا: ختنہ سنت ہے اور اس کو شعائرِ اسلام میں سے شمار کیا گیا ہے، لہٰذا اگر کسی شہر کے لوگ ختنہ نہ کرانے پر اتفاق کرلیں تو امام ان سے جنگ کرے گا، اور عورت کے لیے ختنہ کرنا اصح قول کے مطابق سنت نہیں، بس اس میں مردوں کا اکرام ہے؛ کیونکہ اس سے لذت میں اضافہ ہوتا ہے۔

ختنہ کا وقت:

ختنہ کا کوئی خاص اور متعین وقت نہیں ہے، ایک قول کے مطابق دس سال کی عمر میں ہونا چاہیے اور دوسرا قول سات سال کا ہے، حافظ ابنِ حجرؒ نے ماوردیؒ کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ اس کے دو وقت ہیں: ایک وقت وجوب، اور ایک وقتِ استحباب، وقتِ وجوب بلوغت ہے، لہٰذا بالغ ہونے تک ہر حال میں کرالیا جائے، اور وقتِ استحباب اس سے پہلے ہے، اور سب سے بہتر وقت ولادت کے ساتویں دن ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی عذر نہ ہو تو جلد سے جلد کرادینا چاہیے؛ کیونکہ کم سنی میں ختنہ کی مصلحت یہ ہے کہ عمر کے بڑھنے سے کھال سخت ہوتی چلی جاتی ہے، جس کا کاٹنا باعثِ تکلیف ہوسکتا ہے، نیز یہ کہ بڑی عمر میں ختنہ کرنے پر کشفِ عورت ہوتا ہے جو کہ جائز نہیں ہے۔

ختنہ کی حکمت:

ختنہ کی حکمت کے بارے میں علماء کی مختلف آراء ہیں۔

شاہ ولی اللہؒ نے فرمایا کہ حشفہ کی کھال کے اندر میل اور گندگی جمع ہوجاتی ہے اور پیشاب کے وقت استبراء کرنے میں پریشانی ہوتی ہے اور جماع کی لذت کم ہوجاتی ہے۔

علامہ فخر الدین رازیؒ نے فرمایا ہے کہ حشفہ قوی الحس ہوتا ہے، جب تک وہ کھال سے چھپا رہتا ہے اس میں مزید شہوت پیدا ہوتی رہتی ہے اور جب وہ کھال کاٹ دی جاتی ہے تو شہوت کم ہوجاتی ہے، اور شہوت کو کم کرنا ہی شریعت کا مقصود ہے۔

جدید سائنس نے بھی یہ بات وثوق سے کہی ہے کہ ختنہ نہ کرانے کی صورت میں مختلف قسم کی بیماریاں جنم لے سکتی ہیں۔

عَنْ سَعِيْدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ أَنَّهُ قَالَ كَانَ إِبْرَاهِيمُ أَوَّلَ النَّاسِ ضَيَّفَ الضَّيْفَ وَأَوَّلَ النَّاسِ اخْتَتَنَ وَأَوَّلَ النَّاسِ قَصَّ شَارِبَهُ وَأَوَّلَ النَّاسِ رَأَى الشَّيْبَ فَقَالَ يَا رَبِّ مَا هٰذَا فَقَالَ اللهُ تَبَارَكَ وَتَعَالىٰ وَقَارٌ يَا إِبْرَاهِيمُ فَقَالَ رَبِّ زِدْنِيْ وَقَارًا.

قَالَ مَالِكٌؒ: يُؤْخَذُ مِنَ الشَّارِبِ حَتّٰى يَبْدُوَ طَرَفُ الشَّفَةِ وَهُوَ الْإِطَارُ وَلَا يَجُزُّهُ فَيُمَثِّلُ بِنَفْسِهِ.

ترجمہ: سعید بن مسیبؒ فرماتے ہیں ابراہیم علیہ السلام پہلے شخص تھے جنہوں نے مہمان کی ضیافت کی اور پہلی شخصیت ہیں جس نے ختنہ کیا، اور پہلی مرتبہ اپنی مونچھ کاٹنے والے ہیں اور پہلے ایسے شخص نے جنہوں نے بڑھاپے کو دیکھا (یعنی اپنے بالوں کو سفید ہوتا ہوا دیکھا) ابراہیم علیہ السلام نے معلوم کیا: اے اللہ! یہ کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اے ابراہیم! یہ وقار وعزت ہے، اس پر ابراہیم علیہ السلام نے کہا: اے اللہ! میرے وقار کو بڑھا دیجیے۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں: مونچھوں کو اتنا کاٹا جائے گا کہ ہونٹوں کے کنارے ظاہر ہو جائیں اور اسے اطار (ہونٹ کی وہ کھال جو منہ کی طرف کو ہوتی ہے) کہتے ہیں، اور بالکل صاف نہ کرے کہ اپنے آپ کو مثلہ (بدہیئت بنا دے)۔

تشریح: ابراہیم علیہ السلام پہلے شخص ہیں جنہوں نے مہمانوں کی ضیافت کی؛ چنانچہ وہ اکثر و بیشتر اکیلے نہیں کھاتے جو دکھائی دیتا اسے اپنے ساتھ شریک کر لیتے، ان کے اسی جذبہ کی جھلک فرشتوں کی آمد پر ان کے سامنے بچھڑا پیش کرنے میں دکھائی دیتی ہے۔

وأوّل الناس أختتن: ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: اگر چہ سارے انبیاء مختون پیدا ہوئے تھے؛ لیکن جب ابراہیم علیہ السلام نے ختنہ کیا تو یہ سارے لوگوں کے لیے سنت قرار دے دیا گیا، ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اختتن إبراهيم النبي عليه السلام وهو ابن ثمانين سنة بالقدم.

وأول الناس قص شاربه: ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: ممکن ہے کہ ابراہیم علیہ السلام سے پہلے لوگوں کی مونچھ لمبی ہی نہ ہوتی ہو یا پھر ان کے لیے کاٹنے کا حکم نہ ہو، یا یہ بھی ممکن ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کچھ مبالغہ کے ساتھ کاٹتے تھے؛ اس لیے ان کی خصوصیات میں شمار کرایا گیا ہے۔

وأوّل الناس رأ الشيب: علامہ باجیؒ فرماتے ہیں: ابراہیم علیہ السلام نے پہلی مرتبہ سر اور ڈاڑھی کے بال سفید دیکھے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے لوگوں کے بال سفید نہیں ہوتے تھے، جب سفید بال دیکھے تو اللہ سے دریافت کیا: اے اللہ: یہ کیا ہے؟ ان سفید بالوں کے تغیر میں کیا حکمت ہے؟ تو اللہ نے ارشاد فرمایا: یہ وقار ہے یعنی جب آدمی کی عمر بالوں کے سفید ہونے کی ہو جاتی ہے، تو عمل میں سنجیدگی، صبر و حلم، عفو و درگزر، الغرض تمام صفات اس کے اندر جمنے لگتی ہیں جو اس کے عزت واحترام کا سبب بنتی ہیں جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ وقار کی علامت ہے اور وقار صفاتِ حمیدہ کا نتیجہ ہے؛ اس لیے ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی: اے اللہ! میرے وقار کو بڑھا دیجیے۔ (المنتقی)

ترکیب: إبراهيم كان کا اسم ہے اور أوّل الناس خبر ہے، ضيف الضيف مصدر کی تاویل میں ہوکر تمیز ہے، أي أوّل الناس تضييفًا بقیہ ترکیب بھی یکساں ہے۔

ملحوظہ: امام مالکؒ نے یہاں مونچھیں کاٹنے کی حد بیان کی ہے کہ مونچھ کو اتنی مقدار میں کاٹا جائے کہ ہونٹ کے آگے والا کنارہ ظاہر ہونے لگے، کاٹنے میں اتنا زیادہ مبالغہ نہ کرے کہ پوری جلد صاف نظر آنے لگے، اس کے لیے ایسی صورت میں مثلہ جیسی ہیئت ہوجاتی ہے۔

فائدہ: ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ختنہ کے بارے میں اختلاف ہے۔

زادالمعاد میں علامہ ابن القیمؒ نے رمایا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ختنہ کے سلسلہ میں تین اقوال ہیں:

(۱) آپ صلی اللہ علیہ وسلم مختون پیدا ہوئے تھے؛ البتہ اس بارے میں کوئی صحیح حدیث نہیں ہے (۲) حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا کے یہاں قیام کے دوران فرشتوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ختنہ کیا (۳) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جدامجد عبدالمطّلب نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے ساتویں روز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ختنہ کیا، لوگوں کی دعوت کی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) رکھا۔

اَلنَّهْيُ عَنِ الْأَكْلِ بِالشِّمَالِ

(بائیں ہاتھ سے کھانے کی ممانعت)

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ السَّلَمِيِّ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى أَنْ يَّأْكُلَ الرَّجُلُ بِشِمَالِهِ وَيَمْشِيَ فِيْ نَعْلٍ وَّاحِدَةٍ وَأَنْ يَشْتَمِلَ الصَّمَّاءَ وَأَنْ يَحْتَبِيَ فِيْ ثَوْبٍ وَاحِدٍ كَاشِفًا عَنْ فَرْجِهِ.

ترجمہ: حضرت جابر بن عبداللہ سلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آدمی کو بائیں ہاتھ سے کھانے کو منع فرمایا ہے اور یہ کہ ایک جوتا پہن کر چلے،

نیز اشتمال صماء سے منع فرمایا ہے اور اس بات سے کہ ایک کپڑے میں حبوہ بنا کر بیٹھے، اس حال میں کہ اس کی شرم گاہ کھلی ہوئی ہو۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُمَا أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِذَا أَكَلَ أَحَدُكُمْ فَلْيَأْكُلْ بِيَمِيْنِهِ وَيَشْرَبْ بِيَمِيْنِهِ فَإِنَّ الشَّيْطَانَ يَأْكُلُ بِشِمَالِهِ وَيَشْرَبُ بِشِمَالِهِ.

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی کھائے تو داہنے ہاتھ سے کھائے اور پیے تو داہنے ہاتھ سے پیے؛ اس لیے کہ بائیں سے شیطان کھاتا پیتا ہے۔

تشریح: انسان اپنے ہاتھوں کو پاک وناپاک ہر قسم کے کاموں اور چیزوں میں استعمال کرتا ہے؛ اس لیے فطری تقاضہ یہ ہے کہ گندگی اور نجاست کی صفائی کے لیے ایک ہاتھ استعمال ہو اور کھانے پینے اور اچھے کاموں کے لیے دوسرا ہاتھ استعمال ہو، اسی فطری تقاضہ کے مطابق احادیثِ شریفہ میں دفع نجاست وغیرہ کے لیے بائیں ہاتھ اور کھانے پینے اور دوسری عمدہ چیزوں کے لیے داہنے ہاتھ کو استعمال کرنے کی تائید کی گئی ہے۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ کھاتے پیتے وقت داہنے ہاتھ کو استعمال کرنا واجب ہے؛ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو بائیں ہاتھ سے کھاتے ہوئے دیکھا، تو اس کے لیے بددعا فرمائی جس کے نتیجہ میں وہ مبتلائے طاعون ہوکر مر گیا؛ لیکن جمہورؒ کے نزدیک یہ استحبابی حکم ہے اور وہ حدیثیں جن میں بائیں ہاتھ سے کھانے پر وعیدیں وارد ہوئی ہیں وہ زجر وتنبیہ کے لیے ہیں۔

فإن الشيطان يأكل بشماله: تورپشتیؒ نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ شیطان اپنے تابعداروں کو بائیں ہاتھ سے کھانے پر اُبھارتا ہے؛ لیکن حافظ ابنِ حجرؒ نے فرمایا: یہ بلاضرورت عدول عن الظاہر ہے، حدیث کو ظاہر پر محمول کرنا اولیٰ ہے اور شیطان حقیقتاً کھاتا پیتا ہے، یہ کوئی محال بات نہیں ہے۔

نوٹ: پہلی حدیث کے بقیہ ٹکڑے کی تشریح ماقبل میں آچکی ہے۔

مَا جَاءَ فِي الْمَسَاكِيْنِ

مساکین، مسکین کی جمع ہے، حافظ ابنِ حجرؒ نے فرمایا: یہ سکون سے مشتق ہے، گویا مسکین اسباب وآلات کی قلت کی وجہ سے ایک جگہ جما رہتا ہے۔

مسکین کی تعریف میں اختلاف ہے:

امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک مسکین وہ شخص ہے جس کے پاس بالکل کچھ نہ ہو، اور فقیر وہ شخص ہے جس کے پاس مال تو ہو؛ لیکن نصاب کے بقدر نہ ہو، یا نصاب کے بقدر ہو؛ لیکن نامی نہ ہو۔

امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک مسکین وہ شخص ہے جس کے پاس اتنا مال یا کوئی پیشہ ہو جس سے اس کا گزر ہو جاتا ہو اور فقیر وہ ہے جس کے پاس نہ مال ہو اور نہ پیشہ ہو اور امام ابو یوسفؒ اور محمدؒ کے نزدیک دونوں میں کوئی فرق نہیں، دونوں ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے ہیں۔

امام رازیؒ فرماتے ہیں اس اختلاف کا فائدہ تفرقِ صدقہ میں ظاہر نہ ہوگا کہ ایک کو ملے گا اور ایک کو نہیں؛ بلکہ صدقہ وزکات کے دونوں مستحق ہیں، ہاں! اس کا ثمرہ وصیت میں ظاہر ہوگا، کہ وصیت اگر فقیر کے لیے کی گئی تو اس کا نفاذ صرف فقیر پر ہوگا، هٰكذا في المساكين۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَيْسَ الْمِسْكِيْنُ بِهٰذَا الطَّوَّافِ الَّذِيْ يَطُوْفُ عَلَى النَّاسِ فَتَرُدُّهُ اللُّقْمَةُ وَاللُّقْمَتَانِ وَالتَّمْرَةُ وَالتَّمْرَتَانِ قَالُوْا فَمَنِ الْمِسْكِيْنُ يَا رَسُوْلَ اللهِ قَالَ الَّذِيْ لَا يَجِدُ غِنًى يُغْنِيْهِ وَلَا يَفْطِنُ النَّاسُ لَهُ فَيُتَصَدَّقُ عَلَيْهِ وَلَا يَقُوْمُ فَيَسْأَلُ النَّاسَ.

ترجمہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مسکین وہ نہیں ہے کہ لوگوں کے پاس گھر گھر پھرے اور ایک یا دو لقمے، یا ایک دو کھجور اس کو (دروازے سے) لوٹا دے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا تو مسکین کون ہے؟ اے اللہ کے نبی! آپ صلی اللہ علیہ

وسلم نے فرمایا: وہ شخص جس کے پاس اتنی وسعت نہ ہو جو اس کی ضرورت کو پورا کردے اور لوگوں کو بھی اس کی خبر نہ ہو کہ وہ کچھ صدقہ وغیرہ کردیں اور نہ وہ خود لوگوں سے مانگنے کے لیے کھڑا ہوتا ہے۔

تشریح: حدیثِ پاک میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حقیقی ضرورت مندوں کو صدقہ وزکاۃ دینے کی ترغیب فرمائی ہے؛ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حقیقی مسکین اور حاجت مند وہ لوگ نہیں ہیں جو عام لوگوں کے درمیان مسکین سمجھے جاتے ہیں، جن کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ مانگنے کے لیے دَر دَر پھرتے ہیں، جس دروازے پر جاتے ہیں روٹی کا ایک دو ٹکڑا یا ایک دو کھجور دے کر لوٹا دیئے جاتے ہیں؛ بلکہ حقیقی ضرورت مند اور مسکنت سے دو چار وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے پاس زندگی بسر کرنے کا کوئی سامان مہیا نہیں ہوتا اور ان کی خودداری کا عالم یہ ہوتا ہے کہ ان کے پہلو میں رہنے والا ہمسایہ بھی ان کی کیفیت پر مطلع نہیں ہو پاتا، اور نہ ہی وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں؛ بلکہ خدا تعالیٰ پر اعتماد کیے ہوئے اپنے گھروں میں بیٹھے رہتے ہیں، لہٰذا ہمارا اخلاقی فریضہ ہے کہ اس طرح کے ضرورت مندوں کی حاجت روائی کریں؛ کیونکہ مانگنے والوں کو تو کچھ نہ کچھ حاصل ہو ہی جاتا ہے۔

عَنِ ابْنِ بُجَيْدٍ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ رُدُّوا الْمِسْكِيْنَ وَلَوْ بِظِلْفٍ مُحْرَقٍ.

ترجمہ: (مسکین وسائل جب دروازہ پر آئے تو اسے کچھ نہ کچھ دینے کی ترغیب دیتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: (جب مسکین سائل دروازہ پر آئے تو) اس کو کچھ نہ کچھ دے کر واپس کرو، اگرچہ جلا ہوا کھر ہی کیوں نہ ہو (یعنی خالی ہاتھ واپس مت کرو، اگرچہ معمولی چیز ہی دو)۔

لغات: ظلف: بکسر الظاء: کھر۔

مُحْرَق: اسم المفعول من أَحْرَق جلانا۔

مَا جَاءَ فِيْ مِعَى الْكَافِرِ

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَأْكُلُ الْمُسْلِمُ فِيْ مِعَاءٍ وَاحِدٍ وَالْكَافِرُ يَأْكُلُ فِيْ سَبْعَةِ أَمْعَاءٍ.

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسلمان ایک آنت میں کھاتا ہے اور کافر سات آنتوں میں کھاتا ہے۔

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ضَافَهُ ضَيْفٌ كَافِرٌ فَأَمَرَ لَهُ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِشَاةٍ فَحُلِبَتْ فَشَرِبَ حِلَابَهَا ثُمَّ أُخْرىٰ فَشَرِبَهُ ثُمَّ أُخْرىٰ فَشَرِبَهُ حَتّٰى شَرِبَ حِلَابَ سَبْعِ شِيَاهٍ ثُمَّ أَنَّهُ أَصْبَحَ فَأَسْلَمَ فَأَمَرَ لَهُ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِشَاةٍ فَحُلِبَتْ فَلَمْ يَسْتَتِمَّهَا قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمُؤْمِنُ يَشْرَبُ فِيْ مِعَاءٍ وَّاحِدٍ وَالْكَافِرُ يَشْرَبُ فِيْ سَبْعَةِ أَمْعَاءٍ.

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک کافر مہمان آیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے ایک بکری منگوائی، پھر اس کا دودھ دوہا گیا وہ مہمان اس کے سارے دودھ کو پی گیا، پھر دوسری اور تیسری یہاں تک کہ سات بکریوں کا دودھ چٹ کر گیا، پھر جب دوسرا دن ہوا تو وہ مسلمان ہو گیا اور (آج بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے) اس کے لیے ایک بکری لانے کا حکم دیا اور اس کو دوہا گیا (لیکن آج) وہ دودھ مکمل نہ پی سکے، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مؤمن ایک آنت میں پیتا ہے اور کافر سات آنتوں میں پیتا ہے۔

حدیث کی تشریح میں علماء کے مختلف اقوال ہیں:

(۱) حدیث شریف میں تمثیل ہے کہ کافر پر پیٹ کی فکر سوار رہتی ہے اور مؤمن پر آخرت کی۔

(۲) حدیث کا مقصد مؤمن کو قلتِ طعام پر رغبت دلانا ہے؛ کیونکہ مؤمن جب اس بات کو جان لے گا کہ کثرتِ طعام کافر کی صفت ہے تو اس سے ضرور احتراز کرے گا۔

(۳) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات عمومی احوال کے اعتبار سے فرمائی ہے، کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے، اور سات کا عدد تکثیر کے لیے ہے نہ کہ تحدید کے طور پر یعنی مومن کی شان یہ ہے کہ وہ اشتغال بالعبادۃ اور خشیتِ خداوندی کے سبب کثرتِ طعام سے احتراز کرتا ہے اور برخلاف کافر کے کہ اس کا حال دیگر ہے۔

مفتی تقی صاحب نے ''تکملہ'' میں اسی کو راجح قرار دیا ہے۔

(تکملہ فتح الملہم: ۱۰/۷۰، تحفۃ الالمعی: ۵/۱۶۵، عون الترمذی: ص/۸۰)

حافظ ابنِ حجرؒ نے ایک احتمال یہ بھی بیان کیا ہے کہ مومن کے کھانے پر تسمیہ ہونے کی وجہ سے شیطان اس کا شریک کار نہیں ہو پاتا اور اس برکت کی وجہ سے اسے قلیل بھی کافی ہوجاتا ہے، جبکہ کافر کے کھانے میں بے برکتی کا عنصر شامل ہوتا ہے، لہٰذا اسے کثیر بھی کفایت نہیں کرتا۔

لغات: معیً ومعاء: آنت، جمع أمعاء وأمعية.

شاة: جمعه شياه.

حلاب: لام کے کسرہ کے ساتھ دوہا ہوا دودھ، اور دودھ دوہنے والے دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے؛ لیکن یہاں دودھ مراد ہے۔

فلم يستتمها، أي لم يقدر على شرب لبن الشاة تمامًا.

اَلنَّهْيُ عَنِ الشُّرْبِ فِيْ اٰنِيَةِ الْفِضَّةِ وَالنَّفْخِ فِي الشَّرَابِ

اس باب کے تحت آنے والی حدیثوں میں دو حکم بیان کیے گئے ہیں:

(۱) سونے چاندی کے برتنوں میں کھانے پینے کا حکم:

سونا چاندی کے برتنوں میں کھانا پینا دراصل اپنی دولت مندی کی بے جا نمائش اور

ایک طرح کا استکبار ہے اور دنیا کی عیش وتنعم میں مست رہنا ہے جو مومن کی شایانِ شان نہیں ہے، تمام علماء اور ائمہ کا اس مسئلہ پر اتفاق ہے کہ مرد وعورت دونوں کے لیے سونے چاندی کے برتن میں کھانا پینا حرام ہے؛ چنانچہ مسلم شریف میں صراحتاً منقول ہے: ولا تشربوا في آنية الذهب والفضة ولاتأكلوا في صحافها. اسی طرح سونے چاندی کے برتنوں میں عطر رکھ کر ان سے عطر لگانے وغیرہ دیگر کاموں کے لیے استعمال کرنا بھی حرام ہے۔

مذکورہ حکم اس وقت ہے جبکہ برتن خالص سونے یا چاندی کا ہو؛ البتہ اگر کسی دوسری چیز سے بنا کر سونے یا چاندی کا پانی چڑھایا جائے تو اس قسم کے برتنوں میں کھانا پینا جائز ہے۔

اور اگر برتن مفضض یا مضبب (سونے چاندی کا پتر چڑھا ہوا) ہو تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اس کو استعمال کرنا مکروہ ہے، اور امام صاحبؒ کے نزدیک اس قسم کے برتن میں کھانا پینا جائز ہے، بشرطیکہ منھ لگانے کی جگہ سونا چاندی نہ ہو؛ کیونکہ تفضیض اور تضبیب برتن کے تابع ہوتے ہیں اور تابع کا اعتبار نہیں ہے، نیز یہ برتن کی مضبوطی کے لیے ہوتا ہے نہ کہ زیب وزینت کے مقصد سے۔ (ہدایہ: ۴؍، مظاہر حق: ۳؍)

عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الَّذِيْ يَشْرَبُ فِيْ اٰنِيَةِ الْفِضَّةِ فَإِنَّمَا يُجَرْجِرُ فِيْ بَطْنِهِ نَارُ جَهَنَّمَ.

ترجمہ: اُمّ المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص چاندی کے برتنوں میں پیے گا تو جہنم کی آگ اس کے پیٹ میں آواز کرتے ہوئے داخل ہوگی۔

(۲) نفخ شراب کا حکم:

کسی چیز کو پیتے وقت برتن میں پھونک مارنے سے اس لیے منع کیا گیا ہے؛ تاکہ پی جانے والی چیز میں تھوک نہ گر جائے اور دوسرے شخص کو اس سے کراہت محسوس نہ ہو،

بسا اوقات منہ میں بدبو پیدا ہوجاتی ہے، اس وقت اگر برتن میں پھونک ماری جائے تو ہوسکتا ہے اس سے مشروب میں بدبو پیدا ہوجائے۔ (بذل، فتح الباری)

واضح رہے جس حدیث میں یہ آیا ہے کہ أن النبی صلی الله علیه وسلم کان یتنفس في الإناء ثلاثا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پانی میں پھونک مارتے تھے؛ بلکہ مطلب یہ ہے کہ پانی کو تین سانسوں میں پیتے تھے، ہر سانس پر برتن کو منہ سے جدا کرلیتے اور یہی حکم آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو دیا ہے۔

عَنْ أَبِي مُثَنَّى الْجُهَنِيِّ أَنَّهُ قَالَ كُنْتُ عِنْدَ مَرْوَانَ بْنِ الْحَكَمِ فَدَخَلَ عَلَيْهِ أَبُوْ سَعِيْدٍ الْخُدْرِيِّ فَقَالَ لَهُ مَرْوَانُ بْنُ الْحَكَمِ أَسَمِعْتَ مِنْ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ نَهىٰ عَنِ النَّفْخِ فِي الشَّرَابِ فَقَالَ لَهُ أَبُوْ سَعِيْدٍ نَعَمْ. فَقَالَ لَهُ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللهِ إِنِّي لَا أَرْوِيْ مِنْ نَفَسٍ وَّاحِدٍ فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَبِنِ الْقَدَحَ عَنْ فِيْكَ ثُمَّ تَنَفَّسْ قَالَ فَإِنِّيْ أَرَى الْقَذَاةَ فِيْهِ قَالَ فَأَهْرِقْهَا.

ترجمہ: ابوالمثنی جہنی کہتے ہیں کہ میں مروان کے پاس تھا، اسی دوران حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ تشریف لائے، تو مروان بن حکم نے ان سے کہا: تم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیتے وقت پھونک مارنے سے منع فرمایا ہے؟ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جی ہاں! اور (تکمیل فائدے کے طور پر) فرمایا کہ ایک شخص نے دریافت کیا یا رسول اللہ! میں ایک سانس میں سیراب نہیں ہوتا ہوں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پیالہ کو اپنے منھ سے جدا کرلیا کرو، پھر سانس لے لو، نیز اس نے کہا (کبھی کبھار) میں پانی میں کوئی تنکا وغیرہ دیکھتا ہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پھر اس پانی کو بہادو۔

فقال رجل یا رسول الله إني لا أروي من نفس واحد: جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھونک مارنے کی نہی فرمائی تو ایک شخص نے سانس لینے کو پھونک مارنا

سمجھا؛ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم پیتے وقت سانس لے سکتے ہو؛ البتہ سانس لیتے وقت برتن کو منھ سے جدا کرلیا کرو، پھر سانس لےلو اور دوبارہ پی لو۔

أری القذاۃ فیہ: اس شخص نے مزید دریافت کیا کہ بسا اوقات پانی میں تنکا وغیرہ پڑ جاتا ہے کیا اسے پھونک مار کر دُور کیا جاسکتا ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پھونک مت مارو؛ بلکہ اس پانی کو بہا کر دوسرا استعمال کرلو یا اُنگلی وغیرہ سے نکال لو، اسی طرح اگر مشروب گرم ہو تو پھر پھونک مت مارو؛ بلکہ ٹھنڈا ہونے تک صبر سے کام لے لو۔ (فتح الباری)

لغات: أروي أرواء: سیراب ہونا۔ قَدَحٌ: بڑے پیالے کو کہتے ہیں۔ قَذَاۃ: گھاس کا تنکا وغیرہ۔

مَا جَاءَ فِيْ شُرْبِ الرَّجُلِ وَهُوَ قَائِمٌ

(کھڑے ہوکر پانی پینے کا بیان)

ذخیرۂ احادیث میں کھڑے ہوکر پانی پینے کے جواز اور اس کی ممانعت، دونوں سلسلوں کی احادیث موجود ہیں، امام مالکؒ نے صرف ان احادیث کی تخریج کی جن میں کھڑے ہوکر پانی پینے کا بیان ہے جبکہ ترمذی شریف کی حدیث میں اس کی ممانعت بیان کی گئی: عن أنس أن النبي صلى الله عليه وسلم نهى أن يشرب الرجل قائما. (ترمذی)

اسی لیے علماءؒ نے دونوں طرح کی احادیث کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے؛ چنانچہ:

(۱) بعض شراح نے فرمایا: ممانعت بعد میں وارد ہوئی ہے؛ اس لیے یہ ناسخ ہے، اس کے برعکس ابوبکر بن اثرم اور ابنِ شاہین نے ممانعت کی احادیث کو منسوخ قرار دیا ہے۔

(۲) ممانعت شفقت اور رحمت کے باب سے ہے؛ کیونکہ کھڑے ہوکر پینے میں طبی مضرتیں ہیں، اور احادیث جواز اباحتِ شرعیہ پر محمول ہیں۔

(۳) علامہ خطابیؒ، اور ابنِ بطالؒ وغیرہ نے فرمایا: احادیث نہی خلافِ اولیٰ اور مکروہِ تنزیہی پر محمول ہیں، پس احادیث جواز سے ان کا تعارض نہیں ہوگا؛ کیونکہ خلافِ اولیٰ جواز ہی کی ایک قسم ہے، تاہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول بیٹھ کر پانی پینے کا تھا؛ اس لیے یہی طریقہ مستحب ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطورِ تعلیم کبھی کھڑے ہوکر بھی پانی پیا ہے؛ تاکہ معلوم ہوجائے کہ اگر بیٹھنے کا موقع نہ ہو، تو کھڑے ہوکر پینے میں بھی کوئی گناہ نہ ہوگا۔

(اوجز: ۱۶/ ۳۲۴)

فائدہ: علامہ ابنِ قیمؒ نے لکھا ہے کہ کھڑے ہوکر پانی پینے کے متعدد نقصانات ہیں، مثلاً اس طرح پانی پینے سے مکمل سیرابی حاصل نہیں ہوتی، پانی معدہ میں نہیں رُکتا کہ جگر تمام اعضاء کو اچھی تراوٹ پہنچا سکے، تیزی کے ساتھ معدہ میں پہنچتا ہے، اس کے سبب معدہ کی حرارت سرد پڑ جاتی ہے جس کی وجہ سے نظامِ ہضم خراب ہوجاتا ہے اور یکبارگی اسفل بدن کی طرف منتقل ہوجاتا ہے جو صحتِ جسمانی کے فساد کا سبب ہے۔

(زادالمعاد: ۴/ ۲۱۰)

أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ وَعَلِيَّ بْنَ أَبِيْ طَالِبٍ وَعُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ كَانُوْا يَشْرَبُوْنَ قِيَامًا.

(ترجمہ واضح ہے)

اس روایت کے ظاہر سے اگرچہ استمرار معلوم ہوتا ہے؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے کھڑے ہوکر پانی نوش فرمایا ہے؛ البتہ ان کی عادت یہ نہ تھی اور اس سے پتا چلتا ہے کہ بوقتِ ضرورت کھڑے ہوکر پینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

عَنِ ابْنِ شِهَابٍ أَنَّ عَائِشَةَ أُمَّ الْمُؤْمِنِيْنَ وَسَعْدَ بْنَ أَبِيْ وَقَّاصٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا كَانَا لَا يَرَيَانِ يَشْرَبُ الْإِنْسَانُ وَهُوَ قَائِمٌ بَأْسًا.

ترجمہ: امّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور سعد ابن وقاص رضی اللہ عنہ انسان کے کھڑے ہوکر پانی پینے کو میں حرج محسوس نہیں کرتے۔

عَنْ أَبِيْ جَعْفَرٍ الْقَارِيِّ أَنَّهُ قَالَ رَأَيْتُ عَبْدَ اللهِ بْنَ عُمَرَ يَشْرَبُ قَائِمًا.

عَنْ عَامِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ بْنِ الزُّبَيْرِ عَنْ أَبِيْهِ أَنَّهُ كَانَ يَشْرَبُ قَائِمًا.

امام مالکؒ نے یہ تمام روایت اس لیے ذکر کی ہیں؛ کیونکہ ان کے نزدیک کھڑے ہوکر پانی پینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

فائدہ: اوپر کی روایات عام حالات میں پانی پینے کے بارے میں ہیں، رہا زمزم اور وضو کا بچا ہوا پانی تو ان کو تمام فقہاء کے نزدیک کھڑا ہوکر پینا بہتر ہے۔

اَلسُّنَّةُ فِي الشَّرَابِ وَمُنَاوَلَتِهِ عَنِ الْيَمِيْنِ

(پینے کا طریقہ اور مشروب کو دائیں جانب والے شخص کو دینے کا حکم)

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أُتِيَ بِلَبَنٍ قَدْ شِيْبَ بِمَاءٍ وَعَنْ يَمِيْنِهِ أَعْرَابِيٌّ وَعَنْ يَّسَارِهِ أَبُوْ بَكْرٍ الصِّدِّيْقُ رَضِيَ اللهُ تَعَالىٰ عَنْهُ فَشَرِبَ ثُمَّ أَعْطَى الْأَعْرَابِيَّ وَقَالَ الْأَيْمَنُ فَالْأَيْمَنُ.

ترجمہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے دودھ لایا گیا جس میں پانی ملایا گیا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں جانب ایک دیہاتی تھا اور بائیں جانب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نوش فرمایا اور پھر اس دیہاتی کو عنایت فرمایا اور فرمایا: دایاں پھر دایاں (دائیں جانب والا زیادہ حق دار ہے)۔

تشریح: اس حدیث میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ کسی چیز کے دینے میں اپنے داہنی طرف کی رعایت ملحوظ رکھنا سنت ہے، اگرچہ دائیں طرف والا شخص بائیں طرف کے شخص کی بہ نسبت کم رتبہ ہو، تب بھی پہلے اسی کو دیا جائے؛ کیونکہ دائیں طرف میں برکت اور فضیلت ہے؛ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بائیں طرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے، پھر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بچا ہوا دودھ اسی دیہاتی کو عنایت فرمایا اس کے داہنی طرف ہونے کی وجہ سے۔

نیز یہ حدیث آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالِ عدل وانصاف اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصف حق شناسی پر دلالت کرتی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے افضل اور مقرب ترین ہونے کے باوجود دیہاتی کے حق کو نظر انداز نہیں فرمایا۔

لغت: شِیْبَ أي خلط من شاب شیبًا (ض) ملانا۔

عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ الْأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالیٰ عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أُتِيَ بِشَرَابٍ فَشَرِبَ مِنْهُ وَعَنْ يَّمِيْنِهٖ غُلَامٌ وَعَنْ يَّسَارِهِ الْأَشْيَاخُ فَقَالَ لِلْغُلَامِ أَتَأْذَنُ لِيْ أَنْ أُعْطِيَ هٰؤُلَاءِ فَقَالَ لَا وَاللّٰهِ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لَا أُوْثِرُ بِنَصِيْبِيْ مِنْكَ أَحَدًا قَالَ فَتَلَّهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ يَدِهٖ.

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک مشروب لایا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں سے نوش فرمالیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے داہنی جانب ایک بچہ تھا اور بائیں جانب اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم تھے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بچہ سے کہا: کیا تم اجازت دیتے ہو کہ میں یہ مشروب ان مشائخ کو دے دوں؟ اس بچے نے کہا: خدا کی قسم! یارسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ملنے والے اپنے حصہ میں، میں کسی کو ترجیح نہیں دوں گا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

تشریح: گزشتہ حدیث میں "الأیمن فالأیمن" کا ضابطہ گزرا ہے اور ایک حدیث میں دوسرا ضابطہ "إبدؤا بالأکبر" ہے، اس سے معلوم ہوا دائیں والے کا بھی حق ہے اور اکابر کا بھی حق ہے، اب غور کرنا ہے کہ کس کا حق زیادہ ہے؟ تو احادیث کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ داہنی طرف کو ایک گونہ خصوصیت ہے؛ اس لیے اسی کا حق زیادہ ہے، اس کے پیش نظر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غلام سے اجازت لی کہ بچا ہوا مشروب جو تمہارا حق ہے اسے بڑوں کو دے دیا جائے؟ تو انہوں نے جواب دیا بڑوں کا فضل وکمال سب مسلّم ہے؛ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے عنایت شدہ چیز میں، مَیں دوسرے کو ترجیح نہیں دے سکتا۔

فائدہ: حدیث شریف میں اس بات کی بھی تعلیم دی گئی ہے کہ جب مجلس میں کوئی چیز آئے تو صرف ایک آدمی پورے کو صاف نہ کر جائے؛ بلکہ دوسرے ساتھیوں کو اس میں شریک کرے؛ تا کہ اس بات کا مظاہرہ ہو کہ یہ شخص کھانے پینے کا حریص نہیں ہے۔

نوٹ: حدیث میں غلام سے مراد حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ ہیں اور اشیاخ سے مراد خالد بن ولید اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں۔

لغت: تلّ (ن) وضعه بشدة زور سے کسی چیز کو رکھنا۔

جَامِعُ مَا جَاءَ فِي الطَّعَامِ وَالشَّرَابِ

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ يَقُوْلُ قَالَ أَبُوْ طَلْحَةَ لِأُمِّ سُلَيْمٍ لَقَدْ سَمِعْتُ صَوْتَ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ضَعِيْفًا أَعْرِفُ فِيْهِ الْجُوْعَ فَهَلْ عِنْدَكِ مِنْ شَيْئٍ فَقَالَتْ نَعَمْ فَأَخْرَجَتْ أَقْرَاصًا مِنْ شَعِيْرٍ ثُمَّ أَخَذَتْ خِمَارًا لَهَا فَلَفَّتِ الْخُبْزَ بِبَعْضِهِ ثُمَّ دَسَّتْهُ تَحْتَ يَدِيْ وَرَدَّتْنِيْ بِبَعْضِهِ ثُمَّ أَرْسَلَتْنِيْ إِلٰى رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فَذَهَبْتُ بِهِ فَوَجَدْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَالِسًا فِي الْمَسْجِدِ وَمَعَهُ النَّاسُ فَقُمْتُ عَلَيْهِمْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَرْسَلَكَ أَبُوْ طَلْحَةَ قَالَ فَقُلْتُ نَعَمْ قَالَ لِطَعَامٍ قَالَ فَقُلْتُ نَعَمْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِمَنْ مَعَهُ قُوْمُوا قَالَ فَانْطَلَقَ وَانْطَلَقْتُ بَيْنَ أَيْدِيْهِمْ حَتّٰى جِئْتُ أَبَا طَلْحَةَ فَأَخْبَرْتُهُ فَقَالَ أَبُوْ طَلْحَةَ يَا أُمَّ سُلَيْمٍ قَدْ جَاءَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالنَّاسِ وَلَيْسَ عِنْدَنَا مِنَ الطَّعَامِ مَا نُطْعِمُهُمْ فَقَالَتْ أُمُّ سُلَيْمٍ اَللهُ وَرَسُوْلُهُ أَعْلَمُ فَانْطَلَقَ أَبُوْ طَلْحَةَ حَتّٰى لَقِيَ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَبُوْ طَلْحَةَ مَعَهُ حَتّٰى دَخَلَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلُمِّيْ يَا أُمَّ سُلَيْمٍ مَا عِنْدَكِ؟ فَأَتَتْ بِذٰلِكَ الْخُبْزِ فَأَمَرَ بِهِ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ

وَسَلَّمَ فَفُتَّ وَعَصَرَتْ عَلَيْهِ أُمُّ سُلَيْمٍ عُكَّةً لَهَا فَأَدَمَتْهُ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْهِ مَا شَاءَ اللّٰهُ أَنْ يَقُوْلَ ثُمَّ قَالَ ائْذَنْ لِعَشَرَةٍ بِالدُّخُوْلِ فَأَذِنَ لَهُمْ فَأَكَلُوْا حَتّٰى شَبِعُوْا ثُمَّ خَرَجُوْا ثُمَّ قَالَ ائْذَنْ لِعَشَرَةٍ فَأَذِنَ لَهُمْ فَأَكَلُوْا حَتّٰى شَبِعُوْا ثُمَّ خَرَجُوْا ثُمَّ قَالَ ائْذَنْ لِعَشَرَةٍ فَأَذِنَ لَهُمْ فَأَكَلُوْا حَتّٰى شَبِعُوْا ثُمَّ خَرَجُوْا ثُمَّ قَالَ ائْذَنْ لِعَشَرَةٍ فَأَذِنَ لَهُمْ فَأَكَلُوْا حَتّٰى شَبِعُوْا ثُمَّ خَرَجُوْا ثُمَّ قَالَ ائْذَنْ لِعَشَرَةٍ حَتّٰى أَكَلَ الْقَوْمُ كُلُّهُمْ وَشَبِعُوْا وَالْقَوْمُ سَبْعُوْنَ رَجُلًا أَوْ ثَمَانُوْنَ رَجُلًا.

ترجمہ وتشریح: حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے اپنی اہلیہ اُمِّ سلیم رضی اللہ عنہا سے کہا کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز کو پست نکلتے ہوئے سنا ہے (یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز میں روانی اور قوت نہیں تھی) مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھوک کی حالت میں ہیں (علامہ باجیؒ فرماتے ہیں: انبیاء بھوک اور دوسری تکلیفوں میں اس لیے مبتلا کیے جاتے تھے؛ تاکہ ان کے درجات مزید بلند ہوں اور مقام ومرتبہ میں اضافہ ہوجائے) حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا: اُمِّ سلیم کیا تمہارے پاس کچھ کھانے کو ہے؟ اُمِّ سلیم رضی اللہ عنہا نے جواب دیا جی ہاں! پھر انہوں نے جَو کی کچھ روٹیاں نکالیں اور اپنی اوڑھنی لی اور ایک کونے میں روٹیوں کو باندھ دیا اور ان کو میری بغل میں رکھ دیا اور بقیہ چادر مجھے اوڑھا دی اور مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیج دیا، حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ان روٹیوں کو جب لے کر گیا تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ مسجد میں تشریف فرما ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ لوگ بھی تھے، میں ان کے سامنے خاموش کھڑا ہوگیا، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے معلوم کیا، کیا تمہیں ابوطلحہ نے بھیجا ہے؟ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا ہاں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر معلوم کیا کھانے کے سلسلہ میں؟ میں نے کہا جی ہاں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پاس موجود لوگوں سے

فرمایا: کھڑے ہو جاؤ اور ابوطلحہ کے گھر چلو (حافظ ابنِ حجرؒ نے فرمایا: ظاہر کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سمجھا کہ ابوطلحہ نے بلایا ہے جب کہ ابتداءِ حدیث میں ہے کہ اُمِّ سلیم رضی اللہ عنہا نے انہیں روٹی لے کر بھیجا تھا، اس کا حل یہ ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں روٹی لے کر گئے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے قبول کریں گے اور تناول فرمالیں گے؛ لیکن جب انہوں نے ایک جماعت کو دیکھا تو روٹیوں کے کم ہونے کی وجہ سے انہیں شرم محسوس ہوئی اور وہ روٹیاں پیش نہیں کیں، اور حضرت انس رضی اللہ عنہ نے دعوت والی بات پر ہاں کہہ دیا) حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کے ساتھ چل دیئے اور میں ان کے آگے آگے چل رہا تھا، یہاں تک کہ میں ابوطلحہ کے پاس آیا اور ان کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں کے تشریف لانے کی خبر دی، حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا: اُمِّ سلیم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک جماعت کے ساتھ ہمارے گھر تشریف لا رہے ہیں، اور ہمارے پاس کھانا اتنا نہیں ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کو کافی ہو سکے، تو اُمِّ سلیم رضی اللہ عنہا نے جواب دیا: اللہ اور رسول زیادہ جانتے ہیں، حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ابوطلحہ گھر سے نکلے، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لا رہے تھے اور ابوطلحہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہو لیے اور دونوں حضرات گھر میں داخل ہو گئے، اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت کو باہر بٹھا دیا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھر میں داخل ہونے کے بعد اُمِّ سلیم سے فرمایا: جو کچھ تمہارے پاس ہے لے آؤ، تو انہوں نے وہی روٹیاں حاضر کر دیں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان روٹیوں کے ٹکڑے کرنے کا حکم دیا اور اُمِّ سلیم رضی اللہ عنہا نے اپنے گھی کے کپے کو روٹیوں پر نچوڑ دیا اور اسی کو بطورِ سالن پیش کر دیا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو اللہ نے چاہا (بعض روایت میں آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں ہاتھ پھیرا اور برکت کی دعا کی)، پھر آپ صلی اللہ

علیہ نے فرمایا: دس آدمیوں کو اندر آنے کی اجازت دے دو؛ چنانچہ اجازت دی گئی، وہ آئے اور انہوں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور چلے گئے، اسی طرح دس دس آدمی آتے رہے، یہاں تک کہ ستر یا اسّی آدمیوں نے پیٹ بھر کے کھانا کھالیا۔

نوٹ: حدیث شریف میں چند پہلو قابلِ غور ہیں:

(۱) امام نوویؒ نے فرمایا: ابوطلحہ کے واقعہ میں دو مختلف باتیں پیش آئی ہیں: اوّل یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزہ کا ظہور ہوا، ثانی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر دیدی گئی تھی کہ یہ تھوڑا کھانا ہی ایک بڑی جماعت کے لیے کافی ہے۔

(۲) شدتِ تکلیف اور بھوک کی حالت میں بھی دوسرے کے سامنے اظہار نہیں کرنا چاہیے۔

(۳) جب کسی شخص سے قلبی تعلقات ہوں اور ایسی بے تکلفی ہو کہ اس کے گھر کسی کو لے جانے سے بار محسوس نہیں کرے گا تو بلا اجازت مہمان کو لے جایا جاسکتا ہے۔

(۴) مؤمن کو ہر حال میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ پر اعتماد رکھنا چاہیے، اگر چہ بظاہر کسی چیز کی تکمیل کا امکان نہ ہو۔

لغات: أقراص جمع قرصٍ: چپاتی روٹی۔ لفت (ن) لفاً لپیٹنا۔

خمارٌ جمعه خُمُرٌ اوڑھنی۔ دست (ن) دساً: کسی چیز میں زور سے داخل کرنا۔

ردتني ردًا چادر اُڑھانا (ن)۔ فُتَّ (ن) فتًّا توڑنا ٹکڑے کرنا۔

عُكّةٌ گھی رکھنے کا برتن۔ ادمت آدم وأدَمَ سالن بنانا۔

شبع (س) شبعًا شکم سیر ہونا۔

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ طَعَامُ الْإِثْنَيْنِ كَافِي الثَّلٰثَةِ وَطَعَامُ الثَّلٰثَةِ كَافِي الْأَرْبَعَةِ.

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: دو آدمیوں کا کھانا تین کو کافی ہے اور تین کا کھانا چار کے لیے کافی ہے۔

تشریح: حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جس کھانے کو دو آدمی سیر ہو کر کھاتے ہیں وہ

تین آدمیوں کے لیے بطورِ قناعت کافی ہوجائے گا اور تینوں کی بھوک ختم کردے گا، ان کے ضعف کو دُور کردے گا، مہلب نے کہا اصل مقصد ایثار وقناعت اختیار کرنے کی طرف رغبت دلانا ہے، مقدارِ کفایت کا حصر مراد نہیں ہے یعنی اس طرف اشارہ ہے کہ مواساۃ وہمدردی کے سبب کھانے میں برکت حاصل ہوتی ہے اور طعامِ قلیل، کثیر کے لیے کافی ہوجاتا ہے۔

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ السَّلَمِيِّ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ أَغْلِقُوا الْبَابَ وَأَوْكُؤُ السِّقَاءَ وَأَكْفِؤُا الْإِنَاءَ أَوْ خَمِّرُوا الْإِنَاءَ وَأَطْفِؤُ الْمِصْبَاحَ فَإِنَّ الشَّيْطَانَ لَايَفْتَحُ غَلَقًا وَلَا يَحُلُّ وِكَاءً وَلَا يَكْشِفُ إِنَاءً وَإِنَّ الْفُوَيْسِقَةَ تُضْرِمُ عَلَى النَّاسِ بُيُوْتَهُمْ.

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (بسم اللہ پڑھ کر) دروازوں کو بند کردو اور مشکیزہ کے منہ کو باندھ دو، برتن کو اوندھا کردو، یا برتنوں کو ڈھانک دو اور چراغ کو بجھادو (کیونکہ بسم اللہ پڑھ کر جو دروازہ بند کیا جائے) تو شیطان اس کو نہیں کھول سکتا (اسی طرح) مشکیزہ کے منہ کو نہیں کھول سکتا، اور نہ برتن کو، اور (چراغوں کو بجھانا اس لیے ہے کہ) چھوٹا شرارتی چوہا لوگوں پر آگ بھڑکادیتا ہے۔

تشریح: حدیث شریف میں جو احکام مذکور ہیں وہ بطریقِ وجوب نہیں ہیں؛ بلکہ از قبیل بھلائی اور مصلحت اندیشی کے ہیں، اور بہترین و بے خطر زندگی گزارنے کی ہدایات ہیں؛ چنانچہ فرمایا: بسم اللہ پڑھ کر دروازہ بند کردیا جائے تو شیطان اس گھر میں داخل نہیں ہوسکتا، نیز چور، لٹیروں سے حفاظت ہوجاتی ہے۔

اسی طرح مشکیزہ وغیرہ جس کو پہلے زمانہ میں پانی کے لیے استعمال کیا جاتا تھا اس کو ڈھانکنے کا فائدہ یہ ہے کہ کوئی کیڑا وغیرہ اس میں داخل نہیں ہوگا۔

نیز وہ برتن جس میں کھانے پینے کی کوئی چیز ہو اسے بھی ڈھانکنے میں بڑے فوائد ہیں،

شیطانی اثرات وتصرفات سے حفاظت ہوتی ہے اور موذی زہریلے جانوروں سے رکاوٹ ہوجاتی ہے۔

اور چراغ کو سوتے وقت بجھادیا جائے، اسی طرح چولہے میں جو آگ ہو اسے بھی بجھادیا جائے؛ اس لیے کہ چراغ کو چوہے بسا اوقات بستر وغیرہ پر اُلٹ دیتے ہیں اور چولے میں کوئی چیز لاکر ڈال دیتے ہیں جس سے آگ لگنے کا خطرہ ہے۔

لغات: اغلق اغلاقا: بند کرنا۔ أَوْكَؤُ إيكاءً اربطوا: باندھنا۔

خمر تخميراً: ڈھانکنا۔ اطفأ اطفاءً: بجھانا۔

وكاء: دھاگا ماربط به السقاء. فُوَيْسِقَة، فاسقة کی تصغیر برائے تحقیر چوہا۔

اضرم اضراماً: آگ روشن کرنا۔

عَنْ أَبِي شُرَيْحِ الْكَعْبِيِّ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْرًا أَوْلِيَصْمُتْ وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيُكْرِمْ جَارَهُ وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهُ جَائِزَتَهُ يَوْمٌ وَّلَيْلَةٌ وَّالضِّيَافَةُ ثَلَاثَةُ أَيَّامٍ فَمَا كَانَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَهُوَ صَدَقَةٌ وَلَا يَحِلُّ لَهُ أَنْ يَّثْوِيَ عِنْدَهُ حَتّٰى يُحْرِجَهُ.

ترجمہ: حضرت ابوشریح کعبی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہیے کہ اچھی بات کہے یا خاموش رہے اور جو شخص اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے اپنے پڑوسی کا اکرام کرنا چاہیے اور جو شخص اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہیے کہ اپنے مہمان کا اکرام کرے، اس کا جائزہ (انعام) ایک دن ہے اور ضیافت تین دن تک اور جو تین کے بعد کھلایا جائے وہ صدقہ ہے، اور مہمان کے لیے حلال نہیں ہے کہ میزبان کے پاس اتنے دن ٹھہرا رہے یہاں تک کہ اسے مصیبت میں مبتلا کردے۔

حدیث پاک میں تین احکام بیان کیے گئے ہیں:

(۱) ایک مؤمن کی صفت یہ ہونی چاہیے کہ اپنی زبان سے صرف خیر وبھلائی کی بات نکالے اور شر اور بُرائی کی باتوں سے اجتناب کرے، ترمذی کی ایک حدیث میں ہے کہ ذکر اللہ کے بغیر زیادہ کلام کرنا قلب کو سخت کر دیتا ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: زبان اللہ کی ایک بڑی نعمت ہے، اور اس کی قدرت کے لطائف میں سے ہے؛ اس لیے کہ یہ جسم میں تو بہت چھوٹی ہے؛ لیکن طاعت یا جرم کے سلسلہ میں اس کا کردار بہت بڑا ہے، یہاں تک کہ کفر وایمان کا اظہار بھی زبان سے ہی ہوتا ہے، جو کہ طاعت ومعصیت کے منتہی ہیں، اور زبان کے ذریعہ ہی تخیلات، ظنیات، موہومات، علم ومعرفت، جہل وشقاوت، اثبات ونفی، حق وباطل کا پتہ چلتا ہے، یہ خصوصیت دوسرے اعضاء میں نہیں ہے، الغرض! زبان کا خطرہ زیادہ بڑھا ہوا ہے اور اس سے نجات خاموشی کے ذریعہ ہی مل سکتی ہے۔

علماء نے آفات اللسان کو عدداً بھی شمار کرایا ہے فلیطالع أحیاء العلوم.

(۲) دوسرا حکم یہ دیا گیا کہ کامل مؤمن کی شان یہ ہے کہ اس کا اپنے پڑوسی کے ساتھ احسان واکرام کا معاملہ ہو، پڑوسی کے حقوق کے بارے میں کتبِ احادیث بھری پڑی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: پڑوسی کے حقوق کے سلسلہ میں میرے پاس جبرئیل علیہ السلام اتنے تاکیدی احکام لائے تھے کہ مجھے اندیشہ ہونے لگا شاید اسے وارث بنادیا جائے گا۔

علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں: اتنے تاکیدی احکام کے بعد بھی اگر کوئی اپنے پڑوسی کو تکلیف پہنچائے، اس کے عیوب کی پردہ پوشی نہ کرے، اس کی ضرورتوں کا خیال نہ رکھے اور اس کو مصیبت میں مبتلا رکھے تو یہ اس شخص کے فساد اعتقاد اور نفاق کی دلیل ہے۔

البتہ اشخاص واحوال کے اعتبار سے اکرام کا حکم مختلف ہے؛ چنانچہ کبھی فرضِ عین ہے اور کبھی فرضِ کفایہ، اور کبھی مندوب ومستحب۔

حافظ ابنِ حجرؒ فرماتے ہیں: پڑوسی عام ہے خواہ مسلمان ہو یا کافر، عابد ہو یا فاسق،

دوست ہو یا دشمن، اجنبی ہو یا معروف، نافع یا ضار گھر کے قریب والا ہو یا کچھ دُور والا، اپنے مراتب کے اعتبار سے ہر ایک کے الگ حقوق ہیں۔

نیز علماء نے وعظ حسن، ہدایت کی دعا دینا، بھلائی کی طرف بلانا، بُرائی سے روکنے کو بھی حقوقِ جار میں سے شمار کیا ہے۔

(۳) تیسرا حکم یہ ہے کہ جو شخص اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھے اسے چاہیے کہ وہ اپنے مہمان کا اکرام کرے، اس سے خندہ پیشانی سے پیش آئے اور اسے اپنائیت کا احساس دلائے اور اس کی مہمان داری اس طرح کی جائے کہ پہلے دن کے کھانے پینے کی چیزوں میں جو تکلف واہتمام ہو سکے وہ کرے، دوسرے اور تیسرے دن ماحضر کو پیش کردے، اگر اس کا قیام تین دن سے زائد ہو جائے تو خوش دلی سے صدقہ وخیرات سمجھ کر کھلاتا رہے۔

ضیافت کا حکم

مہمان نوازی سنت ہے یا واجب؟ اس میں کچھ اختلاف ہے، لیث بن سعدؒ کے نزدیک مہمان نوازی واجب ہے؛ اسی لیے اگر کوئی میزبانی کے لیے تیار نہ ہو تو زبردستی اپنا حق لے سکتا ہے اور امام احمدؒ کے نزدیک دیہات میں واجب ہے اور شہر میں سنت؛ کیونکہ شہروں میں بازار ہوتے ہیں، وہاں سے ضرورت پوری ہو سکتی ہے۔

جمہور فقہاء کے نزدیک سنت ہے۔

قائلینِ وجوب کے دلائل:

حدیثِ باب میں امر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے جو وجوب پر دلالت کرتا ہے۔

دوسری دلیل مسلم کی ایک روایت ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: فإن لم يفعلوا (أي قبول الضيافة) فخذوا منهم حق الضيف الذي ينبغي لهم. اس حدیث کے ظاہر سے وجوب معلوم ہوتا ہے۔

تیسری دلیل ابوداؤد کی روایت ہے جس کے الفاظ ہیں: لیلۃ الضیف حق علی کل مسلم. اس میں حق کا لفظ ہے جو وجوب کے لیے آتا ہے۔

جمہورؒ فرماتے ہیں: یہ سب حدیثیں مکارمِ اخلاق پر محمول ہیں اور اخلاقیات اور استحباب کے قبیل سے ہیں نہ کہ وجوب کے قبیل سے۔

اور دلائل کا جواب یہ ہے کہ: امر استحباب کے لیے ہے، یا مذکورہ احادیث حالتِ اضطرار پر محمول ہیں یا یہ ابتداءِ اسلام کا حکم ہے جب مسلمانوں کی تعداد کم تھی اور ان کے پاس اسباب بھی کم تھے، اب یہ حکم منسوخ ہوگیا، حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی کو ترجیح دی۔

خطابیؒ نے فرمایا: یہ اس وقت کا حکم ہے جب بیت المال کا نظام نہ تھا، اور بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ یہ حکم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھیجے ہوئے عاملین اور مصدقین کا ہے، اور جن احادیث میں حق کا لفظ ہے اس سے مراد مروت اور انسانیت کا حق ہے نہ کہ حقِ شریعت، جیسا کہ غسلِ جمعہ کے بارے میں ہے۔

اور اخیر میں ایک نصیحت مہمان کو فرمائی کہ کسی کے یہاں جا کر اتنے دن تک جم کر نہ بیٹھ جائے کہ میزبان حرج اور پریشانی میں مبتلا ہوجائے، لہٰذا مناسب یہی ہے جلد سے جلد اپنی ضرورت کو پورا کر کے واپسی کرلے، تاہم اگر میزبان خود تین سے زائد ٹھہرنے کی درخواست اور خواہش ظاہر کرے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

وضاحت: من کان یؤمن باللہ والیوم الآخر: حدیث کا یہ جملہ مذکورہ اعمال کے انتفاء سے انتفائے ایمان پر دلالت کرتا ہے؛ لیکن اس سے حقیقت مراد نہیں؛ بلکہ مبالغہ مقصود ہے، نیز ایمانیات میں سے صرف ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کو ذکر کیا؛ کیونکہ اس میں مبدأ سے لے کر معاد تک کا اشارہ ہے جس کے درمیان تمام چیزیں آگئیں۔

(تکملہ فتح الملہم: ۱/ ۵۶۳، تحفۃ الالمعی: ۵/، اوجز المسالک: ۱۶)

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ بَيْنَمَا رَجُلٌ يَمْشِي

بِطَرِيْقٍ إِذَا اشْتَدَّ عَلَيْهِ الْعَطَشُ فَوَجَدَ بِئْرًا فَنَزَلَ فِيْهَا فَشَرِبَ فَخَرَجَ فَإِذَا كَلْبٌ يَلْهَثُ يَأْكُلُ الثَّرىٰ مِنَ الْعَطَشِ فَقَالَ الرَّجُلُ لَقَدْ بَلَغَ هٰذَا الْكَلْبُ مِنَ الْعَطَشِ مِثْلُ الَّذِيْ بَلَغَ مِنِّيْ فَنَزَلَ الْبِئْرَ فَمَلَأَ خُفَّهُ ثُمَّ أَمْسَكَهُ بِفِيْهِ حَتّٰى رَقِيَ فَسَقَى الْكَلْبَ فَشَكَرَ اللّٰهُ فَغَفَرَ لَهُ فَقَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَإِنَّ لَنَا فِي الْبَهَائِمِ لَأَجْرًا؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ كُلِّ ذَاتِ كَبِدٍ رَطْبَةٍ أَجْرٌ.

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اسی دوران کہ ایک آدمی راستے میں چلا جارہا تھا اسے سخت پیاس کا احساس ہوا، تلاش وجستجو کے بعد اس نے ایک کنواں پایا، وہ اس کنویں میں اُتر گیا اور پانی پی کر باہر نکل گیا، اچانک اس نے ایک کتے کو دیکھا کہ وہ ہانپ رہا ہے اور پیاس کی وجہ سے نمناک مٹی کو چاٹ رہا ہے، آدمی نے اپنے دل میں سوچا کہ پیاس کی وجہ سے اس کتے کی حالت وہی ہوگئی ہے جو میری تھی؛ چنانچہ وہ دوبارہ کنویں میں اُترا اور اس نے اپنے چمڑے کے موزے کو پانی سے بھرلیا اور اس کو اپنے منھ سے پکڑ کر کنویں سے اوپر آیا اور پانی کتے کو پلا دیا، اللہ نے اس کی اس کوشش کو قبول فرمایا اور اس کی مغفرت فرمادی، صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! چوپاؤں کے سلسلہ میں بھی ہمیں اجر وثواب ملتا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہر تر جگر والے میں تمہارے لیے اجر ہے؛ (کیونکہ جاندار کا جب تک جگر تروتازہ رہتا ہے اس وقت تک زندگی باقی رہتی ہے، گویا اس سے جاندار کی طرف اشارہ ہے)۔

تشریح: حدیث پاک میں اللہ کی مخلوق پر شفقت کرنے کا عام حکم بیان کیا گیا، صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ خیال تھا کہ شفقت کا تعلق صرف انسان کے ساتھ ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے وہم کو دُور کرتے ہوئے فرمایا: ہر تر جگر والے یعنی جو زندہ ہو خواہ وہ

انسان ہو یا جانور، مؤمن ہو یا کافر، ہر ایک کے ساتھ شفقت کا معاملہ کرنا باعثِ اجر وثواب ہے اس کے برعکس کسی بھی جاندار کو بلا وجہ تکلیف پہنچانا گناہ کا ذریعہ ہے۔

لغات: لھث (س) لھثاً: تکان وغیرہ سے تیز تیز سانس لینا۔

ثری: نمناک مٹی التراب الندی.

رَقِيَ (س) رَقْيًا چڑھنا۔ کَبِدٌ: جگر۔

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَنَّهُ قَالَ بَعَثَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْثًا قِبَلَ السَّاحِلِ فَأَمَّرَ عَلَيْهِمْ أَبَا عُبَيْدَةَ ابْنَ الْجَرَّاحِ وَهُمْ ثَلٰثُ مِائَةٍ قَالَ وَأَنَا فِيْهِمْ قَالَ فَخَرَجْنَا حَتّٰى إِذَا كُنَّا بِبَعْضِ الطَّرِيْقِ فَنِيَ الزَّادُ فَأَمَرَ أَبُوْعُبَيْدَةَ ابْنُ الْجَرَّاحِ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ بِأَزْوَادِ ذٰلِكَ الْجَيْشِ فَجُمِعَ ذٰلِكَ كُلُّهُ فَكَانَ مِزْوَدَيْ تَمْرٍ قَالَ فَكَانَ يُقَوِّتُنَاهُ فِيْ كُلِّ يَوْمٍ قَلِيْلًا قَلِيْلًا حَتّٰى فَنِيَ وَلَمْ تُصِبْنَا إِلَّا تَمْرَةٌ تَمْرَةٌ فَقُلْتُ وَمَا تُغْنِيْ تَمْرَةٌ قَالَ لَقَدْ وَجَدْنَا فَقْدَهَا حَيْثُ فَنِيَتْ ثُمَّ انْتَهَيْنَا إِلَى السَّاحِلِ فَإِذَا حُوْتٌ مِثْلُ الظَّرِبِ فَأَكَلَ مِنْهُ ذٰلِكَ الْجَيْشُ ثَمَانِيَ عَشَرَةَ لَيْلَةً ثُمَّ أَمَرَ أَبُوْ عُبَيْدَةَ بِضِلْعَيْنِ مِنْ اَضْلَاعِهِ فَنُصِبَا ثُمَّ أَمَرَ بِرَاحِلَةٍ فَرُحِلَتْ ثُمَّ مَرَّتْ تَحْتَهُمَا وَلَمْ تُصِبْهُمَا.

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ساحلِ سمندر کی طرف ایک قافلہ بھیجا اور ابوعبید بن الجراح رضی اللہ عنہ کو ان کا امیر بنایا وہ تین سو لوگ تھے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں بھی ان میں تھا فرماتے ہیں؛ چنانچہ ہم نکلے اور ہم نے تھوڑا راستہ ہی قطع کیا تھا کہ توشہ کھانے پینے کا سامان ختم ہونے لگا، ابوعبید رضی اللہ عنہ نے قافلہ کے لوگوں کو اپنا توشہ ایک جگہ لانے کا حکم دیا، پس پورا توشہ جمع کردیا گیا، تو وہ دو تھیلے کھجور ہوئیں، لہٰذا وہ ہمیں روزانہ تھوڑا تھوڑا کھانے کو دیا کرتے تھے، یہاں تک کہ وہ بھی ختم ہونے لگا، تو ہم کو صرف ایک ایک کھجور ملنے لگی، وہب ابنِ

کیسان نے کہا ایک کھجور سے کیا بنتا ہوگا؟ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس کی قدر ہمیں اس وقت معلوم ہوئی جب وہ بھی ختم ہوگئی، پھر ہم ساحل سمندر پر پہنچے تو وہاں ایک مچھلی تھی پہاڑ جیسی اس میں سے لشکر نے اٹھارہ راتوں تک کھایا، پھر ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اس کی دو پسلیوں کو لانے کا حکم دیا اور ان کو کھڑا دیا گیا، پھر ایک سوار کو گزرنے کا حکم دیا، وہ ان دونوں کے نیچے سے گزر گیا اور وہ اس کو مَس بھی نہیں ہوئیں۔

تشریح: حدیث میں مذکور سریہ کے بارے میں ابنِ سعد نے بیان کیا کہ ۸ ھ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین سو آدمیوں پر مشتمل ایک لشکر قبیلہ جہینہ کی طرف روانہ فرمایا تھا، حافظ ابنِ حجرؒ نے ۸ ھ کے بارے میں انکار کیا اور انہوں نے اس کا وقوع ۶ ھ میں صلح حدیبیہ سے پہلے قرار دیا ہے۔

فأمر أبوعبید بأزواد ذلک الجیش: حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے توشوں کو جمع کرانے کی کیا کیفیت تھی؟ محدثین کے اس بارے میں مختلف اقوال ہیں:

امام نوویؒ فرماتے ہیں: حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے تمام قافلہ والوں کی رضامندی سے ایسا کیا تھا اور اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کی اتباع کی تھی؛ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک غزوہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم کو توشہ جمع کرنے کے لیے کہا تھا، نیز اشعریین کے اسی عمل پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تعریف فرمائی تھی۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ علماء کے نزدیک سفر میں ساتھیوں کے کھانے کو ایک ساتھ ملا کر کھانا مستحب ہے؛ کیونکہ اس سے برکت ہوتی ہے اور کھانے میں تنگی پیش نہیں آتی۔

علامہ باجیؒ فرماتے ہیں کہ ممکن ہے پہلے آپ رضی اللہ عنہ نے ساتھیوں سے مشورہ کیا ہو، پھر رضامندی کے بعد سب کے کھانوں کو جمع کیا یا پھر کچھ لوگوں کا کھانا بالکل ختم ہوگیا تھا، ان کے ہلاک ہونے کا خطرہ تھا اور کچھ کے پاس وافر مقدار میں توشہ تھا تو ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے ان توشہ والوں کو اپنا اپنا کھانا جمع کرنے کا حکم دیا اور ضرورت کے وقت مشورہ اور رضامندی کے بغیر بھی حکم دیا جا سکتا ہے، اسی کو علامہ عینیؒ نے پسند فرمایا ہے۔

مسئلہ میتۃ البحر:

سمندری جانوروں میں سے مچھلی کی حلت پر پوری امت کا اتفاق ہے، دوسرے بحری جانوروں کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔

ائمہ ثلاثہؒ کے نزدیک سمندر میں رہنے والے تمام جانور حلال ہیں؛ البتہ شوافع کے یہاں مینڈک اور مالکیہؒ کے یہاں سمندری آدمی، کتے اور خنزیر کا استثناء ہے؛ لیکن شرح صغیر میں مالکیہؒ کے نزدیک بلا استثناء تمام جانوروں کو حلال قرار دیا گیا ہے۔

اور حنفیہؒ کے نزدیک سمندری جانوروں میں سے صرف مچھلی حلال ہے۔

ائمہ ثلاثہؒ کا استدلال آیتِ مبارک ﴿أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ الْآيَة﴾ سے ہے، اس آیت میں علی الاطلاق تمام بحری جانوروں کو حلال قرار دیا گیا ہے۔

دوسرا استدلال حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا: ”هو الطهور ماءه الحل ميتته“

اور ابنِ حزمؒ نے تمام بحری حیوانات کی حلت پر باب کی حدیث سے استدلال کیا ہے؛ کیونکہ ایک روایت میں اس مچھلی کو دابہ کہا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مچھلی نہیں ہے؛ بلکہ کوئی دوسرا جانور ہے۔

حنفیہ کا استدلال:

امام ابوبکر جصاص رازیؒ نے مچھلی کے علاوہ دیگر جانوروں کی حرمت پر آیتِ کریمہ ﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ﴾ سے استدلال کیا ہے، اس آیت میں مطلقاً تمام مرداروں خواہ بری ہوں یا بحری حرام قرار دیا گیا ہے، اور یہاں اعتراض نہیں ہوسکتا کہ اس عموم سے تو مچھلی بھی حرام ہونی چاہیے، اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت کو خاص کردیا گیا سورۂ نحل کی آیت ﴿وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا﴾ سے، اس میں مچھلی کو تازہ گوشت قرار دیا گیا ہے جو اس کی حلت پر دلالت کرتی ہے۔

(۲) علامہ عینیؒ نے ﴿وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَآئِثَ﴾ سے استدلال کیا ہے، طریقۂ استدلال یہ ہے کہ مچھلی کے علاوہ تمام بحری جانوروں سے طبائع سلیمہ گھن کرتی ہیں، کراہتِ طبعی اگر چہ ایک امر اضافی ہے اسکو حلت وحرمت کا معیار نہیں بنایا جا سکتا؛ لیکن خود امام نوویؒ نے حرمت وحلت کے بارے میں استطابت واستخباث کو معتبر اُصول قرار دیا ہے۔

ائمہ ثلاثہؒ کے دلائل کا جواب:

جس آیت سے جمہورؒ نے استدلال کیا ہے اس سے استدلال کرنا دو باتوں پر موقوف ہے (۱) صید سے مراد ''مصید'' ہو (۲) بحر کی طرف اضافتِ استغراق کے لیے ہو اور یہاں دونوں ہی باتیں ممنوع ہیں؛ کیونکہ صید دراصل مصدر ہے، اس کو مفعول کے معنیٰ میں مجازاً استعمال کیا جاتا ہے اور جب تک حقیقت ممکن ہو مجاز کی طرف جانا جائز نہیں، لہٰذا اب معنیٰ یہ ہوں گے کہ سمندر کے تمام جانوروں کا شکار کرنا جائز ہے اور اس میں کوئی بعد نہیں ہے کہ حرام جانوروں کا بھی شکار کیا جا سکتا ہے اور جس کا شکار کیا جائے اسے کھانا ضروری نہیں ہے۔

اور رہا استغراق تو وہ بھی ممنوع ہے؛ کیونکہ اس کے مقابلہ میں دوسری آیت: ﴿وَصَيْدُ الْبَرِّ مَادُمْتُمْ حَرَمًا﴾ میں بھی اضافت استغراق کے لیے نہیں ہے اور قرینہ اس میں ﴿مَادُمْتُمْ حُرُمًا﴾ ہے؛ اس لیے کہ وہ جانور جو خاص طور پر حالتِ احرام میں حرام ہوتے ہیں وہ یقیناً وہ جانور ہیں جو غیر احرام کی حالت میں حلال ہیں اور رہے حرام جانور تو وہ تو مطلقاً حرام ہیں، حالتِ احرام ہو یا غیر احرام، ان میں حالتِ احرام کی کوئی خصوصیت نہیں ہے، پس یہ بات واضح ہوگئی کہ آیت سے وہی جانور حلال ہوں گے جو غیر حالتِ احرام میں حلال ہیں۔

نیز اگر تمام بحری جانور حلال ہیں تو آپ نے خود ضفدع اور کچھ حیوانات کا استثناء کیوں کیا ہے۔ دوسرے استدلال کا جواب یہ ہے کہ ''ویحل میتته'' سے معہود جانور مراد ہیں۔ اور

روایتِ باب کا جواب یہ ہے کہ اکثر احادیث میں اسے حوت کہا گیا اور جن روایات میں "دابۃ" کا لفظ آیا ہے وہاں مچھلی کے عظیم الجثہ ہونے کی وجہ سے کہا گیا ہے۔

سمکِ طافی کا مسئلہ:

پھر ائمہ ثلاثہؒ نے حدیثِ باب سے سمکِ طافی کی حلت پر استدلال کیا ہے، سمکِ طافی وہ مچھلی ہے جو بغیر کسی حادثہ کے اپنی موت مرجائے؛ چونکہ وہ اکثر و بیشتر مرکر پانی کے اوپر آجاتی ہے؛ اس لیے اس طافی کہتے ہیں۔

اور حنفیہؒ کے نزدیک طافی کا کھانا جائز نہیں ہے، ان کا استدلال حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہے: عن جابر قال قال رسول الله ما القى البحر أوجزر عنه فكلوه ومات فيه وطفا فلا تأكلوه. اس حدیث میں بذاتِ خود مرکر اوپر تیرنے والی مچھلی کو کھانے سے منع کیا گیا ہے۔

اور فریقِ مخالف کا استدلال حدیثِ باب سے درست نہیں ہے؛ کیونکہ اس میں اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ وہ مچھلی خود بخود مری تھی؛ بلکہ ظاہر یہ ہے کہ اسے سمندر نے باہر پھینک دیا تھا اور اس طرح کی مچھلی کھانا جائز ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ائمہ ثلاثہؒ کے اقوال اگرچہ اقرب الی النصوص ہیں؛ لیکن حنفیہ کے مذہب میں احتیاط ہے؛ کیونکہ جب حرمت وحلت کے دلائل جمع ہوجائیں تو حرمت کو ترجیح دی جاتی ہے۔

(تکملہ فتح الملہم: ۸ / ۳۳ / ۴۳ / ۲۴-۲۵، ہدایہ آخرین، شرح طحاوی: ۷) راجع للتفصیل

لغات: فَنِیَ (س) فناء ختم ہوجانا۔ مزودین تثنية مِزْوَد توشہ، کھانا رکھنے کا تھیلا۔

ظرب بفتح الظاء وکسر الراء: جبل، پہاڑ۔

عَنْ عَمْرِو بْنِ سَعْدِ بْنِ مُعَاذٍ عَنْ جَدَّتِهِ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَا نِسَاءَ الْمُؤْمِنَاتِ لَا تَحْقِرَنَّ إِحْدٰكُنَّ لِجَارَتِهَا وَلَوْ كُرَاعَ شَاةٍ مُحَرَّقٍ.

ترجمہ: عمرو بن سعد اپنے والد سے اور وہ اپنی دادی سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے مؤمن عورتو! تم میں سے کوئی اپنی پڑوسن کے (ہدیہ کو) حقیر نہ سمجھے، اگرچہ بکری کا جلا ہوا کھر ہی کیوں نہ ہو۔

تشریح: حافظ ابنِ حجرؒ فرماتے ہیں: اس حدیث میں ہدیہ لینے اور دینے میں معمولی چیز کو بھی حقارت سے نہ دیکھا جائے، اس کی ترغیب دی گئی ہے یعنی اگر تمہارے پاس معمولی چیز بھی ہو اسے اپنی پڑوسن کو بھیج دو، اسی طرح اگر تمہارے پاس کوئی معمولی چیز بطورِ ہدیہ بھیجی جائے تو اسے خوش دلی سے قبول کرو۔

اور حدیث میں جلے ہوئے کھر کا ذکر بطورِ مبالغہ ہے یعنی معمولی سے معمولی چیز کا ہدیہ لیا اور دیا جا سکتا ہے؛ کیونکہ یہ سببِ محبت ہے؛ ورنہ ظاہر ہے کھر کو ہدیہ میں کون دیتا ہے۔

اور خصوصاً عورتوں کو خطاب اس لیے ہے؛ کیونکہ ان کے مزاج میں غصہ اور کم تر و معمولی چیزوں کو واپس کر دینے کا رجحان زیادہ ہوتا ہے۔

لغت: حقر حقراً (ض) استصغره وهان به. کراع: بضم الکاف وتخفیف الراء: کھر کے نیچے کا حصہ۔

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ أَبِي بَكْرٍ أَنَّهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَاتَلَ اللهُ الْيَهُوْدَ نُهُوْا عَنْ أَكْلِ الشَّحْمِ فَبَاعُوْهُ وَأَكَلُوْا ثَمَنَهُ.

ترجمہ: عبداللہ بن ابی بکر سے روایت ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ یہود کو غارت کرے، انہیں چربی کھانے سے روکا گیا تھا، تو انہوں نے اس کو بیچا اور اس کے ثمن کو استعمال کیا۔

تشریح: حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ مردار کی چربی کا کیا حکم ہے؟ اور یہ اس لیے معلوم کیا گیا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم جانتے تھے کہ مردار کے تمام اجزاء سے انتفاع حرام ہے سوائے اس کی کھال اور ہڈی کے؛ لیکن انہیں اس بات میں تردد تھا کہ چربی حرام ہے یا حلال؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم

نے اس کے جواب میں فرمایا: وہ حرام ہے، رہا بعض اجزاء سے فائدہ اٹھانا تو وہ نجس رطوبت کے زوال پر موقوف ہے، جبکہ چربی سے رطوبت کو زائل کرنا ممکن نہیں ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مردار اور اس کے اجزاء سے انتفاع کے جائز نہ ہونے پر بطورِ تاکید مذکورہ حدیث کو بیان فرمایا اور یہودیوں پر لعنت بھیجی؛ تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت بھی اللہ کی طرف سے حرام کردہ اشیاء کو حلال کرنے کے بارے میں حیلہ بازی سے کام نہ لے۔

جاننا چاہیے یہ قاعدہ کلیہ نہیں کہ جب کسی چیز کے کھانے سے روکا جائے تو اس سے ہر قسم کا انتفاع حرام ہو؛ بلکہ شیخ نے ''بذل'' میں فرمایا ہے: جس چیز کو نجاست ذاتی کے طور پر حرام کیا جاتا ہے من کل الوجوہ اُس سے انتفاع ممنوع ہوتا ہے اور جس چیز کو بطور ضرر حرام کیا جاتا ہے تو وہ اپنے دائرہ میں محدود رہتی ہے۔ یعنی بطورِ خاص جس نوعیت جس نوعیت پر وارد ہوئی ہے اُسی کو ممنوع قرار دیا جائے گا، یہودیوں کے لیے چونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی شرارت کی وجہ سے چربی کو بالکل حرام قرار دے دیا تھا۔ یعنی نہ اُسے کھا سکتے تھے اور نہ اُسے بیچ کر ثمن استعمال کر سکتے تھے؛ اسی لیے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی حیلہ بازی پر لعنت فرمائی؛ کیونکہ حیلہ ایک حکمِ شرعی کو ختم کرنے کے لیے تھا۔

اسی حدیث کے پیشِ نظر فقہاء کے درمیان حیلہ کی مشروعیت میں اختلاف واقع ہو گیا ہے؛ اس لیے یہاں اس کا حکم بیان کیا جا رہا ہے۔

حیلہ کے اصل معنیٰ ''مہارت'' اور ''تدبیر'' کے ہیں اور اصطلاح میں حیلہ ایسا عمل اور طریقہ ہے جس کو فاعل ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہونے کے لیے ایسے رازدارانہ طور پر اختیار کرتا ہے جو صرف ذہانت وفطانت سے ہی سمجھا جا سکتا ہے۔

حیلہ کی دو قسمیں ہیں:

(۱) حیلہ مشروع: ایسے طریقوں کو اختیار کرنا جن میں حرام سے حلال کی طرف خلاصی ہو جائے۔

(۲) حیلہ حرام: ایسے اسباب و وسائل اختیار کرنا جو کسی حرام کی طرف لے جائیں یا ان سے کسی کی حق تلفی ہو یا پھر کسی چیز میں شبہات داخل ہو جائیں۔

پھر حیلہ مشروع کی تین قسمیں ہیں:

(۱) کسی حرام وسیلہ کو اختیار کرنا کسی امرِ مشروع کے حصول کے لیے ہو۔ مثلاً ایک شخص پر کسی کا حق ہے اور وہ انکار کرتا ہے اور صاحبِ حق کے پاس بیّنہ نہیں ہیں تو اس وقت وصولِ حق کے لیے دو جھوٹے گواہوں سے گواہی دلوانا اور حق حاصل کر لینا۔ حیلہ کی اِس قسم میں گناہ صرف اختیارِ وسیلہ تک محدود رہے گا اور رہا حق میں ملنے ولا مال تو وہ جائز ہے۔

(۲) مشروع وسائل کو اختیار کرنا امرِ مشروع کے حصول کے لیے بیع، اجارہ اور انواعِ عقود سب اِسی قبیل سے ہیں۔

(۳) ان اسباب و وسائل کو اختیار کرنا جو قبیح الاصل ہوں۔ یعنی شرعاً ممنوع نہ ہوں اور نہ حرام جیسے کلام کے کنایات جائز کو استعمال کرنا، اِس طرح کے حیلے چونکہ ارتکابِ حرام سے بچاتے ہیں؛ اس لیے ان کو مشروع قرار دیا گیا ہے۔

اور حیلہ ممنوع کی بھی تین قسمیں ہیں:

(۱) اسبابِ حرام کو اختیار کرنا امرِ حرام تک پہنچنے کے لیے۔ جیسے ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں، اب وہ دوبارہ اُس کو زوجیت میں لانا چاہتا ہے؛ لیکن حلالہ سے شرمندگی کرتا ہے، اب اس نے حیلہ اختیار کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ میرا نکاح بغیر گواہوں کے ہوا تھا۔ یعنی نکاح فاسد تھا؛ لہٰذا طلاق واقع نہیں ہوئی۔

(۲) ایسا طریقہ استعمال کرنا جو فی نفسہٖ مشروع ہے؛ لیکن اس سے حرام کا ارادہ کرے۔ مثلاً چوری ڈکیتی یا کسی کا ناحق قتل کرنے کے لیے سفر کرنا۔

(۳) ایسا وسیلہ استعمال کرنا جو اصلاً فعلِ مشروع کے لیے وضع کیا گیا ہو؛ لیکن محتال اسے فعلِ ممنوع کے لیے استعمال کرے۔ مثلاً کوئی شخص اپنے ورثاء کے لیے

وصیت کرنا چاہتا ہے؛ لیکن اس کے ممنوع ہونے کی وجہ سے اس نے اُن کے لیے اقرار کرلیا۔

اس طرح کے حیلے حرام ہیں؛ کیونکہ ان کے ذریعہ احکامِ شرعیہ کا مقصد اور بنیاد منہدم ہوجاتی ہے۔

دلیل: حیلہ مشروع کی دلیل: قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب علیہ السلام کو قسم میں حانث ہونے سے بچنے کے لیے ﴿وَ خُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَ لَا تَحْنَثْ﴾ کے ذریعہ حیلہ سکھلایا ہے؛ نیز احادیث میں بھی اِس طرح کی مثالیں موجود ہیں۔

اور حیلہ ممنوع کی دلیل حدیثِ باب ہے، جس میں آپؐ نے اُن کے حیلہ ممنوع کے اختیار کرنے پر لعنت فرمائی ہے۔

عَنْ مَالِكٍ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ عِيسَى بْنَ مَرْيَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَانَ يَقُوْلُ يَا بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ عَلَيْكُمْ بِالْمَاءِ الْقُرَاحِ وَالْبَقْلِ الْبَرِّيِّ وَخُبْزِ الشَّعِيْرِ وَإِيَّاكُمْ وَخُبْزَ الْبُرِّ فَإِنَّكُمْ لَنْ تَقُوْمُوْا بِشُكْرِهٖ.

ترجمہ: حضرت عیسیٰ ابنِ مریمؑ فرمایا کرتے تھے: اے بنی اسرائیل! تم خالص پانی پیو اور صحرائی سبزیاں اور جَو کی روٹیاں کھاؤ، گیہوں کی روٹی کھانے سے بچو؛ اس لیے کہ تم اس کا شکریہ ادا نہیں کرسکتے۔

تشریح: حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو قناعت وصبر کا حکم دیا کرتے تھے، فرماتے: اے لوگو! تم سادہ پانی پیا کرو، اس پانی میں کچھ ملا کر کوئی مشروب نہ بناؤ اور دنیا کی رنگینیوں میں گم ہوکر لذیذ کھانے کی اشتہاء پیدا مت کرو؛ بلکہ جنگل کی سادہ سبزیوں پر اکتفاء کرلیا کرو، اور جو کی روٹی کھالیا کرو، گیہوں کی روٹی کے چکر میں نہ پڑو؛ اس لیے تم سے انہیں چیزوں کا شکریہ ادا نہ ہو پائے گا۔

مذکورہ نصیحت ہماری شریعت کے بھی موافق ہے، کھانے پینے کی چیزوں میں تکلفات، لذیذ اور ذائقہ دار اشیاء کی چاہت مؤمن کے شایانِ شان نہیں ہے؛ بلکہ بقائے

زندگی کی خاطر جو کچھ میسر ہو جائے اسے بصد شکر تناول کر لینا چاہیے، مزید کا طلبگار ہمیشہ پریشان رہتا ہے۔

مَالِكٌ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ الْمَسْجِدَ فَوَجَدَ فِيْهِ أَبَا بَكْرٍ الصِّدِّيْقَ وَعُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ فَسَأَلَهُمَا فَقَالَا أَخْرَجَنَا الْجُوْعُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَنَا أَخْرَجَنِيَ الْجُوْعُ فَذَهَبُوْا إِلىٰ أَبِي الْهَيْثَمِ بْنِ التَّيِّهَانِ الْأَنْصَارِيِّ فَأَمَرَ لَهُمْ بِشَعِيْرٍ عِنْدَهُ يَعْمَلُ وَقَامَ يَذْبَحُ لَهُمْ شَاةً فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَكِّبْ عَنْ ذَاتِ الدَّرِّ فَذَبَحَ لَهُمْ شَاةً وَّاسْتَعْذَبَ لَهُمْ مَاءً فَعَلَّقَ فِيْ نَخْلَةٍ ثُمَّ أُتُوْا بِذٰلِكَ الطَّعَامِ فَأَكَلُوْا مِنْهُ فَشَرِبُوْا مِنْ ذٰلِكَ الْمَاءِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَتُسْأَلُنَّ عَنْ نَعِيْمِ هٰذَا الْيَوْمِ.

ترجمہ وتشریح: حضرت امام مالکؒ کو یہ بات پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبویؐ میں تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پہلے سے موجود پایا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے اس وقت مسجد میں آنے کا سبب معلوم کیا (کیونکہ ترمذی وغیرہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دوپہر کا وقت اور اس وقت مسجد میں کوئی موجود نہیں رہتا تھا، تو اس وقت دونوں کی موجودگی کا سبب معلوم کیا) تو دونوں نے جواب دیا کہ بھوک کی شدت ہمیں یہاں لائی ہے (یعنی ہوسکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ موجود ہو یا پھر محبوب کا دیدار ہو جائے جو زوالِ بھوک کا سبب بن جائے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں بھی اسی لیے نکل کر آیا ہوں، اس کے بعد تینوں ایک ساتھ انصاری صحابی ابوالہیثم بن تیہان کے گھر کی جانب روانہ ہوئے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور دونوں صحابی ان کے گھر پہنچے تو وہ گھر پر موجود نہیں تھے (جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے) جب وہ آئے تو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اہلاً وسہلاً کہا اور

آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے لپٹ گئے اور اپنی بیوی سے کہا جو تمہارے جَو ہیں ان کو پیس کر پکالو اور ابوالہیثم نے چھری لی اور بکری ذبح کرنے لگے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: دودھ والی بکری کو ذبح مت کرو (آپ نے ان سے بطورِ شفقت منع فرمایا؛ کیونکہ اس کے بغیر بھی حاجت پوری ہوسکتی تھی)؛ چنانچہ انہوں نے بکری کو ذبح کرلیا (چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد شفقت ومہربانی کے طور پر تھا) پھر وہ ان حضرات کے لیے میٹھا پانی لائے؛ کیونکہ مدینہ کے اکثر مقامات پر کھارا پانی ہوتا تھا، اور پانی لانے کے بعد مشکیزہ کو ایک درخت پر لٹکادیا؛ تاکہ ہوا کی وجہ سے ٹھنڈا ہوجائے، پھر کھانا لایا گیا اور سب نے کھایا اور پانی پیا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم سے آج کی نعمتوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔

آپ کا یہ فرمانا اللہ کا شکر ادا کرنے اور اُن صحابی کے احسان یاد رکھنے کی ترغیب کے طور پر تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ایسی بھوک کی حالت میں کھانے کا انتظام فرمایا۔

شرح زرقانی میں ہے کہ علامہ ابن القیمؒ نے فرمایا: یہ سوال تشریف وانعام ہے، مطلب یہ ہے کہ ہر ایک سے سوال کیا جائے گا کہ تمہارے پاس جو نعمت ہے تم نے اسے حلال طریقہ سے حاصل کیا یا حرام طریقہ سے؟ نیز کیا تم نے اس کے حصول پر شکریہ ادا کیا کہ اسے کسی نیک کام میں لگایا؟ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقام پر سوال کیے جانی والی بات کو اس لیے بیان فرمایا؛ تاکہ کھانے پینے والوں کو عبرت ہو اور وہ نعمتیں جو انہیں حاصل ہیں صرف اپنے تک محدود رکھ کر بالکل غافل ہوکر زندگی نہ گزاریں اور اس میں ان نادار اور محتاج لوگوں کے لیے تسلی بھی ہے جن کے پاس کچھ نہیں کہ وہ قیامت کے دن سوالات سے دُور رکھے جائیں گے)۔

فائدہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخین رضی اللہ عنہما کا انصاری صحابیؓ کے گھر تشریف لے جانا توکل کے خلاف نہیں ہے؛ کیونکہ اسباب کو اختیار کرنا منافی توکل نہیں ہے۔

دوسرا فائدہ: حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ اکرامِ ضیف میں تکلف سے کام

لیا جا سکتا ہے، تاہم ایسا تکلف جو میزبان کی کلفت کا باعث ہو مکروہ ہے، اور حدیث شریف میں انصاری صحابی رضی اللہ عنہ کا بکری ذبح کرنا مشقت میں شمار نہیں ہوگا؛ کیونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک بکری تو کیا کئی بکریاں، اونٹ وغیرہ ذبح کر کے بھی پریشانی محسوس نہیں کرتے تھے۔

نیز حدیث شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور کبارِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے پاس دنیا کی کس قدر قلت تھی، وہ لوگ اکثر بھوک اور تنگیٔ عیش میں رہتے؛ لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور کبارِ صحابہ رضی اللہ عنہ کی اختیاری حالت تھی؛ چنانچہ ہر عام وخاص کو ان مجاہدات کی اجازت نہیں ہے۔

لغات: نكّب: أي تجنّب واعرض تنكيبًا: باز رہنا، کنارہ ہو جانا۔

ذات الدَرّ: در: دودھ، یہاں مراد دودھ والی بکری ہے۔

استعذب طلب العذب: میٹھا کرنا۔

علق تعليقاً: لٹکانا۔

عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيْدٍ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ كَانَ يَأْكُلُ خُبْزًا بِسَمْنٍ فَدَعَا رَجُلًا مِنْ أَهْلِ الْبَادِيَةِ فَجَعَلَ يَأْكُلُ وَيَتَّبِعُ بِاللُّقْمَةِ وَضَرَ الصَّحْفَةِ قَالَ لَهُ عُمَرُ كَأَنَّكَ مُقْفِرٌ فَقَالَ وَاللهِ مَا أَكَلْتُ سَمْنًا وَّلَا رَأَيْتُ أَكْلًا بِهِ مُنْذُ كَذَا وَكَذَا فَقَالَ عُمَرُ لَا اٰكُلُ السَّمْنَ حَتّٰى يُحْيَى النَّاسُ مِنْ أَوَّلِ مَا يُحْيَوْنَ.

ترجمہ وتشریح: یحییٰ بن سعید انصاریؒ سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ گھی کے ساتھ روٹی تناول فرما رہے تھے (اسی دوران) آپ نے ایک دیہاتی کو بلایا اور اس کو کھانے میں شریک کر لیا وہ دیہاتی کھانے لگا اور لقمہ سے طشت پر لگی چکنائی کو پونچھ رہا تھا (معلوم ہوا کہ گھی بہت کم تھا) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا (جب اس کو اس انہماک کے ساتھ کھاتا ہوا دیکھا) ایسا معلوم ہوتا ہے تمہارے پاس سالن نہیں ہوتا ہے، اس شخص نے جواب دیا میں نے اتنی اتنی مدت سے نہ تو گھی کھایا

ہے اور نہ کسی کھانے والے کو دیکھا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں گھی نہیں کھاؤں گا تا آنکہ لوگ اسی طرح زندگی گزارنے لگیں جیسے پہلے گزارتے تھے (یہ واقعہ اس قحط کے زمانہ کا ہے جو ۱۸ھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں پڑا تھا؛ چنانچہ آپ نے غرباء وفقراء کی برابری، مساوات اور ہمدردی کی خاطر اس طرح فرمایا؛ تاکہ تنگیٔ معاش میں ان کے ساتھ شرکت ہوجائے اور ان کے حالات سے غفلت نہ رہے)۔

لغات: وَضَرٌ بفتح الواو والضاد: تیل یا گھی کی تل چھٹ اور بچا ہوا۔

مُقْفِرٌ: من الإقفار جس کے پاس سالن نہ ہو اور گھی روٹی کھانے والا، دونوں ترجے ہوسکتے ہیں۔

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ رَأَيْتُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللهُ تَعَالىٰ عَنْهُ وَهُوَ يَوْمَئِذٍ أَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ يُطْرَحُ لَهُ صَاعٌ مِنْ تَمْرٍ فَيَأْكُلُهَا حَتّٰى يَأْكُلَ حَشَفَهَا.

ترجمہ وتشریح: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ: میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا جب وہ امیر المومنین تھے (یعنی زمانۂ خلافت میں) ان کے پاس ایک صاع کھجور ڈال دی جاتی تھی، وہ کھاتے رہتے یہاں تک کہ ردی کھجور بھی کھا لیتے تھے (ایک مجلس میں ساری کھجور کھانا مراد نہیں؛ بلکہ کئی مرتبہ میں کھا لیتے تھے، اور رزق کی قدر کرتے ہوئے ردی کھجور کو بھی ضائع نہ جانے دیتے تھے)۔

لغات: حَشَفٌ: ردئ التمر والضعيف الذي لانوى له أواليابس الفاسد.

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ تَعَالىٰ عَنْهُمَا أَنَّهُ قَالَ سُئِلَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللهُ تَعَالىٰ عَنْهُ عَنْ جَرَادٍ فَقَالَ وَدِدْتُ أَنَّ عِنْدِيْ قَفْعَةً فَاٰكُلُ مِنْهُ.

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ٹڈی کی (حلت وحرمت) کے بارے میں سوال کیا گیا

تو آپ نے جواباً کہا: میں چاہتا ہوں کہ میرے سامنے ٹوکری بھر کر ہوں اور اس سے کھاتا رہوں (یعنی جواز کی طرف اشارہ کیا)۔

ملا علی قاریؒ نے ''مرقات'' میں اور علامہ شوکانیؒ نے ''نیل الاوطار'' میں ٹڈیوں کی حلت پر اجماع نقل کیا ہے۔

ٹڈی کے ذبح کرنے کا حکم:

جمہورؒ کے نزدیک ٹڈی کو ذبح کرنے کی حاجت نہیں ہے اور مالکیہؒ کے نزدیک اس کو اس طرح ذبح کرنا ضروری ہے کہ تسمیہ اور نیت پائی جائی۔ (کتاب الام، الموسوعۃ الفقہیہ :۵)

لغات: جراد: اسمِ جنس واحد جرادة. وددت (س) ودًّا خواہش کرنا، چاہنا۔ قفعةً (ج) قِفاع برتن جو اوپر سے تنگ اور نیچے سے کشادہ ہو۔

عَنْ حُمَيْدِ بْنِ مَالِكِ بْنِ خُثَيْمٍ أَنَّهُ قَالَ كُنْتُ جَالِسًا مَعَ أَبِيْ هُرَيْرَةَ بِأَرْضِهِ بِالْعَقِيْقِ فَأَتَاهُ قَوْمٌ مِنْ أَهْلِ الْمَدِيْنَةِ عَلىٰ دَوَابٍ فَنَزَلُوْا عِنْدَهُ قَالَ حُمَيْدٌ فَقَالَ لِيْ أَبُوْهُرَيْرَةَ اِذْهَبْ إِلىٰ أُمِّي فَقُلْ لَهَا إِنَّ ابْنَكَ يُقْرِئُكِ السَّلَامَ وَيَقُوْلُ أَطْعِمِيْنَا شَيْئًا قَالَ فَوَضَعَتْ لَهُ ثَلَاثَةَ أَقْرَاصٍ فِيْ صَحْفَةٍ وَشَيْئًا مِنْ زَيْتٍ وَمِلْحٍ ثُمَّ وَضَعَتْهَا عَلىٰ رَأْسِيْ وَحَمَلْتُهَا إِلَيْهِمْ فَلَمَّا وَضَعْتُهَا بَيْنَ أَيْدِيْهِمْ كَبَّرَ أَبُوْ هُرَيْرَةَ وَقَالَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَشْبَعَنَا مِنَ الْخُبْزِ بَعْدَ أَنْ لَمْ يَكُنْ طَعَامُنَا إِلَّا الْأَسْوَدَيْنِ الْمَاءُ وَالتَّمْرُ فَلَمْ يُصِبِ الْقَوْمُ مِنَ الطَّعَامِ شَيْئًا فَلَمَّا انْصَرَفُوْا قَالَ لِيْ يَا ابْنَ أَخِيْ أَحْسِنْ إِلىٰ غَنَمِكَ وَامْسَحِ الرُّعَامَ عَنْهَا وَأَطِبْ مَرَاحَهَا وَصَلِّ فِيْ نَاحِيَتِهَا فَإِنَّهَا مِنْ دَوَابِّ الْجَنَّةِ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ لَيُوْشِكُ أَنْ يَأْتِيَ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ تَكُوْنُ الثُّلَّةُ مِنَ الْغَنَمِ أَحَبَّ إِلىٰ صَاحِبِهَا مِنْ دَارِ مَرْوَانَ.

ترجمہ: حمید بن مالکؒ نے بیان کیا ہے کہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس

مقامِ عقیق میں بیٹھا ہوا تھا، آپ کے پاس مدینہ کے کچھ لوگ سوار ہو کر آئے اور ان کے پاس فروکش ہو گئے، حمید کہتے ہیں مجھ سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: میری والدہ کے پاس جاؤ اور کہنا آپ کے فرزند نے سلام کہا ہے اور وہ کہتے ہیں: ہمیں کچھ کھانے کے لیے عنایت فرما دیں، حمید کہتے ہیں کہ انہوں نے تین روٹیاں اور کچھ مقدار تیل اور نمک ایک طشت میں رکھ دیا، پھر اسے میرے سر پر رکھ دیا، میں اسے اٹھا کر ان کے پاس آیا اور جب میں نے اس کو ان کے سامنے پیش کیا تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اللہ اکبر! کہا، اور فرمایا: تمام تعریفیں اس ذاتِ کریم کے لیے ہیں جس نے ہمیں روٹی سے شکم سیر فرمایا، بعد اس کے کہ ہمارا کھانا دو کالی چیزوں پانی اور کھجور کے سوا کچھ نہیں ہوتا تھا؛ لیکن ان لوگوں نے تھوڑا سا بھی کھانا نہیں کھایا (ممکن ہے انہیں حاجت نہ ہو یا روزہ کی حالت میں ہوں) جب وہ لوگ واپس چلے گئے تو مجھ سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے میرے بھتیجے! اپنی بکریوں کا خیال رکھو، ان کی ناک پوچھ دیا کرو، نیز ان کے باڑے کو پاک رکھو، اور اس کے ایک کنارہ میں نماز پڑھ لیا کرو؛ اس لیے کہ بکری جنت کا جانور ہے اور قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، لوگوں پر عنقریب ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ بکریوں کا ایک چھوٹا سا ریوڑ بکری والے کو مروان کے گھر سے زیادہ محبوب ہوگا۔

تشریح: مذکورہ روایت میں چند فوائد ہیں: (۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے مہمان کی آمد پر ماحضر کو منگوالیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر دُور دراز سے کوئی مہمان آئے تو فوراً اس کے کھانے پینے کا انتظام کرنا چاہیے اور اپنی وسعت کے مطابق اسے کھانا کھلائے۔

(۲) جب کسی کو کسی کے پاس کوئی پیغام دے کر بھیجا جائے تو پہلے سلام کہلائے۔

(۳) اگر خستہ حالت کو اللہ تعالیٰ بہتر حالت میں تبدیل فرما دیں، تو گزشتہ حالت سے عبرت اور بہتر حالت پر اللہ کا شکر اور اس کی ثنا کرتے رہنا چاہیے۔

پھر حضرت نے حمید کو نصیحت فرمائی کہ بکری کا خیال رکھا کر اس کی صفائی ستھرائی کا خیال رکھو؛ اس لیے کہ بکری جنت کے جانوروں کی اقسام میں سے ہے یعنی ان کے مشابہ ہے اس کا فائدہ یہ ہے کہ انسان اس کو کم پیسوں میں خرید سکتا ہے اور تنگ حالی میں بھی اس کے دودھ سے اپنا پیٹ بھر سکتا ہے، نیز وہ ایک مسکین اور سیدھا سادھا جانور ہے، یہاں تک کہ تم اس کے باڑے میں نماز پڑھ سکتے ہو؛ کیونکہ وہ زیادہ اُچھلتی کودتی نہیں ہے اور پیشاب اور مینگنیاں بھی زیادہ نہیں ہوتی کہ پورے باڑے کو ملوث کر دے۔

اور فرمایا کہ لوگوں پر فتنوں کا ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ بکریوں کے ایک ریوڑ ہی کو وہ غنیمت سمجھے گا جنہیں لے کر وہ دُور دراز علاقوں میں نکل جائے گا اور قلعہ اور محلات اس کے لیے فائدہ ثابت نہیں ہوں گے؛ کیونکہ ان محلات اور شہروں میں اسے اپنے ایمان اور جان دونوں کا خطرہ لاحق ہوگا۔

لغات: دواب واحد دابة: جانور، سواری۔ صفحة (ج) صفحات: طشت، تھال۔
اشبع اشباعًا: کھلانا، پیٹ بھرنا۔ أصاب أصابه: لینا، پڑنا۔
رُعام، مخاط رقیق. أطاب أطاباً: عمدہ کرنا اچھا بنانا۔
مُراح: رات میں بکریوں کے ٹھہرنے کی جگہ، باڑہ۔ ثُلَّةٌ الطائفة القليلة.

عَنْ أَبِيْ نُعَيْمٍ وَهْبِ ابْنِ كَيْسَانَ قَالَ أُتِيَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِطَعَامٍ وَمَعَهُ رَبِيْبُهُ عُمَرُ بْنُ أَبِيْ سَلَمَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَمِّ اللهَ وَكُلْ مِمَّا يَلِيْكَ.

ترجمہ: ابونعیم اور وہب ابن کیسان سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کھانا لایا گیا اور آپ کے پاس آپ کے ربیب (حضرت اُمِ سلمہ کے بیٹے) عمر ابن ابی سلمہ بھی تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: اے لڑکے! اللہ کا نام لو اور جو تمہارے قریب ہو اس میں سے کھاؤ۔

تشریح: تسمیہ سے مراد کھانا شروع کرتے وقت بسم اللہ پڑھنا ہے جیسا کہ

ترمذی اور ابوداؤد کی روایت میں صراحت ہے: عن عائشة رضي الله عنها مرفوعًا: "إذا أكل أحدكم طعامًا فليقل بسم الله فإن نسي في أوله فليقل بسم الله في أوله وآخره"

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ پوری بسم اللہ پڑھنا افضل ہے، اگرچہ سنت صرف "بسم اللہ" کہنے سے بھی ادا ہوجائے گی اور اس کے حکم بارے میں امام نوویؒ نے سنت ہونے پر اجماع نقل کیا ہے۔

محلیٰ میں ہے کہ بسم اللہ پڑھنا مستحب ہے جس کا مقصد شیطان کو بھگانا اور اس کو کھانے میں شریک ہونے سے روکنا ہے، نیز اس بات کی تعلیم دینا مقصد ہے کہ بندہ کے سامنے جب رزق آئے تو اللہ کی نعمت کے شکریہ میں اللہ کا نام لیا جائے۔

دوسری بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان فرمایا: کہ اگر ایک ہی قسم کا کھانا ہو تو اپنے سامنے سے کھاؤ، تاہم مختلف قسم کی اشیاء دسترخوان پر موجود ہوں تو جو پسند ہو اسے لینے میں کوئی حرج نہیں۔

اس کی حکمت علماء نے یہ بیان فرمائی ہے کہ پوری پلیٹ سے کھانے میں حرص ولالچ کا مظاہرہ ہوتا ہے، نیز ممکن ہے ساتھ میں کھانے والے کو تقذر محسوس ہو؛ نیز کھانے کے درمیان میں برکت نازل ہوتی رہتی ہے۔

عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيْدٍ قَالَ سَمِعْتُ الْقَاسِمَ بْنَ مُحَمَّدٍ يَقُوْلُ جَاءَ رَجُلٌ إِلَى عَبْدِ اللهِ بْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ الله عَنْهُمَا فَقَالَ لَهُ إِنَّ لِي يَتِيْمًا وَلَهُ إِبِلٌ فَأَشْرَبُ مِنْ لَبَنِ إِبِلِهِ فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا إِنْ كُنْتَ تَبْغِيْ ضَالَّةَ إِبِلِهِ وَتَهْنَأُ جَرْبَاهَا وَتَلِيْطُ حَوْضَهَا وَتَسْقِيْهَا يَوْمَ وُرُوْدِهَا فَاشْرَبْ غَيْرَ مُضِرٍّ بِنَسْلٍ وَلَا نَاهِكٍ فِي الْحَلْبِ.

ترجمہ: یحییٰ بن سعید نے فرمایا: میں نے قاسم بن محمد کو فرماتے سنا کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے کہا میرے

پاس ایک یتیم رہتا ہے کیا میں اس کی اونٹنی کا دودھ پی سکتا ہوں؟ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے اس سے کہا کیا تم اس کی اونٹنی کے گم ہوجانے پر اسے تلاش کرتے ہو؟ اور کیا اونٹنی کے کھجلی ہوجانے پر اسے دوا لگاتے ہو؟ اور کیا اس کے (کھانے پینے) کے حوض کو درست کرتے ہو؟ اور اس کی باری کے دن اس کو پانی پلاتے ہو؟ اگر یہ سب کام انجام دیتے ہو) تو تم اس کے اونٹنی کا دودھ پی سکتے ہو، بشرطیکہ تمہارے دودھ استعمال کرنے کی وجہ سے اونٹنی کے بچوں کو نقصان نہ ہو (یعنی وہ بھوکے نہ رہ جائیں) اور نہ تم مبالغہ کرو، دودھ دوہنے میں (اتنا مت دوہو کہ اس کے تھنوں میں کچھ نہ رہے)۔

تشریح: احادیثِ مبارکہ میں یتیم کی کفالت کرنے والے کے لیے بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یتیم کی کفالت کرنے والا میرے ساتھ جنت میں ہوگا؛ لیکن چونکہ یتیموں کے ساتھ بڑے مظالم ہوتے آرہے تھے، ان کے مال وجائداد کو برباد کردیا جاتا تھا؛ اس لیے قرآنِ کریم نے اس بارے میں سخت احکام بیان فرمائے؛ چنانچہ فرمایا: جو شخص ظلماً یتیم کا مال کھاتا ہے تو وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ بھرتا ہے اور احادیث میں بھی یتیم کے مال میں خرد برد کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

مالِ یتیم میں تصرف کرنے کا مسئلہ:

اگر والئ یتیم مالدار ہو جسے دوسرے کے پیسے کی احتیاج نہ ہو تو ایسے شخص کے لیے مالِ یتیم سے کھانا بالاتفاق حرام ہے اور اگر والئ یتیم محتاج اور ضرورت مند ہے تو پھر اس کے لیے یتیم کے مال میں تصرف کرنا امام ابوبکر جصاص رازیؒ کے نزدیک اس حالت میں بھی حرام ہے، ان کی دلیل آیتِ باری ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی (الآیۃ)﴾ ہے۔

اور جمہور حنفیہ، شوافع اور مالکیہؒ کے نزدیک ایک حد اور دائرہ میں رہ کر محتاج والی کو تصرف مالِ یتیم کی اجازت ہے، ان حضرات کی دلیل ارشادِ باری ﴿وَمَنْ كَانَ فَقِیْرًا فَلْیَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ ہے یعنی والی یتیم اگر مالدار نہ ہو تو قاعدہ اور اعتدال کے ساتھ یتیم

کا مال استعمال کرسکتا ہے۔ (امام جصاصؒ نے بالمعروف کے بارے میں فرمایا: اس کا تعلق والی کے اپنے مال سے ہے کہ اپنے مال کو حساب سے خرچ کرے، یتیم کے مال کی احتیاج نہ رہے) پھر جن لوگوں نے اکل کی اجازت دی ہے، ان کے درمیان اس بارے میں اختلاف ہے، آیا یہ خرچ کرنا بطورِ قرض ہوگا جس کا لوٹانا ضروری ہے؟ یا پھر بطورِ اجرت ہوگا؟

تو حنفیہؒ اور شوافعؒ کی ایک روایت کے مطابق اور مالکیہؒ اور حنابلہؒ سب کے نزدیک اس پر لوٹانا لازم نہیں ہے؛ بلکہ یہ اس کے کام کا عوض ہوگا، حدیثِ باب سے ان لوگوں نے استدلال کیا ہے اور اسی طرح کی ایک حدیث ابوداؤد میں آئی ہے: أن رجلًا أتى النبي صلى الله عليه وسلم فقال إني فقير ليس لي شيئ ولي يتيم، قال فقال كل من مال يتيمك غير مسرف ولا مبادر ولا متأثل. (ابوداؤد)

اس کے برخلاف ابوالعالیہ وعَبِیدۃ السلمانی اور شافعیہ کی دوسری روایت کے مطابق یتیم کے والی کا اس کے مال میں سے خرچ کرنا بطورِ قرض ہے اور اس کا تاوان اس پر لازم ہے؛ اس لیے کہ یہ دوسرے کا مال ہے، ضرورت کے وقت اس کی اجازت دی گئی ہے۔

(الموسوعۃ الفقہیہ: ۱۶۶/۴۵)

لغات: تبغي (ض) بغية تطلب وتنشد. ضالّة إبلة (ض) ضالًا: گم ہوجانا، راستہ بھول جانا۔ تهنأ (ف) هنأ: ملنا، دواء لگانا، ہنا نامی دوا لگانا۔ والجربي مؤنث أجرب: خارش زدہ۔ تليط (ض) ليطًا، لاطه الحوض اصلحه: درست کرنا، مٹی وغیرہ لگاکر چکنا کرنا۔ حوض (ج) حياض: پانی بھرنے کی جگہ۔ يوم وردها أي يوم شربها: مطلب یہ ہے کہ پہلے زمانہ میں کنویں وغیرہ پر پانی کے پلانے کی باری ہوا کرتی تھی۔

غير مضر بنسل أي لاتوصل المضرة بولد الإبل الرضيع بأن تشرب تمام اللبن ويبقى جوعانا.

نَهَكَ (ف) نهكًا: کسی چیز کو جڑ سے اکھاڑ دینا بالکل ختم کردینا، مبالغہ کرنا، أي

لاتبالغ فی الحلب: یعنی اتنا دودھ مت دوہ لو کہ اس کے تھنوں میں کچھ بھی باقی نہ رہے۔

عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ أَبِيهِ أَنَّهُ كَانَ لَا يُؤْتَى أَبَداً بِطَعَامٍ أَوْ شَرَابٍ حَتَّى الدَّوَاءِ فَيَطْعَمُهُ أَوْ يَشْرَبُهُ حَتَّى "يَقُولُ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي هَدَانَا وَأَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَنَعَّمَنَا وَاللهُ أَكْبَرُ اَللّٰهُمَّ اَلْفَتْنَا نِعْمَتُكَ بِكُلِّ شَرٍّ فَأَصْبَحْنَا مِنْهَا وَأَمْسَيْنَا بِكُلِّ خَيْرٍ نَسْأَلُكَ تَمَامَهَا وَشُكْرَهَا لَا خَيْرَ إِلَّا خَيْرُكَ لَا إِلٰهَ غَيْرُكَ إِلٰهَ الصَّالِحِيْنَ وَرَبَّ الْعٰلَمِيْنَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ مَا شَاءَ اللهُ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللهِ اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيمَا رَزَقْتَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ.

ترجمہ: ہشام اپنے والد عروہ کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ جب بھی ان کے پاس کھانے یا پینے کی کوئی چیز لائی جاتی حتیٰ کہ دوا بھی تو وہ اس کھانے اور پینے کے بعد یہ دعا پڑھتے تھے، الحمد للہ الخ! ترجمہ: تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے ہمیں ہدایت دی، کھلایا اور پلایا اور ہمیں بے شمار نعمتیں عطا کی گئیں، وہ سب سے بڑا ہے، اے اللہ! تیری نعمت ہمارے پاس اس وقت آئی جب ہم شر و معصیت میں پڑے ہوئے تھے، ہم نعمتوں کے ساتھ صبح کرتے ہیں اور ہر بھلائی کے ساتھ شام کرتے ہیں، بس ہم آپ کی نعمت کی تکمیل اور اس کا دوام چاہتے ہیں اور شکر چاہتے ہیں (یعنی شکر ادا کرنے کی توفیق دیجیے؛ تاکہ یہ زیادتیٔ نعم کا سبب بنے) آپ کے علاوہ کوئی بھلائی نہیں، آپ کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے، اے نیکوکاروں کے معبود! اور تمام جہانوں کے رب! تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، ماشاء اللہ لاقوۃ الا باللہ، اے اللہ! جو آپ نے ہمیں عنایت فرمایا ہے، اس میں برکت نازل فرما اور ہم کو عذاب سے بچا لے۔

تشریح: عروہ اس دعاء کو کھانے سے پہلے پڑھتے تھے یا بعد میں؟ اس بارے میں دونوں احتمال ہیں:

کھاتے وقت اس طرح لمبے اذکار کی ترغیب خود نبی نے بھی فرمائی ہے؛ چنانچہ آپ

صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر بن سلمہ کو فرمایا تھا: کھانے سے پہلے تسمیہ پڑھو اور تسمیہ میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کافی ہے اور اللہ کی تعریف کرو اور الحمد للہ رب العالمین کہنا کافی ہے اور جو شخص اس پر اضافہ کر دے تو اس نے اچھا کام کیا اور اللہ کا ذکر کرنا، اس کا شکر ادا کرنا ہے اور شکر ادا کرنا نعمتوں کے اضافہ کا سبب ہے۔

سُئِلَ مَالِكٌ هَلْ تَأْكُلُ الْمَرْأَةُ مَعَ غَيْرِ ذِي مَحْرَمٍ مِنْهَا أَوْ مَعَ غُلَامِهَا فَقَالَ مَالِكٌ لَيْسَ بِذٰلِكَ بَأْسٌ إِذَا كَانَ ذٰلِكَ عَلٰى وَجْهِ مَا يُعْرَفُ لِلْمَرْأَةِ أَنْ تَأْكُلَ مَعَهُ مِنَ الرِّجَالِ. قَالَ وَقَدْ تَأْكُلُ الْمَرْأَةُ مَعَ زَوْجِهَا وَمَعَ غَيْرِهِ مِمَّنْ يُؤَاكِلُهُ أَوْ مَعَ أَخِيهَا عَلٰى مِثْلِ ذٰلِكَ وَيُكْرَهُ لِلْمَرْأَةِ أَنْ تَخْلُوَ مَعَ الرَّجُلِ لَيْسَ بَيْنَهُ وَبَيْنَهَا حُرْمَةٌ.

ترجمہ وتشریح: حضرت امام مالکؒ سے مسئلہ معلوم کیا گیا: عورت غیر محارم کے ساتھ یا اپنے غلام کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاسکتی ہے؟ امام مالکؒ نے جواب دیا اس میں کوئی حرج نہیں ہے جبکہ معروف طریقہ پر ہوں یعنی جہاں مردوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانے کا رواج ہو (پھر وضاحت فرمائی) کہ عورت کبھی کھانا کھاتی ہے اپنے شوہر کے ساتھ اور دوسروں کے ساتھ جن کو وہ کھانا کھلاتے ہیں یا اسی طرح اپنے بھائی کے ساتھ (آخر میں) فرمایا کہ عورت کے لیے مردوں کے ساتھ اختلاط کرنا مکروہ ہے جبکہ اس کے اور اس کے مرد کے درمیان کوئی محرم نہ ہو۔

خلاصہ: یہ ہے کہ عورت کے ساتھ اس کا شوہر یا اس کے محارم موجود ہوں تو غیر محارم کے ساتھ بیٹھ کر کھانا جائز ہے؛ کیونکہ اس وقت اس کا چہرہ اور ہتھیلیاں کھلیں گی اور غیر محارم کے ساتھ ان کا کھولنا جائز ہے، بشرطیکہ اس طرح کا عرف بھی ہو یعنی فتنہ کا خوف نہ ہو اور لوگ بھی شر و فساد والے نہ ہوں اور اگر اس کے ساتھ اس کا کوئی محرم موجود نہ ہو تو پھر اس طرح مردوں کے ساتھ کھانا مکروہِ تحریمی ہے؛ کیونکہ مرد اور عورت کے لیے خلوت اختیار کرنے سے شریعت نے منع فرمایا ہے۔

واضح رہے کہ یہ فتویٰ خیر القرون کا ہے، ہر حال میں آج کے اس پُرفتن دَور میں اس طرح مردوں اور عورتوں کا اختلاط اگر چہ ان کے ساتھ غیر ہی کیوں نہ ہو، انتہائی شرمناک اور ناپسندیدہ ہے؛ اس لیے مذکورہ فتویٰ سے آج کی شادیوں میں ہونے والی بے حیائیوں اور برہنگی پر استدلال نہیں کیا جاسکتا۔

مَا جَاءَ فِيْ أَكْلِ اللَّحْمِ

(گوشت کھانے کا بیان)

عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيْدٍ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالىٰ عَنْهُ قَالَ إِيَّاكُمْ وَاللَّحْمَ فَإِنَّ لَهُ ضَرَاوَةً كَضَرَاوَةِ الْخَمْرِ.

ترجمہ: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا: اے لوگو! تم زیادہ گوشت کھانے سے بچو؛ اس لیے کہ اس کی بھی ایک عادت ہوتی ہے شراب کی عادت کی طرح۔

تشریح: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا بہت زیادہ گوشت مت کھایا کر؛ کیونکہ جو لوگ زیادہ گوشت کھاتے ہیں ان کو گوشت کی ایسی ہی لت لگ جاتی ہے جیسے ایک شراب پینے والے کو شراب کی لگ جاتی ہے اور جب اسے اپنا مطلوب نہیں ملتا تو بے چین اور بے تاب رہتا ہے، گویا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اقتصاد اور درمیانہ روی کی تعلیم دی ہے کہ گوشت کو اعتدال کے ساتھ استعمال کیا جائے اور اس کے کھانے کی ایسی عادت نہ ڈالی جائے کہ گوشت نہ ملنے پر بے چینی اور پریشانی محسوس ہونے لگے؛ کیونکہ گوشت ایک قیمتی چیز ہے، اس کا ہر وقت مہیا ہونا مشکل ہے، نیز روزانہ گوشت کھانا ٹھاٹھ اور رفاہیت ہے جو مؤمن کے شایانِ شان نہیں ہے؛ بلکہ ایک مؤمن کی شان یہ ہے کہ وہ قناعت کے ساتھ جو بروقت حاضر ہو جائے اس پر اکتفاء کرلے۔

واضح رہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مقصد گوشت سے نفرت یا اسے چھوڑ دینے کا حکم دینا نہیں ہے؛ کیونکہ دیگر احادیث میں گوشت کی بڑی فضیلت وارد ہوئی ہے؛ چنانچہ

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ''خير الإدام اللحم، وهو سيّد الإدام'' اور حضرت یزید کی روایت میں ''سيّد الإدام في الدنيا والآخر اللحم'' جیسی روایات سے گوشت کی فضیلت معلوم ہوتی ہے؛ لیکن ہر چیز کے اندر اعتدال اور میانہ روی اختیار کرنا ایک عمدہ صفت ہے۔

لغت: ضراوة بفتح الضاد وخفة الراء–عادة.

عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ أَدْرَكَ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللهِ وَمَعَهُ حَمَّالُ لَحْمٍ فَقَالَ مَا هٰذَا فَقَالَ يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِيْنَ قَرِمْنَا إِلَى اللَّحْمِ فَاشْتَرَيْتُ بِدِرْهَمٍ لَحْمًا فَقَالَ عُمَرُ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَمَا يُرِيْدُ أَحَدُكُمْ أَنْ يَّطْوِيَ بَطْنَهُ عَنْ جَارِهِ أَوِ ابْنِ عَمِّهِ أَيْنَ تَذْهَبُ عَنْكُمْ هٰذِهِ الْاٰيَةُ ﴿أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِيْ حَيٰوتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا﴾.

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ملاقات جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے ہوئی، اس حال میں کہ ان کے ساتھ گوشت اٹھانے والا ایک شخص تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا یہ کیا ہے؟ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: اے امیر المؤمنین! ہمیں گوشت کی چاہت ہوئی تھی تو میں نے ایک درہم کا گوشت خرید لیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا تم میں سے کوئی نہیں چاہتا کہ وہ اپنے پیٹ کو خالی رکھے اپنے پڑوسی اور اپنے چچازاد بھائی کی خاطر، تم لوگوں سے آیتِ کریمہ ﴿أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ الْاٰية﴾ کہاں غائب ہوگئی؟ ترجمہ: تم اپنی لذت کی چیزیں سب دنیا میں ہی حاصل کر چکے اور ان کا خوب مزہ اٹھا چکے۔

تشریح: شراح فرماتے ہیں غالباً قحط کے زمانہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ملاقات حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ہوئی تھی؛ اس لیے آپ رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا صرف اپنی خواہشات اور لذات میں مشغول مت رہو؛ بلکہ اپنے نفس پر قابو رکھو، اپنے پڑوسیوں اور اپنے رشتہ داروں کا بھی خیال رکھو اور ایثار و قربانی کا مظاہرہ کرو، اس مختصر سی زندگی

میں ہی لذت اور عیش وآرام اٹھانے اور مرغوب غذاؤں کے حصول کی کوشش میں مت رہو؛ بلکہ یہاں کی سختیوں اور پریشانیوں کو جھیل کر آخرت کے اجر وثواب کو بڑھالو، کہیں ایسا نہ ہو کہ آخرت میں کہہ دیا جائے تم اپنی تمام لذت اور راحت آرام کو دنیا میں حاصل کر چکے اور ان سب سے خوب خوب فائدہ اٹھا چکے، اب آخرت میں تمہارے حصہ میں کچھ نہیں ہے۔

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں: اس آیت میں زہد اور ترکِ دنیا کی ترغیب دی گئی ہے۔

خلاصہ: اس روایت میں ایک بہت قیمتی نصیحت ہے کہ کامل مؤمن کا یہ شیوہ نہیں ہے کہ وہ اپنی لذات وخواہشات کی تکمیل میں مست رہے؛ بلکہ زہد وقناعت کے ساتھ زندگی گزارے، نیز اپنے پڑوسیوں کا خوب خیال رکھے؛ کیونکہ اس دنیا کی مشقت اور پریشانیاں آخرت میں بلندئ درجات کا سبب ہیں جو ہر ایک مؤمن کا مقصود ہے۔

لغات: حمال بکسر الحا: بوجھ وبالفتح الحال وتشدید المیم: قلی سامان اٹھانے والا۔

قَرِمْنا: بفتح الكاف وكسر الراء من القرم: گوشت کھانے کی اتنی خواہش جس پر صبر نہ ہو سکے۔

أن يطوي بطنه عن جاره أي أليس يريد أحدكم أن يجيع نفسه ويؤثر جاره بطعامه- طوى فهو طاو خالي البطن.

مَا جَاءَ فِيْ لُبْسِ الْخَاتَمِ

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ تَعَالىٰ عَنْهُمَا أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَلْبَسُ خَاتَمًا مِنْ ذَهَبٍ ثُمَّ قَامَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَنَبَذَهُ وَقَالَ لَا أَلْبَسُهُ أَبَدًا فَنَبَذَ النَّاسُ خَوَاتِيْمَهُمْ.

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سونے کی انگوٹھی پہنتے تھے، پھر ایک دن (منبر پر) کھڑے ہوئے اور سونے کی

انگوٹھی کو ہاتھ سے نکال کر پھینک دیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں اسے کبھی نہیں پہنوں گا، پھر لوگوں نے بھی اپنی انگوٹھیاں پھینک دیں۔

سونے اور چاندی کی انگوٹھی کا حکم

تمام فقہاء اور علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ سونے کی انگوٹھی مردوں کے لیے حرام ہے اور عورتوں کے لیے جائز ہے، جیسا کہ حدیثِ باب سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حرمت کا حکم نازل ہونے سے پہلے سونے کی انگوٹھی پہنا کرتے تھے جب حرمت نازل ہوگئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھینک دیا۔

لیکن عمرو بن حزم اور اسحاق بن راہویہ کے نزدیک سونے کی انگوٹھی مردوں کے لیے بھی جائز ہے، اسی طرح صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے براء بن عاذب، حذیفہ بن یمان، سعد بن وقاص، طلحہ بن عبیدہ رضی اللہ عنہم بھی جواز کے قائل تھے جیسا کہ مصنف ابن عبدالرزاق میں مختلف آثار بیان کیے گیے ہیں، اس کا جواب ہے کہ یا تو آثار ضعیف ہیں یا پھر ان حضرات کا یہ موقف قبل النہی کا ہے۔

اس کے برخلاف چاندی کی انگوٹھی مرد وعورت دونوں کے لیے پہننا جائز ہے؛ البتہ بعض علماء نے چاندی کی انگوٹھی کو عام لوگوں کے لیے مکروہ قرار دیا ہے، ان کے نزدیک صرف بادشاہ یا قاضی کے لیے بلا کراہت جائز ہے، ان حضرات کا استدلال ابوریحانہ کی روایت سے ہے جس کی تخریج امام احمدؒ نے اپنی مسند میں کی ہے: "عن أبي ريحانة أن رسول الله صلى الله عليه وسلم نهى عن الخاتم إلا لذي سلطان".

جبکہ اکثر فقہاء رحمہم اللہ نے عام وخاص ہر ایک کے لیے چاندی کی انگوٹھی کو جائز قرار دیا ہے۔

اور جمہور کا استدلال اس روایت سے ہے جس میں ہے: "أن النبي لما اتخذ خاتما من ذهب اتخذ الناس أيضا. (مسلم شریف)

اور ایک روایت میں ہے: ثم اتخذ خاتما من ورق، ونقش فيه محمد رسول الله، وقال صلى الله عليه وسلم: لاينقش أحد بنقش خاتمي هذا، اس روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انگوٹھی بنانے سے منع نہیں فرمایا؛ بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش جیسے نقش بنانے سے منع فرمایا ہے۔

اور ابوریحانہ کی حدیث کے بارے میں حافظ ابنِ حجرؒ نے ''فتح الباری'' میں بیان کیا ہے کہ امام مالکؒ سے جب اس حدیث کے بارے میں معلوم کیا گیا تو انہوں نے اس کو ضعیف قرار دیا اور اسی سلسلہ میں امام مالکؒ نے صدقہ بن یسار کے استفتاء کو نقل کیا ہے جو انہوں نے سعید بن مسیب سے معلوم کیا تھا، سعید بن مسیّبؒ نے جواب دیا کہ: چاندی کی انگوٹھی پہنوں اور جو لوگ منع کرتے ہیں ان کو خبر دیدو کہ چاندی کی انگوٹھی کے عام جواز کا فتویٰ میں نے دیا ہے۔

اور اگر ابوریحانہؓ کی حدیث صحیح مان لی جائے، تب بھی اس سے کراہتِ تنزیہی ثابت ہوتی ہے جیسا کہ علامہ خطابیؒ نے فرمایا کہ غیر بادشاہ اور قاضی کے لیے کراہت اس وجہ سے ہے کہ اس وقت انگوٹھی پہننے کا مقصد محض زینت ہوجاتا ہے، حافظ ابنِ حجرؒ نے بھی تقریباً اسی طرح کی بات بیان کی ہے کہ بلاضرورت عام لوگوں کے لیے انگوٹھی پہننا محض زینت ہونے کی وجہ سے خلافِ اولیٰ ہے؛ کیونکہ زیادہ زیب وزینت مردوں کے شایانِ شان نہیں ہے، تاہم اگر کوئی مرد انگوٹھی استعمال کرنا چاہے تو جائز ہے بشرطیکہ ایک مثقال سے کم وزن کی ہو، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی وجہ سے: اتخذه من ورق ولاتتمه مثقالا. (ابوداؤد)

مَاجَاءَ فِيْ نَزْعِ التَّعَالِيْقِ وَالْجَرَسِ مِنَ الْعَيْنِ

(نظر کے تعویذ اور گھنٹیوں کو گلے سے اتارنے کا بیان)

عَنْ عَبَّادِ بْنِ تَمِيْمٍ أَنَّ أَبَا بَشِيْرٍ الْأَنْصَارِيَّ أَخْبَرَهُ أَنَّهُ كَانَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ بَعْضِ أَسْفَارِهِ قَالَ فَأَرْسَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَسُوْلًا قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ أَبِيْ بَكْرٍ حَسِبْتُ أَنَّهُ قَالَ وَالنَّاسُ فِيْ مَقِيْلِهِمْ ''لَا تَبْقَيَنَّ فِيْ رَقَبَةِ بَعِيْرٍ قِلَادَةٌ مِنْ وَتَرٍ أَوْ قِلَادَةٌ إِلَّا قُطِعَتْ.
قَالَ مَالِكٌ علیہ الرحمۃ: أَرَىٰ ذٰلِكَ مِنَ الْعَيْنِ''.

ترجمہ: حضرت بشر انصاری رضی اللہ عنہ کسی سفر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قاصد بھیجا (عبداللہ بن ابوبکر کہتے ہیں میرا خیال ہے کہ انہوں نے کہا) لوگ اپنی اپنی آرام گاہوں میں تھے (اس قاصد نے لوگوں سے جا کر کہا) کہ کسی اونٹ کی گردن میں تانت یا کسی اور چیز کا کوئی قلادہ ہو تو اسے کاٹ دیا جائے۔

امام مالکؒ کہتے ہیں: میرا خیال ہے کہ (اونٹوں کو یہ قلادے) نظر کی وجہ سے پہنائے گئے تھے۔

تشریح: کسی جانور وغیرہ کے گلے میں اگر کوئی قلادہ یا تعویذ وغیرہ لٹکایا جائے تو دو حال سے خالی نہیں ہے: یا تو اس کا مقصد جمال اور خوبصورتی ہے یا پھر نظرِ بد سے بچانا ہے۔

لہٰذا اگر جانور کے گلے میں جمال اور خوبصورتی کے لیے قلادہ لٹکایا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اور اگر یہ مقصد ہو کہ اس کے ذریعہ جانور بُری نظر سے محفوظ رہے گا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے، پھر ممانعت کی وجہ کے بارے میں مختلف اقوال ہیں:

بعض علماء نے فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لیے منع فرمایا کہ اس میں علاج قبل المرض ہے اور بعض حضرات نے کہا کسی بھی قسم کا قلادہ اور تعویذ وغیرہ ڈالنا جائز ہی نہیں ہے۔

اور صحیح بات یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وجہ سے منع فرمایا ہے کہ جاہلیت میں لوگ جانور کے گلے میں کسی چیز کو لٹکا دیتے تھے اور ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اس

سے بُری نظر سے حفاظت رہے گی، دراصل ان کے اس عقیدۂ فاسدہ کو ختم کرنے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان کرایا کہ کسی جانور کے گلے میں کوئی قلادہ باقی نہ رہے، اسی کو امام مالکؒ نے سمجھا ہے، تاہم اگر کسی تعویذ میں غیر شرکیہ کلمات اور قرآن وحدیث کی آیات کو لکھ کر بطورِ حفاظت باندھ دیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

باب میں قلادہ کے ساتھ گھنٹی کا بھی ذکر ہے، اگرچہ حدیث میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں ہے؛ لیکن جانور کے گلے میں گھنٹی باندھنا بھی مکروہ ہے؛ کیونکہ گھنٹی وغیرہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزامیر شیاطین قرار دیا ہے، لہٰذا گھنٹیوں کو بھی اُتار پھینک دینا چاہیے۔

علاج ومعالجہ کا بیان

انبیاء طبیبِ روحانی ہوا کرتے ہیں، جن کا مقصد گمراہیت کی تاریکی میں پڑی انسانیت کو رشد وہدایت کی روشنی میں لانا تھا، طبِّ جسمانی انبیاء کے اغراض ومقاصد میں شامل نہیں، تاہم خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف امراض کے سلسلہ میں کچھ علاج ومعالجہ بھی منقول ہے، اس کو محدثین ابواب الطب کے تحت ذکر کرتے ہیں، یہ شریعتِ محمدیہ کی جامعیت کی دلیل ہے۔

علاج ومعالجہ کی دو قسمیں ہیں:

(۱) منفرد یا مرکب ادویات، اور کھانے پینے کی اشیاء کے ذریعہ علاج، عرف میں اس کو طبِ جسمانی بھی کہتے ہیں، جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم اور اکثر علماء کے نزدیک مذکورہ طب اختیار کرنا جائز ہے، بعض غالی صوفیاء کا خیال ہے کہ مرض وغیرہ اللہ کی تقدیر سے ہے، اس کے مقابلہ میں علاج نہیں کرنا چاہیے؛ لیکن حدیث کی رو سے ان کا یہ خیال فاسد ہے؛ کیونکہ بے شک امراض کو پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے؛ لیکن امراض کے ازالہ کے ذرائع پیدا کرنے والا بھی اللہ ہی ہے اور جس طرح مرض وبیماری قضاء وقدر کے تابع ہیں اسی طرح علاج ومعالجہ بھی تقدیرِ الٰہی ہی سے ہے۔

(۲) قرآنی آیات، ذکر واذکار اور تعویذات کے ذریعہ علاج، عرف میں اسے علاجِ روحانی کہتے ہیں، اس کے حکم میں کچھ اختلاف ہے۔

حافظ ابنِ حجرؒ نے فرمایا: رقیہ اور تعویذ چار شرائط کے ساتھ باتفاق علماء جائز ہے:

(۱) یہ کہ وہ آیاتِ قرآنیہ، اسمائے حسنیٰ وغیرہ پر مشتمل ہو۔

(۲) عربی یا اس کے علاوہ ایسی زبان میں ہو جو معلوم المراد ہو۔

(۳) اس عقیدہ کے ساتھ ہو کہ یہ تعویذ بالذات مؤثر نہیں ہے، اس کی حیثیت صرف دوا کی ہے، مؤثر بالذات صرف اللہ تعالیٰ ہیں۔

(۴) کسی بھی قسم کے شرکیہ الفاظ پر مشتمل نہ ہو۔ (فتح الباری)

اس طرح کے تعویذات کی خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی ہے؛ چنانچہ عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: "كنا نرقي في الجاهلية، فقلنا يا رسول الله! كيف ترىٰ في ذلك؟ فقال إعرضوا على رقاكم، لابأس بالرقى مالم يكن فيه شرك". (مسلم)

جب کہ کچھ لوگ جیسے ہمارے زمانہ کے غیر مقلدین تعویذ وغیرہ کو ناجائز سمجھتے ہیں، ان کی دلیل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: "إن الرقى والتمائم والتولة شرك" ہے، اس حدیث میں تمائم یعنی تعویذ کو شرک بتلایا گیا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ مذکورہ حدیث اور اسی مضمون کی حدیثوں کا تعلق جن میں تمائم کو شرک بتلایا گیا ہے اس صورت میں ہے جبکہ اسی تعویذ کو نافع وضار سمجھا جائے جیسا کہ لوگ زمانۂ جاہلیت میں اعتقاد رکھتے تھے، یا ان سے مراد وہ منتر اور تعویذات ہیں جو شرکیہ الفاظ اور مبہم عبارتوں پر مشتمل ہوں۔ (فیض القدیر: ۶/۱۰۷)

واضح رہے کہ تعویذ میں جس طرح پڑھ کر دم کرنا جائز ہے اسی طرح قرآنی آیات وغیرہ کو کسی کاغذ وغیرہ پر لکھ کر لٹکانا بھی جائز ہے۔

چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سونے کی حالت میں ڈر جانے کے وقت

پڑھی جانے والی دعا کو اپنے بالغ بچوں کو سکھلاتے تھے اور نابالغوں کی گردن میں لکھ کر باندھ دیتے تھے۔

فائدہ: جاننا چاہیے مذکورہ دونوں قسموں کے علاج و معالجہ کے علاوہ احادیث میں کچھ ایسی چیزوں سے علاج کا ذکر ہے جن کا تعلق ادویات یا دعا و ذکر سے نہیں ہے؛ بلکہ کچھ عمل ہیں جو زمانۂ جاہلیت میں رائج تھے اور وہ تجربات و مشاہدات کا نتیجہ تھے، ان میں جو مناسب تھے ان کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے برقرار رکھا، مثلاً نظر کو ختم کرنے کے لیے غسل یا وضو کرانا اور عملِ کئی وغیرہ۔

ملحوظہ: احادیث میں جن علاج کو ذکر کیا گیا ہے ان کو عمل میں لانے کے لیے دو باتیں جاننی ضروری ہیں، ایک: مرض کی پہچان، بعض امراض پیچیدہ ہوتے ہیں اور بعض امراض مشابہ ہوتے ہیں؛ اس لیے آنکھ بند کر کے کسی نسخہ پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔

دوم: دواء کے استعمال کا طریقہ جاننا ضروری ہے یعنی یہ علم ضروری ہے کہ دوا مفرد استعمال کی جائے یا مرکب، پھر ہر دوا کی مقدار کیا ہو؟ اور دواء کی مقدار کتنی ہو اور کتنی مرتبہ استعمال کی جائے؟ ان باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے؛ کیونکہ بسا اوقات اپنی کوتاہی کی وجہ سے اگر شفاء نہ ہو تو انسان روایات و آیات کے متعلق شبہات میں نہ پڑ جائے، واللہ اعلم۔

(تحفۃ الالمعی: ۵/۳۷۱)

یہ مختصر سا بیان ان شاء اللہ مفید ثابت ہوگا۔

اَلْوُضُوْءُ مِنَ الْعَيْنِ

(نظر لگنے کی وجہ سے وضو کرانا)

مَالِكٌ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ أَبِي أُمَامَةَ بْنِ سَهْلِ بْنِ حُنَيْفٍ يَقُوْلُ اغْتَسَلَ أَبِي سَهْلُ ابْنُ حُنَيْفٍ بِالْخَرَّارِ فَنَزَعَ جُبَّةً كَانَتْ عَلَيْهِ وَعَامِرُ بْنُ رَبِيْعَةَ يَنْظُرُ قَالَ وَكَانَ سَهْلٌ رَجُلًا أَبْيَضَ حَسَنَ الْجِلْدِ قَالَ فَقَالَ لَهُ عَامِرُ بْنُ رَبِيْعَةَ مَا

رَأَيْتُ كَالْيَوْمِ وَلَا جِلْدَ عَذْرَاءَ. قَالَ فَوُعِكَ سَهْلٌ مَكَانَهُ وَاشْتَدَّ وَعْكُهُ فَأَتَى رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَخْبَرَ أَنَّ سَهْلًا وُعِكَ وَأَنَّهُ غَيْرُ رَائِحٍ مَّعَكَ يَا رَسُوْلَ اللهِ فَأَتَاهُ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَخْبَرَهُ سَهْلٌ بِالَّذِي كَانَ مِنْ شَأْنِ عَامِرٍ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَامَ يَقْتُلُ أَحَدُكُمْ أَخَاهُ أَلَّا بَرَّكْتَ عَلَيْهِ إِنَّ الْعَيْنَ حَقٌّ تَوَضَّأْ لَهُ فَتَوَضَّأَ لَهُ عَامِرٌ فَرَاحَ سَهْلٌ مَعَ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ بِهِ بَأْسٌ.

ترجمہ: ابوامامہ بن سہل ابنِ حنیف سے روایت ہے کہ میرے والد ماجد سہل بن حنیف نے مقامِ خرار پر غسل کیا اور اپنا جبہ جو وہ پہنے ہوئے تھے اسے اُتار دیا، عامر بن ربیعہ انہیں دیکھ رہے تھے، کہتے ہیں سہل گورے، خوبصورت شخص تھے، عامر بن ربیعہ نے ان سے کہا میں نے آج کی طرح کسی دوشیزہ کی کھال کو بھی نہیں دیکھا، سہل کو فوراً بخار چڑھ گیا اور تیز ہو گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے خبر دی کہ سہل کو بخار ہو گیا ہے اور وہ آپ کے پاس آنے پر قادر نہیں ہیں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم بذاتِ خود سہل کے یہاں تشریف لائے تو سہل نے عامر بن ربیعہ کے ساتھ پیش آنے والے واقعہ کی خبر دی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کیا تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو قتل کرنا چاہتا ہے؟ جب تم نے اپنے بھائی کو دیکھا تو برکت کی دعا کیوں نہیں دی، نظر کا لگنا حق ہے، عامر بن ربیعہ سے فرمایا: ان کے لیے وضو کرو؛ چنانچہ انہوں نے وضو کیا (وہ پانی ان پر بہادیا گیا) اور بلا مشقت وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ روانہ ہو گئے۔

تشریح: نظرِ بد کا اثر ایک مسلم حقیقت ہے جو تقدیرِ الٰہی سے متعلق ہے، حق تعالیٰ نے سحر و جادو کی طرح بعضوں کی نظروں میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ جس چیز کو لگ جاتی ہے اس کی ہلاکت ونقصان کا ذریعہ بن جاتی ہے، جمہور اہلِ حق کا یہی مسلک ہے، جبکہ معتزلہ اس کے منکر ہیں، وہ کہتے ہیں جس چیز کا مقدر ہو چکا ہے اس میں شئ آخر کا دخل نہیں ہوسکتا ہے۔

رہی یہ بات کہ نظر لگنے کی کیفیت اور صورت کیا ہوتی ہے؟ تو بعض لوگ کہتے ہیں کہ نظر لگانے والے کی آنکھ سے ایک خاص قسم کی حرارت سمیہ نکلتی ہے جو ہوا میں مخلوط ہو کر نظر زدہ تک پہنچتی ہے، تو اس کے نقصان کا باعث بن جاتی ہے، جیسا کہ بعض سانپوں کی آنکھ سے قوتِ سمیہ نکلتی ہے، بعض لوگ کہتے ہیں نظر لگانے والے کی آنکھ سے دکھائی نہ دینے والا کوئی مادہ نکل کر نظر زدہ کے مسامات سے اندر نفوذ کر جاتا ہے اور وہی نقصان کا باعث بن جاتا ہے؛ پس اللہ تعالیٰ نے جس طرح بعض لوگوں کی نظر میں مذکورہ خصوصیت وتاثیر پیدا کی ہے؛ اِسی طرح خدا تعالیٰ نے نظر لگ جانے پر اس کے مختلف علاج بھی سمجھائے ہیں۔

ان علاجوں میں سے ایک علاج نظر لگانے والے کو وضو کرانا ہے، امام نوویؒ نے اس کی صورت یہ بیان کی ہے کہ جس شخص کے بارے میں یہ تحقیق ہو کہ اس کی نظر لگی ہے اس کے سامنے کسی برتن وغیرہ میں پانی لایا جائے، اس برتن کو زمین پر نہ رکھا جائے، پھر نظر لگانے والا اس برتن میں سے ایک چلو پانی لے کر کلی کرے اور اس کلی کو اسی برتن میں ڈالے، پھر اس میں سے پانی لے کر اپنا منہ دھوئے، پھر بائیں ہاتھ میں پانی لے کر دائیں کہنی اور دائیں ہاتھ میں پانی لے کر بائیں کہنی دھوئے اور ہتھیلی وکہنی کے درمیان جگہ کو نہ دھوئے، پھر اپنا داہنا پیر اور پھر اس کے بعد بایاں پیر دھوئے، پھر اسی طرح پہلے داہنا گھٹنا اور بعد میں بایاں گھٹنا دھوئے اور پھر آخر میں تہ بند کے اندر زیر ناف جسم کو دھوئے اور ان سب اعضاء کو اسی برتن میں دھویا جائے، ان سب کو دھونے کے بعد اس پانی کو نظر زدہ کے اوپر اس کی پشت اور پیر پر ڈال دیا جائے۔

اس کا ادنیٰ فائدہ تو یہ ہوتا تھا کہ مریض کے دل سے وہم ختم ہو جاتا ہے؛ لیکن اس طرح کے علاج کا تعلق اسرار وحکم سے ہے جو عقل کی رسائی سے بالاتر ہے، ابنِ قیمؒ نے کہا اس طریقہ کے بارے میں جس کو شک ہو یا جو اس کا مذاق اُڑائے اس کے لیے یہ طریقہ نفع بخش ثابت نہ ہوگا۔

مارزیؒ نے کہا مذکورہ اعضاء جسم کو دھونے کا حکم وجوب کے طور پر ہے، لہٰذا نظر لگانے

والے کو اس پر مجبور کیا جا سکتا ہے، خصوصاً اس وقت جبکہ نظر زدہ کے ہلاک ہونے کا خوف ہو۔

إلا برّكت: اس سے معلوم ہوا کہ جب کوئی خوبصورت اور اچھی چیز دیکھے تو برکت کی دعا دے اور ماشاء اللہ کہہ دے، تو نظر لگنے سے حفاظت رہے گی۔

لغات: عذراء أي البكر، العذر الحجاب الذي في فرجها.

وُعك بناء المجهول أي حُمَّ.

علَّامَ اصله "على ما" أي لأي شيئ، قال الزرقاني، علام بمعنى لِمَ وفيه معنى الإنكار.

برّكت، أي هلّا قلت بارك الله فيك.

بالخرار: موضع قرب الجحفة.

عَنْ أَبِيْ أُمَامَةَ بْنِ سَهْلِ بْنِ حُنَيْفٍ أَنَّهُ قَالَ رَأىٰ عَامِرُ بْنُ رَبِيْعَةَ سَهْلَ بْنِ حُنَيْفٍ يَغْتَسِلُ قَالَ مَا رَأَيْتُ كَالْيَوْمِ وَلَا جِلْدَ مُخَبَّأَةٍ فَلُبِطَ بِسَهْلٍ مَكَانَهُ فَأُتِيَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ هَلْ لَكَ فِيْ سَهْلِ بْنِ حُنَيْفٍ وَاللّٰهِ مَا يَرْفَعُ رَأْسَهُ قَالَ هَلْ تَتَّهِمُوْنَ لَهُ أَحَداً فَقَالُوْا نَتَّهِمُ عَامِرَ بْنَ رَبِيْعَةَ قَالَ فَدَعَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَامِراً فَتَغَيَّظَ عَلَيْهِ وَقَالَ عَلَامَ يَقْتُلُ أَحَدُكُمْ أَخَاهُ أَلَّا بَرَّكْتَ. اغْتَسِلْ لَهُ فَغَسَلَ عَامِرٌ وَّجْهَهُ وَيَدَيْهِ وَمِرْفَقَيْهِ وَرُكْبَتَيْهِ وَ أَطْرَافَ رِجْلَيْهِ وَدَاخِلَةَ إِزَارِهِ فِيْ قَدَحٍ ثُمَّ صُبَّ عَلَيْهِ فَرَاحَ سَهْلٌ مَعَ النَّاسِ لَيْسَ بِهِ بَأْسٌ.

ترجمہ: ابو امامہ بن سہل بن حنیف روایت کرتے ہیں کہ عامر بن ربیعہ نے ان کے والد سہیل کو غسل کرتے ہوئے دیکھا تو کہا آج سے پہلے میں نے کسی کنواری لڑکی کی جلد کو بھی اتنا خوبصورت نہیں دیکھا، سہل اسی جگہ گر پڑے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس خبر لائی گئی اور دریافت کیا گیا: اے اللہ کے رسول! کیا آپ کے پاس سہل کے لیے کوئی علاج و تعویذ وغیرہ ہے، وہ اپنا سر بھی نہیں اٹھا رہے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم

نے معلوم کیا اس سلسلہ میں تم کس کو ملزم سمجھتے ہو؟ لوگوں نے جواب دیا ہم عامر بن ربیعہ کو خیال کرتے ہیں، راوی کہتے ہیں، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عامر کو بلایا اور ناراضگی کا اظہار فرمایا، اور فرمایا: کیوں تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو قتل کرنا چاہتا ہے؟ تم نے برکت کی دعا کیوں نہیں دی؟ سہل کے لیے غسل کرو؛ چنانچہ انہوں نے اپنا چہرہ، دونوں ہاتھوں، اپنی کہنیوں، دونوں گھٹنوں، پیروں اور ازار کے اندرونی حصہ کو دھویا، پھر یہ پانی ان پر بہادیا گیا، پس سہل لوگوں کے ساتھ آسانی سے چلے گئے۔

مخبَّأة وهو الستر أي الجارية التي في خدرها المكنونة التي لاترها العيون.

لُبِط أي صرع وسقط على الأرض.

اَلرُّقْيَةُ مِنَ الْعَيْنِ

(نظر کا تعویذ)

الرقية بسكون القاف جمعها أرقية، وهو بمعنى التعويذ.

گزشتہ باب میں نظرِ بد لگ جانے پر اعضاء کے دھونے کے ذریعہ علاج کا ذکر تھا اور اس باب میں نظر سے بچنے کے لیے تعویذ کرنے کا حکم ہے، تعویذ کے جواز وعدمِ جواز کی بحث گزر چکی ہے۔

عَنْ حُمَيْدِ بْنِ قَيْسٍ الْمَكِّيِّ أَنَّهُ قَالَ دُخِلَ عَلَى رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِابْنَيْ جَعْفَرِ بْنِ أَبِيْ طَالِبٍ فَقَالَ لِحَاضِنَتِهِمَا مَالِيْ أَرَاهُمَا ضَارِعَيْنِ فَقَالَتْ حَاضِنَتُهُمَا يَارَسُوْلَ اللهِ إِنَّهُ تَسْرَعُ إِلَيْهِمَا الْعَيْنُ وَلَمْ يَمْنَعْنَا أَنْ نَسْتَرْقِيَ لَهُمَا إِلَّا أَنَّا لَا نَدْرِيْ مَا يُوَافِقُكَ مِنْ ذَالِكَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اسْتَرْقُوْا لَهُمَا فَإِنَّهُ لَوْ سَبَقَ شَيْءٌ الْقَدْرَ لَسَبَقَتْهُ الْعَيْنُ.

ترجمہ: حمید بن قیس مکی روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے دولڑکے لائے گئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی

پرورش کرنے والی یعنی ان کی ماں سے فرمایا: کیا بات ہے کہ میں ان کو نحیف و کمزور دیکھ رہا ہوں؟ ان کی ماں نے کہا: اے اللہ کے رسول! ان کو نظر بہت جلد لگ جاتی ہے اور ہمارے لیے تعویذ سے کوئی مانع نہیں ہے کہ سوائے اس کے کہ ہم کو اس کے بارے میں آپ کے موافق یعنی صحیح حکم معلوم نہیں ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دیتے ہوئے فرمایا: تم ان کے لیے جاننے والے سے تعویذ کرالو؛ اس لیے کہ (یہ حقیقت ہے کہ) اگر کوئی چیز قضاء وقدر پر سبقت لے جاسکتی تھی وہ نظر ہے۔

تشریح: جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی بیوی گویا تعویذ کا حکم معلوم کرنے آئی تھیں؛ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں رقیہ عین کی اجازت فرمائی کہ کسی جاننے والے سے اس کو لے سکتی ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعویذ کا حکم فرمایا، غسل الاعضاء کا حکم نہیں فرمایا؛ کیونکہ غسل اعضاء وہاں ہوگا جہاں حتمی طور پر عائن معلوم ہے۔

لوسبق شيئ القدر إلخ: انہوں نے جب کہا ان بچوں کو نظر جلدی لگ جاتی ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تائیداً فرمایا کہ بالکل بالفرض اگر کوئی چیز قدر و قضاء سے سبقت لے جاتی ہے تو وہ نظرِ بد ہے، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطورِ مبالغہ اس کی قوتِ تاثیر اور سرعت کو بیان فرمایا ہے۔

أَنْ عُرْوَةَ بْنَ الزُّبَيْرِ حَدَّثَهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ بَيْتَ أُمِّ سَلَمَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَفِي الْبَيْتِ صَبِيٌّ يَبْكِي فَذَكَرُوْا أَنَّ بِهِ الْعَيْنَ قَالَ عُرْوَةُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَلَا تَسْتَرْقُوْنَ لَهُ مِنَ الْعَيْنِ.

ترجمہ: عروہ بن زبیر روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ اُمّ المومنین اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لے گئے، گھر ایک بچہ رو رہا تھا، اہلِ خانہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلایا کہ اسے نظر لگ گئی ہے، عروہ کہتے ہیں اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کے لیے نظر کا تعویذ کیوں نہیں لے لیتے۔

تشریح: اس حدیث میں تعویذ کے جواز پر صریح دلالت ہے، لہٰذا بچوں کو نظرِ بد اور دوسری بیماریوں سے حفاظت کے لیے کسی جاننے والے سے بلا تردد تعویذ وغیرہ لے سکتے ہیں۔

مَا جَاءَ فِيْ أَجْرِ الْمَرِيْضِ
(بیمار شخص کے لیے اجر وثواب کا بیان)

عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِذَا مَرِضَ الْعَبْدُ بَعَثَ اللهُ تَعَالىٰ إِلَيْهِ مَلَكَيْنِ فَقَالَ انْظُرَا مَاذَا يَقُوْلُ لِعُوَّادِهٖ فَإِنْ هُوَ إِذَا جَاءُوْهُ حَمِدَ اللهَ وَأَثْنىٰ عَلَيْهِ رَفَعَا ذٰلِكَ إِلَى اللهِ وَهُوَ أَعْلَمُ فَيَقُوْلُ لِعَبْدِيْ عَلَيَّ إِنْ أَنَا تَوَفَّيْتُهٗ أَنْ أُدْخِلَهُ الْجَنَّةَ وَإِنْ أَنَا شَفَيْتُهٗ أَنْ أُبْدِلَ لَهٗ لَحْمًا خَيْرًا مِّنْ لَحْمِهٖ وَدَمًا خَيْرًا مِّنْ دَمِهٖ وَأَنْ أُكَفِّرَ عَنْهُ سَيِّئَاتِهٖ.

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب مؤمن بندہ بیمار ہوجاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کے پاس دو فرشتوں کو بھیجتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ دیکھو! کہ وہ اپنی عیادت کرنے والوں سے کیا کہتا ہے؟ پس اگر وہ عیادت کرنے والوں کے آنے پر اللہ کی حمد وثنا کرتا ہے، فرشتے اس کو اللہ کی بارگاہ میں لے جاتے ہیں؛ حالانکہ اللہ سب جانتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میرے بندہ کا مجھ پر حق ہے کہ اگر میں اسے (اسی بیماری میں) موت دوں تو اسے جنت میں داخل کروں اور اگر اس بیماری سے شفاء دوں تو اس کے گوشت کو موجودہ سے بہتر بنادوں اور اس کے خون کو اچھے خون سے بدل دوں اور اس کے گناہوں کو بخش دوں۔

تشریح: حدیثِ باب میں مریض بندۂ مؤمن کے لیے بڑی بشارتیں ہیں یعنی جب مؤمن بندہ بیمار ہوجاتا ہے اور صبر وہمت کے ساتھ کام لیتا ہے یہاں تک کہ عیادت کرنے والوں کے سامنے بھی جزع فزاع نہ کر کے اللہ کی حمد وثناء اور اس حال میں بھی اس

کا شکر گزار بنا رہتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کا وعدہ فرما لیتے ہیں یا اگر اس کو زندگی عطاء کرتے ہیں تو اس کو سابقہ حالت سے اچھی حالت وصحت عطا کردیتے ہیں، اور اگر اس مؤمن بندہ کے نامۂ اعمال میں کچھ گناہ ہوتے ہیں تو ان کو مٹا دیتے ہیں اور اگر وہ پہلے سے صاف شفاف ہوتا ہے تو اس کے درجات کو مزید بلند فرما دیتے ہیں۔

سوال: مؤمن بندہ کے لیے یہ بشارت محض بیماری کے لاحق ہونے پر حاصل ہوجاتی ہے یا پھر اس پر صبر کرنے پر؟

جواب: حافظ ابنِ حجرؒ نے فرمایا: صحیح بات یہ ہے کہ صرف لحوقِ مرض ہی سے استحقاقِ بشارت ہوجاتا ہے؛ البتہ اگر وہ اس پر صبر کرتا ہے اور اللہ کا شکر گزار بنا رہتا ہے تو اس کو مخصوص اجر وثواب سے نوازا جاتا ہے۔ (فتح الباری: ۱۰/۱۳۶)

ملحوظ: اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ بیماری وغیرہ سے صرف گناہِ صغیرہ معاف ہوتے ہیں؛ لیکن اسی حالت میں بندۂ مؤمن توبہ واستغفار بھی جاری رکھتا ہے؛ اس لیے کبائر کے معاف ہونے کی بھی امید ہے۔

عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ أَنَّهُ قَالَ سَمِعْتُ عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَقُوْلُ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. لَا يُصِيْبُ الْمُؤْمِنَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ حَتَّى الشَّوْكَةِ إِلَّا قُصَّ بِهَا أَوْ كُفِّرَ بِهَا مِنْ خَطَايَاهُ لَا يَدْرِيْ يَزِيْدُ أَيَّتَهُمَا قَالَ عُرْوَةُ.

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مؤمن بندہ کو جب بھی کوئی تکلیف پہنچتی ہے یہاں تک کہ اگر ایک کانٹا بھی چبھ جاتا ہے تو اس سے اس کے گناہ ختم کردیے جاتے ہیں یا مٹا دیے جاتے ہیں، یزید جو راوی ہیں انہیں یہ نہیں معلوم کہ عروہ نے ''قُصَّ'' کہا تھا یا ''کُفِّرَ''۔

تشریح: مصيبة قال الحافظ: أصل المصيبة، الرمية بالسهم ثم استعملت في كل نازلة.

مذکورہ حدیث میں بھی مؤمن کے لیے بشارت ہے جب بھی اس کو کوئی ہلکی سے ہلکی تکلیف بھی پہنچتی ہے تو اللہ اس کے گناہوں کو معاف فرمادیتے ہیں اور درجات کو بلند فرمادیتے ہیں یعنی دونوں چیزوں کا حصول ہوجاتا ہے اور یہ اس وسیع فضل والے سے بعید نہیں ہے۔

شیخ عزالدین بن عبدالسلامؒ فرماتے ہیں کہ: بعض جہال کا خیال یہ ہے کہ محض تکلیف پہنچنے پر بندہ ماجور ہوجاتا ہے؛ حالانکہ یہ صریح غلطی ہے؛ اس لیے ثواب وعقاب کا حصول کسب سے ہوتا ہے، مصیبت وتکلیف پہنچنے میں بندہ کا کوئی دخل نہیں، لہٰذا ثواب وعقاب اس کے صبر ورضا کی وجہ سے ہوگا۔

حافظ ابنِ حجرؒ نے اسی حدیث سے ان کا رد کیا ہے کہ حدیث میں محض تکلیف پہنچنے پر اللہ نے اجر وثواب کا وعدہ فرمایا، صبر ورضا کی شرط نہیں لگائی، تاہم اگر صبر ورضا بھی پائی جائے تو ان شاء اللہ مزید اجر وثواب کا مستحق ہوگا، اسی کو علامہ زرقانیؒ نے بیان فرمایا ہے۔ (فتح الباری:۱۰/)

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ بِہٖ خَیْرًا یُّصِبْ مِنْہُ.

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں اسے تکلیف میں مبتلا کردیتے ہیں۔

تشریح: ''رحمتِ حق بہانہ می جوید'' اللہ تعالیٰ جب کسی پر نظرِ کرم فرماتے ہیں تو اسے مختلف پیرایہ سے نوازتے ہیں؛ چنانچہ کبھی کسی تکلیف اور پریشانی میں مبتلا کردیتے ہیں؛ کیونکہ جب بندہ پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ ساری چیزوں سے کٹ کر صرف اپنے رب کو یاد کرتا ہے، جس کے سبب وہ گناہوں سے پاک ہوجاتا ہے اور اس کے درجات بلند ہوجاتے ہیں۔

عَنْ یَحْیَی بْنِ سَعِیْدٍ أَنَّ رَجُلًا جَاءَہُ الْمَوْتُ فِیْ زَمَانِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ رَجُلٌ ھَنِیْئًا لَّہُ مَاتَ وَلَمْ یُبْتَلَ بِمَرَضٍ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ

صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَيْحَكَ وَمَا يُدْرِيكَ لَوْ أَنَّ اللهَ ابْتَلَاهُ بِمَرَضٍ يُّكَفِّرُ بِهِ مِنْ سَيِّئَاتِهِ.

ترجمہ: یحییٰ بن سعید سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک شخص کا انتقال ہوگیا تو ایک صاحب نے کہا مبارکباد ہے، اس دنیا سے چلا گیا اور کسی بیماری میں مبتلا نہیں ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تیرا بھلا کرے، تجھے معلوم نہیں ہے، اگر اللہ تعالیٰ اسے کسی بیماری میں مبتلا کردیتے تو اس کی وجہ سے اس کے گناہ بخش دیے جاتے۔

تشریح: جب ایک شخص نے مرنے والے کو اس کے بیمار ہوئے بغیر مرجانے پر مبارک دی اور خوشی کا اظہار کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا یہ کوئی خوشی کی بات نہیں ہے؛ کیونکہ کوئی بھی غیر معصوم بندہ ضرور کبھی کسی نہ کسی گناہ میں مبتلا ہو ہی جاتی ہے جس کے سبب اس کے نامۂ اعمال میں کچھ نہ کچھ گناہ ضرور ہوں گے، تو اس کا اس دنیا میں بیمار ہوجانا ایک فضیلت کی اور رحمت کی بات ہے؛ کیونکہ مرض سے تمام گناہ معاف ہوجاتے ہیں، اب اگر اس کی موت آجائے تو وہ اللہ کے پاس صاف شفاف ہوکر پہنچے گا، پس معلوم ہوا کہ بالکل بیمار نہ ہوا کوئی فضیلت کی بات نہیں ہے۔

اَلتَّعَوُّذُ وَالرُّقْيَةُ مِنَ الْمَرَضِ

(بیماری میں تعویذ اور رقیہ کا کرنا)

اس سے مراد شاید رقیہ کا جواز یا استحباب ہے؛ کیونکہ گزشتہ باب میں مرض کو مکفر ذنوب اور رفیع درجات قرار دیا گیا ہے، تو شاید کسی کو وہم ہوسکتا تھا کہ جب مرض کی اتنی فضیلت ہے تو علاج وتعویذ کرنا جائز نہ ہو، لہٰذا اس باب کو لاکر وہم ختم کردیا کہ علاج ومعالجہ میں کوئی حرج نہیں ہے؛ کیونکہ بیماریوں کا نزول حکمِ خداوندی سے ہوتا ہے، اسی طرح اسباب وعلاج کو اختیار کرنا بھی اللہ کا حکم ہے، پس دائرہ اور حد میں رہ کر اسباب کو اختیار کرنے کی اجازت ہے۔

عَنْ عُثْمَانَ بْنِ أَبِي الْعَاصِ أَتَى رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ عُثْمَانُ وَبِيْ وَجَعٌ قَدْ كَانَ يُهْلِكُنِيْ قَالَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَمْسَحْهُ بِيَمِيْنِكَ سَبْعَ مَرَّاتٍ وَقُلْ أَعُوْذُ بِعِزَّةِ اللهِ وَقُدْرَتِهِ مِنْ شَرِّ مَا أَجِدُ قَالَ فَقُلْتُ ذٰلِكَ فَأَذْهَبَ اللهُ مَا كَانَ بِيْ فَلَمْ أَزَلْ اٰمُرُ بِهِ أَهْلِيْ وَغَيْرَهُمْ.

ترجمہ: عثمان بن ابی العاص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے وہ کہتے ہیں کہ میرے اتنا شدید درد تھا جو مجھے ہلاک کرنے کے قریب تھا، کہتے ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اپنے دائیں ہاتھ سے درد کی جگہ کو سات مرتبہ ملو اور یہ دعا پڑھتے جاؤ أعوذ بعزة الله إلخ (پناہ چاہتا ہوں میں اللہ کی عزت وقدرت کی اس شر سے جو میں محسوس کر رہا ہوں) عثمان کہتے ہیں جب میں نے یہ الفاظ کہے تو اللہ تعالیٰ نے میرے درد کو محو کر دیا، پھر میں ہمیشہ اپنے گھر والوں اور دوسروں کو اسی دعا کا حکم دیا کرتا تھا۔

تشریح: علامہ باجی مالکیؒ فرماتے ہیں: حدیث شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ بیمار شخص دوا، دعا یا تعویذ کو حاصل کرنے کے لیے اپنی تکلیف دوسروں کو بتا سکتا ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دائیں ہاتھ سے مسح کا حکم دیا؛ کیونکہ اس میں برکت ہے۔

ملحوظہ: دعا وتعویذات سے نفع حاصل کرنے کے لیے دو باتیں ضروری ہیں:

(۱) تعویذ لینے اور دینے والے دونوں کو شفاء کا یقین ہو، خصوصاً لینے والے کو۔

(۲) احادیث میں یا بزرگوں کے ذریعہ جو عدد بیان کیے جاتے ہیں ان کا لحاظ بھی ضروری ہے؛ کیونکہ بعض اعداد میں جو تاثیر ہوتی ہے وہ دوسروں میں نہیں ہوتی اور اس کا علم صرف ماہرین کو ہوتا ہے۔

عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ إِذَا اشْتَكٰى يَقْرَأُ عَلٰى نَفْسِهِ بِالْمُعَوِّذَاتِ وَيَنْفُثُ قَالَتْ فَلَمَّا اشْتَدَّ وَجَعُهُ كُنْتُ أَنَا أَقْرَأُ عَلَيْهِ وَامْسَحُ عَلَيْهِ بِيَمِيْنِهِ رَجَاءَ بَرَكَتِهَا.

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیمار پڑتے تو معوذات پڑھتے اور اپنے اوپر دم کر لیتے تھے فرماتی ہیں جب (مرض وفات میں) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکلیف زیادہ بڑھ گئی تو میں خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر معوذات پڑھ کر دم کر رہی تھی اور تکلیف کی جگہ آپ ہی کا ہاتھ پھیر رہی تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ کی برکت کی اُمید میں۔

تشریح: بالمعوذات: سے مراد سورۂ اخلاص، فلق اور ناس ہیں اور بطورِ تغلیب معوذات بول دیا گیا ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ معوذات سے مراد قرآن کی وہ آیات ہیں جو تعوذ پر مشتمل ہیں مثلاً ﴿وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيٰطِيْنِ﴾ یا اس سے مراد معوذتین، اور وہ تمام دعائیں ہیں جو تعوذ پر مشتمل ہیں۔

نفث اور بصق کے الفاظ احادیث میں دم کرنے کے لیے آتے ہیں، نفث میں تو صرف پھونک ماری جاتی ہے جبکہ بصق میں پھونک کے ساتھ تھوک کے کچھ ذرات بھی شامل ہونے چاہئیں۔

إِنَّ أَبَا بَكْرٍ الصِّدِّيْقِ دَخَلَ عَلٰى عَائِشَةَ وَهِيَ تَشْتَكِيْ وَيَهُوْدِيَّةٌ تَرْقِيْهَا فَقَالَ أَبُوْ بَكْرٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُ إِرْقِيْهَا بِكِتَابِ اللهِ.

ترجمہ: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لائے اور وہ بیمار تھیں، ایک یہودیہ عورت ان پر دم کر رہی تھیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قرآن سے پڑھ کر دم کرو۔

تشریح: أرقیھا اگر صیغہ خطاب ہے تو خطاب یہودیہ کو ہے اور کتاب اللہ سے مراد تورات ہے یعنی اِدھر اُدھر کے منتر پڑھنے کے بجائے کتاب اللہ سے کوئی دعا وغیرہ پڑھو یا پھر کتاب سے مراد قرآن ہے اور مطلب ہے کہ قرآنِ کریم جیسا کوئی رقیہ کرو۔

اور أرقیھا اگر متکلم کا صیغہ ہے تو مطلب یہ ہے کہ میں قرآن سے دم کر دیتا ہوں، اب یہاں مسئلہ ہے کہ اہلِ کتاب سے تعویذ اور دم وغیرہ کرا سکتے ہیں؟ تو امام مالکؒ اس کو مکروہ

قرار دیتے ہیں؛ کیونکہ ممکن ہے کہ وہ الفاظ کو بدل دیں اور دوسرے ائمہ کے نزدیک اگر آیاتِ قرآنیہ اور معلوم المراد غیر شرکیہ الفاظ سے رقیہ کرے تو جائز ہے۔

تَعَالُجُ الْمَرِيْضِ

(مریض کے علاج کرانے کا بیان)

ابتداءِ بحث میں یہ بات آچکی ہے کہ علاج کرانا ممنوع نہیں ہے؛ بلکہ علامہ نوویؒ نے اسے مستحب قرار دیا ہے اور جو لوگ علاج کو خلافِ تقدیر اور توکل سمجھتے ہیں ان کا خیال فاسد ہے؛ کیونکہ باعتبار اسباب کے توکل کی تین قسمیں ہیں، لہٰذا اسباب کی بھی تین قسمیں ہیں: (۱) یقینی (۲) ظنی (۳) اور وہمی، اسبابِ وہمیہ جن کو اہلِ حرص وطمع اختیار کرتے ہیں جس کو طولِ امل کہتے ہیں، ان کا ترک ضروری اور توکل واجب ہے اور اسبابِ یقینیہ جن پر نفع عادۃً مرتب ہوجاتا ہے جیسے کھانے کے بعد آسودگی کا ہوجانا اور پانی پینے کے بعد پیاس کا ختم ہوجانا اس کا ترک کرنا جائز نہیں، خصوصاً ہلاکت کے خطرہ کے وقت توکل حرام ہے اور اسبابِ ظنیہ جن پر غالباً نفع مرتب ہوجائے؛ مگر کبھی تخلف بھی ہوجاتا ہے جیسے علاج کے بعد صحت کا حاصل ہوجانا اور کام کرنے کے بعد درزق مل جانا تو ان کے ترک کرنے میں تفصیل ہے، وہ یہ ہے کہ ضعیف النفس یعنی جو صبر کی استطاعت نہ رکھتا ہے تو اس کے لیے توکل جائز نہیں اور قوی النفس اور پختہ ایمان کے لیے جائز ہے اور بسا اوقات افضل اور مستحب بھی ہے۔ (کوکب الدری، ہامش فتاویٰ عالمگیریہ))

عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ أَنَّ رَجُلًا فِيْ زَمَانِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَصَابَهُ جُرْحٌ فَاحْتَقَنَ الْجُرْحُ الدَّمَ وَإِنَّ الرَّجُلَ دَعَا رَجُلَيْنِ مِنْ بَنِيْ أَنْمَارٍ فَنَظَرَ إِلَيْهِ فَزَعَمَا أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَهُمَا أَيُّكُمَا أَطَبُّ فَقَالَا أَوَ فِي الطِّبِّ خَيْرٌ يَا رَسُوْلَ اللهِ فَزَعَمَ زَيْدٌ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ أَنْزَلَ الدَّوَاءَ الَّذِيْ أَنْزَلَ الْأَدْوَاءَ.

ترجمہ: زید بن اسلم سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک شخص کو زخم لگ گیا اور زخم پر خون جم گیا، اس شخص نے قبیلہ انمار کے دو آدمیوں کو بلایا (وہ آئے) اور انہوں نے اس کا معائنہ کیا، وہ دونوں اشخاص کہتے ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے معلوم کیا تم میں سے علمِ طب کو زیادہ کون جانتا ہے؟ انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا علاج ومعالجہ میں بھی خیر ہے؟ زید بن اسلم کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ نے جس بیماری کو پیدا کیا ہے اس کی دوا بھی اُتاری ہے۔

تشریح: أنّ رسول الله صلى الله عليه وسلم قال لهما أيكما أطب: علامہ باجی مالکیؒ فرماتے ہیں: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے یہ اس لیے معلوم کیا؛ تا کہ ان کی طبی صلاحیت کا اندازہ ہوجائے؛ کیونکہ اس طرح کے زخموں کا علاج ہر کس وناکس کے بس میں نہیں ہوتا، اس سے معلوم ہوا کہ علاج ومعالجہ اس شخص کو اختیار کرنا چاہیے جس نے علم وتجربہ کی روشنی میں کچھ مہارت حاصل کی ہو۔ (المنتقی)

فقالا أوَ في الطبّ خير: ممکن ہے یہ دونوں اشخاص حالتِ کفر میں علاج کرتے رہے ہوں، پھر جب مسلمان ہوگئے تو مسئلہ کے معلوم نہ ہونے کی وجہ سے تشویش میں پڑ گئے اور معلوم کیا، کہ کیا ہم علاج کر سکتے ہیں؟ اس میں کوئی بُرائی تو نہیں ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ علاج ومعالجہ میں کوئی حرج نہیں ہے؛ کیونکہ خود باری تعالیٰ نے جتنی بیماریاں پیدا کی ہیں ان کے لیے دواء بھی پیدا فرمائی ہے، جو خود اس بات کی دلیل ہے کہ دواؤں کا استعمال جائز ہے۔

انزل الدواء: انزال سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں مختلف اقوال ہیں، بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اس سے مراد ہے کہ اللہ نے اپنے بندوں کو دوائی کا علم دے دیا ہے، ایک قول یہ ہے کہ زمینی فرشتے ان دواؤں کا علم لے کر اترتے ہیں اور ان کی خبر انبیاء کو دیتے ہیں یا اولیاء پر الہام ہوجاتا ہے، اور کچھ لوگوں نے فرمایا کہ اس سے مراد وہ تمام غذائیں اور دوائیں ہیں جو بارش کے پانی کے ذریعہ پیدا ہوتی ہیں، بہر حال ہمیں یہ اعتقاد

رکھنا چاہیے کہ تمام بیماریوں کی دوائیں موجود ہیں، ایسا ممکن ہے کہ ہمیں علم نہ ہو۔

اور یہ اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے جب اس نے بیماری کو پیدا کیا تو دواؤں سے مدد بھی فرمائی جیسے جب گناہوں میں مبتلا کر دیتے ہیں تو توبہ کے ذریعہ اس کو زائل بھی فرماتے ہیں۔

نوٹ: یہ روایت باتفاق محدثین مرسل ہے۔

لغات: احتقن معناه تجمعَّ الـدم. اور یہاں جم جانا اور ٹھہر جانا مراد ہے۔ ادواء (واحد) داء.

اَنَّ سَعْدَ بْنَ زُرَارَةَ اَكْتَوىٰ فِي زَمَانِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الذُّبْحَةِ فَمَاتَ.

ترجمہ: حضرت سعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حلق کی پھنسی کو داغا پھر ان کا انتقال ہو گیا۔

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنَ عُمَرَ اَكْتَوىٰ مِنَ اللَّقْوَةِ وَرَقىٰ مِنَ الْعَقْرَبِ.

ترجمہ: عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے لقویٰ کی وجہ سے داغا اور بچھو کے کاٹے کا رقیہ کیا۔

تشریح: ان دونوں روایتوں کا مقصد کئی یعنی داغنے کے حکم کو بتانا ہے، مذکورہ روایات سے اس کا جواز معلوم ہوتا ہے؛ لیکن بعض روایات میں داغنے سے منع کیا گیا ہے؛ چنانچہ عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: نهىٰ رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الكي فاكتوينا فما افلحنا ولا نجينا. دونوں طرح روایات ہیں؛ اس لیے علماء نے ان کی مختلف توجیہات بیان کی ہیں۔

(۱) حضرت گنگوہیؒ نے نہی کی روایات کو منسوخ قرار دیا ہے اور فرمایا یہ نہی ابتداءِ اسلام میں تھی جب لوگوں کا اعتقاد یہ تھا کہ شفاء صرف داغنے میں ہے جب یہ عقیدہ ختم ہو گیا تو اجازت ہو گئی۔

(۲) امام نوویؒ فرماتے ہیں: اصل حکم نہی ہے؛ لیکن جب کسی چیز سے شفاء نہ ملے تو اجازت ہو گی۔

(۳) نہی ارشاداً اور مشورۃً ہے؛ کیونکہ اس میں عضو کو بلاوجہ تکلیف دینا ہے، لہٰذا دوسری دواؤں کی موجودگی میں اس کو اختیار نہ کرے۔

(۴) اصلاً جواز ہے اور نہی کراہت تنزیہی اور غیر افضل پر محمول ہے۔

الذُبْحَةُ وجع في الحلق أو قرحة تظهر فيه گلے کی پھنسی۔

اللقوة: داء يصيب الوجه ایک بیماری ہے جس سے منہ ٹیڑھا ہو جاتا ہے۔

الكي كواه يكوي كيًّا، احرق جلده بحديد ونحو، واكتوى استعمل الكيّ في بدنه.

اَلغَسلُ بِالْمَاءِ مِنَ الْحُمّٰى

(بخار میں پانی سے غسل کرنے کا بیان

عَنْ فَاطِمَةَ بِنْتِ الْمُنْذِرِ أَنَّ أَسْمَاءَ بِنْتَ أَبِيْ بَكْرٍ الصِّدِّيْقِ كَانَتْ إِذَا أُتِيَتْ بِالْمَرْأَةِ حُمَّتْ تَدْعُوْ لَهَا أَخَذَتِ الْمَاءَ فَصَبَّهُ بَيْنَهَا وَبَيْنَ جَيْبِهَا وَقَالَتْ إِنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَأْمُرُ أَنْ نُّبْرِدَهَا بِالْمَاءِ.

ترجمہ: فاطمہ بنت منذر سے روایت ہے کہ حضرت اسماء بنتِ ابوبکر رضی اللہ عنہا کی عادت تھی جب ان کے پاس کسی بخار میں مبتلا عورت کو لایا جاتا (تاکہ وہ اس کے لیے دعا کریں) تو وہ پانی لیتیں اور اس کے گریبان میں بہاتی تھیں اور فرماتیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو پانی سے ٹھنڈا کرنے کا حکم دیتے۔

عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ أَبِيْهِ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنَّ الْحُمّٰى مِنْ فَيْحِ جَهَنَّمَ فَأَبْرِدُوْهَا بِالْمَاءِ.

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بخار جہنم کے سانس لینے کا اثر ہے، پس اس کو پانی سے ٹھنڈا کرو۔

تشریح: ان دونوں روایتوں میں بخار کا علاج جسم پر ٹھنڈا پانی بہانا بتایا گیا ہے۔

جاننا چاہیے کہ بخار ایک گرم کیفیت ہے جو اوّلاً قلب میں پھر خون اور روح کے واسطہ سے پورے جسم میں پھیل جاتی ہے، بخار کی مختلف اقسام ہیں، کبھی بخار جسم میں کسی زخم کے لگنے سے آجاتا ہے، یا زیادہ تیز دھوپ کے لگنے سے ہوجاتا ہے اور کبھی اختلاطِ اربعہ کے فساد سے آجاتا ہے۔

علامہ ابنِ قیمؒ فرماتے ہیں: بعض جاہل اطباء کو اشکال یہ ہے کہ یہ علاج بیماری کے منافی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطابات دو قسمیں کے ہوتے ہیں: ایک وہ جو تمام لوگوں کے لیے ہوتے ہیں اور بعض وہ ہوتے ہیں جو بعض علاقہ والوں کے لیے خاص ہوتے ہیں، مثلاً استنجاء کے وقت شرقوا أو غربوا کا حکم صرف اہلِ مدینہ کے لیے تھا، اسی طرح ممکن ہے بخار میں غسل بالماء کا حکم اہلِ حجاز کے لیے ہو اور اس بخار کی کیفیت اسی طرح کی ہو کہ وہ پانی بہانے سے صحیح ہوجاتا ہو یا پھر خطاب عام ہو اور یہ غسل کسی مخصوص بخار کے لیے ہو؛ کیونکہ ماہرینِ طب نے خود اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ وہ بخاز جو صفرہ کی وجہ سے ہو اس میں ٹھنڈا پانی پلانا، اس سے نہلانا فائدہ مند ہے۔

(زاد المعاد)

أن الحمّى من فيحم جهنم: علامہ ابنِ قیمؒ فرماتے ہیں اس کے دو مطلب ہوسکتے ہیں:

(۱) حقیقتاً جہنم کے شدید گرم بخارات، اور باریک ذرات دنیا میں پھیل جاتے ہیں؛ تاکہ بندوں کو عبرت حاصل ہو اور اس کی سختی کا احساس ہو؛ لیکن پھر اللہ نے بخار کے ظہور کو ایسے اسباب کے ساتھ مقدر کردیا ہے جو اس کا تقاضہ کرتے ہیں، گویا ان اسباب کے پیچھے وجہ حقیقی وہ جہنمی ذرات ہیں جیسے دنیاوی فرحت ولذت ونعم، جنت کی ایک جھلک ہیں۔

(۲) یہ محض ایک تشبیہ ہے یعنی بخار کی شدت اور گرمی کو جہنم کے شعلوں اور لپٹ سے تشبیہ دی ہے، عذابِ نار کی شدت پر متنبہ کرنے کے لیے یعنی شبیہ اتنی تکلیف دہ ہے تو اصل جہنم کا کیا حال ہوگا۔ (زاد المعاد)

عِيَادَةُ الْمَرِيْضِ وَالطِّيَرَةِ

عيادة اصل عوادة تھا، واو ماقبل مکسور کی وجہ سے واؤ کو "یا" سے بدل دیا، عدت المريض إذا زرته وسألته.

بخاری شریف کی حدیث "أطعموا الجائع وعود المريض وفكوا المعاني" کی وجہ سے بعض علماء نے فرمایا کہ مریض کی عیادت کرنا واجب ہے، ظاہر امر اسی کا تقاضا کرتا ہے، ابنِ بطالؒ نے فرضِ کفایہ قرار دیا ہے، جمہور علماء اس کو مستحب قرار دیتے ہیں اور ایک اخلاقی فریضہ گردانتے ہیں، امام نوویؒ نے اس کے عدمِ وجوب پر اجماع نقل کیا ہے۔

آدابِ عیادت:

جب مریض کے پاس جائے تو اس کے لیے دعا کرے، زیادہ دیر تک اس کے پاس نہ بیٹھے کہ اسے تکلیف ہونے لگے اور اس پر شاق گزرے، تاہم اگر ضرورت ہو تو کوئی حرج نہیں ہے، اس کے سامنے صبر و ہمت اور تسلی کی باتیں کرے، مرض کی شدت اور ہولناکی کو نہ بتائے، ایسی باتیں کریں جس سے صحت کی امید بڑھ جائے اور خوف ختم ہو جائے۔

فضیلتِ عیادت:

متعدد احادیث میں عیادت کرنے کی فضیلت وارد ہوئی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب کوئی مسلمان بھائی کسی مسلمان بھائی کی عیادت کرنے کے لیے جاتا ہے تو وہ جنت کے پھلوں میں رہتا ہے اور ایک دوسری حدیث میں ہے جو کسی مریض کی عیادت کرتا ہے تو وہ رحمت میں داخل ہو جاتا ہے۔

جمہور کے نزدیک عیادت کے لیے جانے کا وقت مقرر نہیں ہے، رات و دن کے کسی لمحہ میں عیادت کی جاسکتی ہے، جیسا کہ حدیث کے اطلاق سے معلوم ہوتا ہے؛ لیکن امام غزالیؒ نے فرمایا:

عیادت کے لیے تین دن کے بعد جانا چاہیے، ان کا استدلال حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ''كان النبي صلى الله عليه وسلم لايعود مريضًا إلا بعد ثلاث'' سے ہے؛ لیکن یہ حدیث انتہائی ضعیف ہے؛ اس لیے جمہور کا مسلک راجح ہے اور اسی پر عمل ہے، تاہم اگر ہسپتال وغیرہ کی طرف سے مریض سے ملنے کا وقت متعین ہو تو اسے ملحوظ رکھا جائے۔

فاسق اور ذمی کی عیادت:

درمختار میں ہے کہ فاسق اور ذمی کی عیادت کرنا بالاجماع جائز ہے۔

بدفالی کا بیان

طیرۃ تطیر: یعنی بدفالی لینے کا مصدر ہے، طیرہ کا مفہوم صرف بدفالی کے لیے استعمال ہوتا ہے؛ البتہ بعض مواقع پر مطلق فال کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

تطیر کی اصل اور وجہ تسمیہ یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں اہلِ عرب عام طور پر اس طرح شگون لیتے تھے کہ جب کوئی کام کرتے یا سفر پر جانے کا ارادہ ہوتا تو کسی پرندے کو اُڑاتے تھے، اگر وہ دائیں سمت اُڑ جاتا تو اس کو مبارک جانتے اور نیک فال لیتے اور اس کام کو یا سفر کو شروع کردیتے تھے اور جب وہ پرندہ بائیں جانب اُڑ جاتا تو بدشگونی لیتے اور اس کام سے اور سفر سے رُک جاتے تھے؛ چونکہ ان کا یہ عمل ایک فاسد عقیدہ کی بنا پر تھا یعنی وہ اسی کو مؤثر بالذات مانتے تھے جو شرک ہے؛ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سختی کے ساتھ بدفالی لینے سے منع فرمایا۔

تاہم نیک فال لینا محمود و مستحسن ہے؛ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے ناموں اور جگہوں سے نیک فالی لیتے تھے۔ بدفالی مذموم اور نیک فالی محمود اس لیے ہے کہ بدفالی سے رب کی رحمت سے مایوسی اور بے اطمینانی حاصل ہوتی ہے جبکہ نیک فالی سے سکونِ قلبی اور خوشی ہوتی ہے اور اللہ کے رحم و کرم اور اچھائی کی امید بڑھ جاتی ہے۔

وضاحت: امام مالکؒ نے عیادۃ مریض اور طیرہ کو شاید اس لیے جمع کیا ہے کہ کبھی

کبھی عیادت کرنا بدفالی کا سبب بن جاتا ہے، مثلاً کسی مریض کے پاس گیا اور وہی بیماری اسے بھی لگ گئی تو ذہن میں یہ آسکتا ہے کہ مجھے یہ بیماری فلاں مریض کے پاس جاکر لگی ہے، اس وہم کو دُور کرنے کے لیے دونوں کو ایک ساتھ جمع کیا ہے۔

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِذَا عَادَ الرَّجُلُ الْمَرِيْضَ خَاضَ فِي الرَّحْمَةِ حَتّٰى إِذَا قَعَدَ عِنْدَهٗ قَرَّتْ فِيْهِ أَوْ نَحْوَ ذٰلِكَ.

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب آدمی مریض کی عیادت کے لیے جاتا ہے تو وہ رحمتِ الٰہی میں داخل ہوجاتا ہے جب اس کے پاس بیٹھ جاتا ہے تو رحمت اس میں ثبت ہوجاتی ہے یا اسی طرح کچھ اور فرمایا۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جب بندہ اپنے کسی بھائی کی عیادت کے لیے چلنا شروع کرتا ہے تو یہ عبادت میں شمار ہوتا ہے اور جب تک وہ راستہ میں رہتا ہے اس پر رحمت کا نزول ہوتا رہتا ہے اور جب پہنچ جاتا ہے تو اس پر خدا کی رحمت کی اتنی کثرت ہوتی ہے گویا اس پر رحمت انڈیل دی گئی ہے یعنی اس کے نامۂ اعمال میں ثواب جزیل لکھ دیا جاتا ہے اور اس کے گناہ مٹا دیئے جاتے ہیں۔

عَنِ ابْنِ عَطِيَّةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا عَدْوٰى وَلَا هَامَ وَلَا صَفَرَ وَلَا يُحَلُّ الْمَرَضُ عَلَى الْمُصِحِّ وَلْيَحْلِلِ الْمُصِحُّ حَيْثُ شَاءَ فَقَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا ذَاكَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّهٗ أَذًى.

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بیماری کے متعدی ہونے کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور کھوپڑی کی نحوست کوئی چیز نہیں ہے اور نہ صفر کی نحوست کوئی چیز ہے اور نہ لے جایا جائے بیمار جانور کو صحیح جانور کے پاس اور صحیح جانور کو جہاں چاہے لے جایا جاسکتا ہے، لوگوں نے معلوم کیا ایسا کیوں ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ تکلیف دہ ہے۔

تشریح: لاعدویٰ عداءً کا اسم ہے، ایک چیز کو دوسری چیز کی طرف منتقل کرنا،

یہاں عدویٰ سے مراد ایک بیماری کا دوسرے شخص کی طرف منتقل ہونا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تعدیہ امراض کی نفی فرمائی ہے کہ ایک مریض کا مرض دوسرے کی طرف منتقل نہیں ہوتا ہے؛ کیونکہ مرض میں وہ تاثیر نہیں ہے کہ خود بخود کسی کی طرف منتقل ہوجائے۔

لیکن یہ ارشاد ایک دوسرے ارشاد سے متعارض ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فر من المجذوم فرارك من الأسد.

محدثین نے اس تعارض کو تین طریقہ سے حل کیا ہے:

(۱) نسخ؛ چنانچہ علماء کی ایک جماعت نے کہا کہ مجذوم سے فرار کا حکم منسوخ ہوچکا ہے یہ عیسیٰ بن دینار کا قول مختار ہے۔

(۲) ترجیح: اس میں دوفریق ہیں، ایک نے تعدیہ امراض والی حدیث کو ترجیح دی ہے اور دوسرے فریق نے فرار مجذوم والی کو ترجیح دی۔

(۳) تطبیق: اس کو اکثر علماء نے اختیار کیا ہے اور اس کی مختلف توجیہات کی ہیں:

(الف) جن روایات میں اجتناب اور فرار من المجذوم کا حکم دیا گیا ہے وہ احتیاط پر محمول ہیں اور جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود مجذوم کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا ہے، وہ بیانِ جواز پر محمول ہیں۔

(ب) ابن الصلاحؒ اور بیہقیؒ وغیرہ نے فرمایا: جن احادیث میں تعدیہ کی نفی ہے ان کا مقصد یہ ہے کہ کسی بیماری میں بذاتِ خود یہ تاثیر نہیں ہوتی کہ دوسرے کی طرف منتقل ہوجائے، زمانۂ جاہلیت میں لوگوں کی یہی خیال تھا کہ امراض بذاتِ خود منتقل ہوتے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کی نفی فرمائی ہے اور جن میں تعدیہ کا ثبوت ہے اس کا مطلب ہے کہ اللہ کے حکم اور ظاہری سبب کے اعتبار سے تعدیہ امراض ہوسکتا ہے، للہذا نفی سبب حقیقی ہونے کی ہے اور اثبات سببِ ظاہر کا ہے، اب کوئی تعارض نہیں رہا، اکثر علماء نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

اور حافظؒ نے فرمایا: اصل تو تعدیہ کی نفی ہے؛ لیکن چونکہ کمزور عقیدہ والے کو کبھی کسی

مجذوم وغیرہ سے ملنے کے بعد وہم ہوسکتا ہے کہ مجھے بھی اسی سے بیماری ہوئی ہے، اس لیے حسماً للمادہ وسداً للباب منع فرمادیا گیا۔

ولاھام: ھام اصل میں کھوپڑی اور سر کو کہتے ہیں، زمانۂ جاہلیت میں لوگوں کا خیال تھا کہ اگر کسی شخص کو قتل کردیا جائے تو میت کے استخوان سے ایک جانور پیدا ہوتا ہے اور وہ ہر وقت یہ فریاد کرتا رہتا ہے ''اسقوني اسقوني'' جب قاتل مرجاتا ہے تو وہ جانور اُڑ کر غائب ہوجاتا ہے، اس جملہ میں اس خیال کا بطلان ہے۔

ولاصفر: اس لفظ کی تشریح میں دو قول ہیں: (ا) بعض لوگ ماہِ صفر کے متعلق مختلف قسم کے خیالات رکھتے تھے کہ اس مہینہ میں نحوست نازل ہوتی ہے اور آفات ومصائب کی کثرت ہوتی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جملہ میں اس کی نفی فرمائی ہے کہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

(۲) زمانۂ جاہلیت میں لوگوں کا خیال یہ تھا کہ آدمی کے پیٹ میں ایک سانپ ہوتا ہے جو بھوک کے وقت اسے کاٹتا رہتا ہے، اس سانپ کو صفراء کہا کرتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''لا صفر'' کہہ کر اسے بے حقیقت قرار دے دیا۔

''ولایحل الممرض علی المصح'' مطلب یہ ہے کہ اگر جانور اونٹ وغیرہ خارش زدہ اور بیمار ہو تو صاحب ابل اس بیمار اونٹ کو صحت مند اونٹوں میں لے کر نہ جائے۔

ولیحلل المصح حیث شاء: اور صحیح وتندرست اونٹ کو جہاں چاہے لے جاسکتا ہے، ان حکموں کا مقصد بھی وہی ہے کہ کسی کمزور عقیدہ شخص کو یہ وہم نہ ہوجائے کہ میرے اونٹ کو خارش فلاں کے خارشی اونٹ کے آنے کی وجہ سے ہوئی ہے۔

فإنه أذي: صحابہ رضی اللہ عنہم نے معلوم کیا کہ آپؐ نے ایسا حکم کیوں دیا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی جگہ بیمار جانور لے جانا صحیح وتندرست جانور والے کے لیے تکلیف دہ ہوتا ہے، یا تو اس لیے کہ اسے خوف ہوتا ہے کہیں میرا جانور بھی خارش زدہ نہ ہوجائے یا اس لیے کہ جانور کی فاسد اور متعفن کھال سے آدمی کراہیت محسوس کرتا ہے۔

اَلسُّنَّۃُ فِی الشَّعَرِ

(بالوں کے سلسلہ میں سنت طریقہ)

اسلام ایک کامل دین اور مکمل شریعت ہے، وہ اپنے متبعین کی زندگی کے تمام شعبوں میں مکمل رہنمائی کرتا ہے، عبادات سے لے کر معاملات تک اجتماعی زندگی سے لے کر انفرادی زندگی تک، یہاں تک کہ کھانے پینے، رہنے سہنے اور زیب وزینت اور آرائش کے احکام بھی شریعت میں تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔

انسانی جسم کے اندر چونکہ بالوں کی کثرت ہوتی ہے اور زیب وزینت میں ان کا بڑا دخل ہے، نیز بالوں کے متعلق لوگ ہمیشہ سے افراط وتفریط کا شکار رہے ہیں؛ اس لیے اسلام نے دیگر شعبہائے زندگی کی طرح بالوں کے احکام کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا، مثلاً کس عضو کے بال کاٹے جائیں اور کہاں چھوڑیں، اور پھر چھوڑنے کی مقدار کتنی ہو، بالوں کو اپنی ہیئت پر رکھنا ہے یا ان میں رنگ وغیرہ سے تبدیلی کر سکتے ہیں یا نہیں وغیرہ وغیرہ۔

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَمَرَ بِإِحْفَاءِ الشَّوَارِبِ وَإِعْفَاءِ اللِّحٰى.

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مونچھوں کو کترنے کا اور داڑھی کو بڑھانے کا حکم دیا ہے۔

تشریح: حدیثِ پاک میں دو حکم بیان کیے گئے ہیں: (۱) مونچھ تراشنا (۲) ڈاڑھی بڑھانا۔

مونچھ تراشنا: مونچھوں کے بارے میں حدیثوں میں پانچ الفاظ وارد ہوئے ہیں:
(۱) احفاء (۲) قص (۳) جز (۴) انہاک (۵) اَخذ

مونڈنے کا ذکر صاف طور پر کسی حدیث میں نہیں ہے؛ اس لیے امام مالکؒ کے نزدیک مونڈنا منع ہے؛ بلکہ امام مالکؒ مونڈنے کو مثلہ قرار دیتے ہیں۔

احنافؒ کے یہاں ایک قول مونڈنے کے بدعت ہونے کا ہے اور دوسرے قول کے مطابق مونڈنا سنت ہے، مجتبیٰ میں امام طحاویؒ کے حوالہ سے اس قول کی نسبت ہمارے تینوں ائمہ کی طرف کی گئی ہے؛ لیکن درمختار میں اس کو صیغۂ تمریض سے ذکر کیا یعنی یہ ضعیف ہے۔

اختلافِ اقوال کی وجہ یہ ہے کہ مونچھ کے سلسلہ میں جو پانچ الفاظ مروی ہیں ان میں سے احفاء اور انہاک سے مبالغہ پر دلالت ہے اور کامل مبالغہ منڈوانے میں ہے؛ لیکن اگر مونڈنا ہی مقصود ہوتا تو لفظ حلق استعمال کیا جاتا، لہٰذا قولِ فیصل یہ ہے کہ مونڈانا بدعت نہیں؛ لیکن مبالغہ کے ساتھ کترنا سنت ہے، حضرت مولانا زکریاؒ فرماتے ہیں: اکثر علماء کی تحقیق یہ ہے کہ کتروانا سنت ہے؛ لیکن کتروانے میں ایسا مبالغہ ہو کہ مونڈنے کے قریب ہوجائے۔

البتہ احنافؒ کے نزدیک راجح اور افضل شکل میں تین قول ہیں: (۱) مونچھیں اتنی کاٹ لی جائیں کہ اوپر کے ہونٹ کا کنارہ ظاہر ہوجائے (۲) دوسرا قول یہ ہے کہ بھنوؤں کے مانند بنادے (۳) تیسرا قول یہ ہے کہ مونچھ کتر کر بالکل پست کردی جائے اور شوافعؒ اور مالکیہؒ کے نزدیک مذکورہ اقوال میں سے پہلا قول پسندیدہ ہے۔

ڈاڑھی کا مسئلہ:

مسلم قوم کا ایک مستقل وممتاز ملت ہے، جو تمام اقوام وملل سے بالکل علیحدہ فطرتِ سلیمہ کی حامل و مالک ہے، اس قوم کے شعائر میں سے ایک اہم شعار داڑھی ہے؛ بلکہ داڑھی انسانی وفطری اُصول کے عین مطابق ہے اور خواص رجولیت میں سے ہے جس کے ذریعہ مردانہ وزنانہ حسن میں امتیاز قائم ہوتا ہے اور شرافت اور بزرگی کی علامت ہے؛ لیکن افسوس آج مسلمان ہی اس کی صفائی کے درپہ ہیں، اس وجہ سے وہ قومی اور ملی امتیاز سے قطعِ نظر فطرت وانسانیت کے لیے بھی مضحکہ خیزی کا ذریعہ بن رہے ہیں۔

ڈاڑھی کا حکم:

باجماعِ امت مرد کے لیے ڈاڑھی رکھنا واجب ہے، بلا عذرِ شرعی منڈوانا حرام ہے،

اس کا مرتکب فاسق ہے، اور آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین اور کفار کے طریقہ کو اختیار کرنے والا قرار دیا ہے عن ابن عمر رضي الله عنهما قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: انهكوا الشوارب واعفوا اللحي. وفي رواية خالفوا المشركين أحفوا الشوارب وأوفوا اللحي. اور اسی طرح کی متعدد احادیث میں داڑھی بڑھانے کا حکم دیا گیا ہے اور علامہ محمود سبکی مالکیؒ فرماتے ہیں: امر وجوب کے لیے ہوتا ہے اور بلا دلیل اس سے رُخ نہیں پھیرا جاسکتا، لہٰذا یہاں امر وجوب کے لیے ہوگا۔

شاہ ولی اللہؒ نے ڈاڑھی کاٹنے والے کو اللہ کی تخلیق میں تغیر کرنے والا کہا ہے۔

ڈاڑھی کی مقدار:

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ داڑھی رکھنے کی کوئی مقدار متعین نہیں ہے مطلقاً اس کو رکھنے کا حکم دیا گیا ہے، پس اتنی داڑھی رکھ لی جائے جس پر عرفِ عام میں داڑھی کا اطلاق ہوسکے، اس سے شارع کا مقصد پورا ہوجائے گا۔

لیکن مذکورہ خیال فاسد ہے؛ کیونکہ جب ہم ان احادیث پر نظر ڈالتے ہیں جن میں داڑھی بڑھانے کا حکم دیا گیا ہے تو ہم اس کے متعلق چھ قسم کے الفاظ پاتے ہیں:

(۱) أعفوا اس کے معنیٰ ہیں بالوں کو دراز ہونے تک بڑھانا (۲) أوفوا (پورا پورا دینا) (۳) أرخوا (ارخا کے معنیٰ ہیں کسی چیز کو ڈھیلا چھوڑ دینا وسیع کرنا) (۴) أرجوا (إرجاء کے معنیٰ ہیں مؤخر کرنا، بالکل نہ لینا یعنی پورا باقی چھوڑ دینا) (۵) وَفِّروا (زیادہ کرنا، پورا کرنا) (٦) دَعُوْا (چھوڑ دو)، مذکورہ تمام الفاظ میں جہاں ڈاڑھی رکھنے کا امر ہے وہیں اس کو بڑھانے کا بھی حکم دیا گیا ہے جس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ داڑھی کا حکم مطلق نہیں ہے جتنی مرضی آئے رکھ لی جائے۔

اس کے علاوہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی داڑھی کے بارے میں مسلم شریف میں ہے: كان (صلى الله عليه وسلم) كثير شعر اللحية اس روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی داڑھی کے گھنا ہونے کا ذکر ہے اور لمبائی کا اندازہ خباب بن الارت رضی اللہ

عنہ کی روایت سے ہوتا ہے، ایک شخص نے ان سے پوچھا نبی صلی اللہ علیہ وسلم ظہر اور عصر میں قرأت کیا کرتے تھے؟ تو انہوں نے کہا ہاں! سائل نے کہا تمہیں کیسے پتہ چلا؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ریش مبارک کے ہلنے سے سمجھتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قراءت فرمارہے ہیں۔ (ابوداؤد)

اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ قراءت سے وہی داڑھی ہل سکتی ہے جو دراز ہو، اس کے علاوہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہے کہ ان کی دارھی گھنی تو نہ تھی؛ لیکن دراز تھی، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی داڑھی اتنی چوڑی تھی جس نے دونوں شانوں کے درمیان جگہ گھیر رکھی تھی، اس کے علاوہ کتابوں میں بے شمار دلائل ہیں جو درازیٔ لحیہ کو ثابت کرتے ہیں، اہلِ فقہ نے صرف یہ کیا ہے کہ ان تمام دلائل کی روشنی میں ایک مٹھی کی مقدار کی حد بندی کردی ہے اور اتنی مقدار داڑھی سنت ہے؛ اسی لیے اسلافؒ میں سے کسی سے بھی ایک مشت سے کم کی روایت نہ عملاً منقول ہے اور نہ قولاً منقول ہے۔

ایک مشت سے زائد ڈاڑھی کا حکم:

حنفیہؒ کے نزدیک ایک مشت سے زائد داڑھی کے بالوں کو کاٹنا پسندیدہ اور بہتر ہے، ترمذی کی حدیث میں ہے: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يأخذ من لحيته من طولها وعرضها۔ امام غزالیؒ نے فرمایا جو ایک مشت سے زائد ہو اسے کاٹنے میں کوئی حرج نہیں ہے، ابنِ عمر رضی اللہ عنہما اور تابعینؒ کی ایک جماعت کا یہی عمل تھا، امام شعبیؒ اور ابنِ سیرینؒ نے اسے مستحسن قرار دیا ہے، نیز اس کے کاٹنے سے انسان بدہیئت معلوم نہیں ہوتا۔

اور امام مالکؒ کے نزدیک قبضہ کی حد کے بغیر جو بال بہت زیادہ بڑھ جائیں انہیں کاٹ لینا بہتر ہے اور امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کی روایت کے مطابق داڑھی کے ساتھ کوئی تعرض نہ کیا جائے، اسے اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے؛ کیونکہ حدیث میں ''أعفوا اللحية'' کہا گیا ہے۔ (کما قالہ النووی)

(۱) سوال: جب داڑھی رکھنا واجب ہے تو پھر فقہ و فتاویٰ کی کتابوں میں اسے سنت کیوں کہا گیا ہے؟

جواب: سنت سے مراد یہ ہے کہ داڑھی کا ثبوت حدیث و سنت سے ہے اور یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا طریقہ وراستہ ہے۔

عَنْ حُمَيْدِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ أَنَّهُ سَمِعَ مُعَاوِيَةَ بْنَ أَبِي سُفْيَانَ عَامَ حَجَّ وَهُوَ عَلَى الْمِنْبَرِ وَتَنَاوَلَ قُصَّةً مِّنْ شَعْرٍ كَانَتْ فِي يَدِ حَرَسِيٍّ يَقُولُ يَا أَهْلَ الْمَدِيْنَةِ أَيْنَ عُلَمَاءُكُمْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْهٰى عَنْ مِّثْلِ هٰذِهٖ وَيَقُوْلُ إِنَّمَا هَلَكَتْ بَنُوْا إِسْرَائِيْلَ حِيْنَ اتَّخَذَ هٰذِهٖ نِسَاؤُهُمْ

ترجمہ: حمید بن عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حج کے سال حضرت امیر معاویہ بن سفیان رضی اللہ عنہما کو فرماتے ہوئے سنا اس حال میں کہ وہ منبر پر تشریف فرما تھے اور انہوں نے ایک خادم کے ہاتھ سے بالوں کا ایک گچھا لیا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ فرما رہے تھے' اے مدینہ والو! تمہارے علماء حضرات کہاں ہیں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے کرنے سے منع فرماتے ہوئے سنا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے بنی اسرائیل اسی وقت ہلاک ہوئے جب ان کی عورتوں نے اس طرح کا عمل کیا۔

تشریح: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے خلیفہ بننے کے بعد پہلا حج ۴۴ھ میں کیا تھا، اس کے بعد آپ نے مختلف حج کیے ہیں اور یہ کس حج کا واقعہ ہے، اس بارے میں شدید اختلاف ہے، علامہ زرقانی نے فرمایا: یہ واقعہ ۵۱ھ کے حج کا ہے جبکہ حافظ ابن حجرؒ نے اسے آخری حج بتایا ہے، اور بعض لوگوں نے اسے ۵۰ھ اور ۵۱ھ کا واقعہ قرار دیا ہے، بہرحال انہیں ایامِ حج میں آپ رضی اللہ عنہ منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر تشریف لائے، آپ کے ساتھ خدام بھی تھے، آپ نے ایک خادم کے ہاتھ سے بالوں کا ایک گچھا لیا، پہلے تو یہ فرمایا کہ تمہارے

علماء کہاں ہیں؟ شاید آپ نے وہاں کچھ عورتوں کو اپنے بالوں سے دوسرے بالوں کو ملائے دیکھا تھا۔
(آپ نے علماء کے بارے میں کیوں معلوم کیا؟ اس کی مختلف توجیہات کی گئی ہیں،
حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا: اس میں اشارہ ہے اس بات کی جانب کے علماء اس زمانہ میں بالکل کم ہوگئے؛ کیونکہ اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم وفات پاچکے تھے اور انہوں نے سمجھا جاہل عوام ایسا عمل کرتی ہے تو انہوں نے علماء کو تنبیہ کا ارادہ کیا کہ انہوں نے نکیر کو کیوں چھوڑ رکھا ہے، یا ہوسکتا ہے کہ وہاں موجود صحابہ کو جو احادیث پہنچی تھیں، ان سے انہوں نے عدمِ تحریم سمجھا اور کراہتِ تنزیہی پر محمول کیا، یا پھر اس وقت ظالم امرا کے خوف سے علماء نے نکیر وغیرہ کرنا چھوڑ دی تھی، ایسا بھی ممکن ہے کہ یہ خطبہ جمعہ کے دن کے علاوہ ہو اور اتفاق سے مجلس میں اکثر ایسے ہی لوگ ہوں جو اہلِ علم نہ تھے، یہ تمام اعذار اور تاویلات اس لیے ہیں؛ تاکہ اس وقت موجود علماء اور صحابہ کی طرف نکیر نہ کرنے کی غلط نسبت نہ ہو)

پھر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس طرح کرنے سے یعنی بالوں میں الگ سے بال جوڑنے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے بنی اسرائیل کی ہلاکت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کی عورتیں اپنے بالوں میں دوسرے بال جوڑتی تھیں، اس کی ممانعت کی وجہ تدلیس، دھوکہ اور تغیر ہے یعنی اللہ نے جس حالت میں بنایا ہے، اسی پر رضا مند رہنا چاہیے۔

بالوں کے ساتھ دوسرے کے بال ملانے کا حکم:

حضرات فقہاء کے نزدیک بالوں کے ساتھ کوئی چیز جوڑنے کے بارے میں اختلاف ہے:

پہلا موقف ان لوگوں کا ہے جو تمام چیزوں کو بالوں میں جوڑنے کی مطلقاً اجازت دیتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ اس کا جواز حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ثابت ہے؛ لیکن امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ اس طرح کی کوئی روایت نہیں ہے۔

دوسرا مذہب ان حضرات کا ہے جنہوں نے مطلقاً ممنوع قرار دیا ہے یعنی بال غیر بال

کسی چیز کو بھی بال میں جوڑنے کی اجازت نہیں، یہ مذہب امام مالکؒ، امام طبریؒ اور شوافع میں سے امام نوویؒ کا ہے اور ایک روایت امام احمدؒ سے بھی اسی طرح ہے۔

ان حضرات کی دلیل حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت لعن الله الواصلة سے ہے کہ اس میں مطلقاً وصل پر لعنت فرمائی گئی ہے، دوسرا استدلال مسلم کی ایک روایت سے ہے جس میں ہے: زجر رسول الله أن تصل المرأة بشعرها شيئًا اس حدیث میں ''شئ'' اطلاقِ زجر پر دلالت کر رہا ہے۔

تیسرا مذہب خود امام شافعیؒ کا ہے کہ بالوں میں آدمی کے بال جوڑنا مطلقاً حرام ہے؛ البتہ شادی شدہ عورت یا باندی کو شوہر اور مالک کی اجازت سے غیر آدمی کے پاک بالوں کو جوڑنے کی اجازت ہے۔

چوتھا مسلک حنابلہؒ میں سے موفقؒ کا پسندیدہ ہے کہ بالوں سے بال ملانے کی مطلقاً ممانعت ہے اور غیر بال کو ملانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اور پانچواں مذہب حنفیہؒ کا ہے کہ آدمی کے بالوں کو ملانا حرام ہے اور اس کے علاوہ کے بال اور دوسری چیزوں کو ملانا جائز ہے، یہی مذہب لیثؒ کا ہے۔

ان کا استدلال حدیثِ باب سے ہے اور غیر آدمی کے بالوں کو ملانے کی اجازت ابوداوَد کی ایک روایت سے معلوم ہوتی ہے: عن سعيد بن جبير قال: لابأس بالقرامل، قرامل قرمل کی جمع ہے اس کے معنیٰ ہیں لمبی لمبی نرم گھاس، اور یہاں ریشم یا اُون کے دھاگے مراد ہیں جو عورتیں اپنے بالوں میں لگاتی ہیں۔

وقال الإمام محمد بعد تخريج هذا الحديث أي حديث معاوية، وبهذا نأخذ، يكره للمرأة نصل شعراً إلى شعرها أو تتخذ قصة شعر، ولا بأس بالوصل في الرأس إذا كان صوفًا... وهو قول أبي حنيفة والعامة من فقهائنا.

لغات: قُصّة بضم القاف هي شعر الناصية والمراد ههنا قطعة من الشعر.

حرسي، بفتح الحاء والراء وكسر السين نسبة إلى الحرس، وهم خدم الأمير الذين يحرسونه.

عَنْ زِيَادِ بْنِ سَعْدٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ أَنَّهُ سَمِعَهُ يَقُوْلُ لِرَجُلٍ سَدَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَاصِيَتَهُ مَا شَاءَ اللّٰهُ ثُمَّ فَرَّقَ بَعْدَ ذٰلِكَ.

ترجمہ: زیاد بن سعد سے روایت کرتے ہیں ابنِ شہاب زہری سے انہوں نے ایک شخص سے کہتے ہوئے سنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بالوں کو پیشانی پر چھوڑے رہے جب تک اللہ نے چاہا اس کے بعد آپ نے مانگ نکالی۔

تشریح: نبی صلی اللہ علیہ وسلم ابتداءً جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہود کے اعمال کی موافقت پسند کرتے تھے؛ چنانچہ جب وہ لوگ بالوں کو چھوڑتے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی چھوڑتے تھے؛ لیکن جب اللہ کی طرف سے ان کی مخالفت کا حکم آ گیا اور اسلام غالب ہو گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی موافقت چھوڑ دی؛ بلکہ بہت سے اُمور میں مخالفت کا حکم فرمایا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بالوں کو پیشانی پر بکھرا ہوا چھوڑنے کو ترک فرمادیا اور سر میں مانگ نکالنے لگے؛ لیکن سدل کا حکم منسوخ نہیں ہے؛ بلکہ سدل بھی جائز ہے؛ البتہ فرق مستحب ہے۔

وضاحت: احکام کے نزول سے پہلے کسی امر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہود کی موافقت کرتے تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بتادیا گیا تھا کہ اہلِ کتاب نے اپنی شریعت کے اس حکم کو بدلا نہیں ہے یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کی موافقت کے ذریعہ ان کو اسلام سے مانوس کرنا چاہتے تھے۔

لغات: سدل: أ أرسل الشعر على جبهته.

فرق: الفرق أن يجعل الشعر فريقتين: بالوں کو حصوں کو تقسیم کردینا۔

قَالَ مَالِكٌ رحمه الله: لَيْسَ عَلَى الرَّجُلِ يَنْظُرُ إِلىٰ شَعْرِ امْرَأَةِ إِبْنِهِ أَوْ شَعَرِ أُمِّ امْرَأَتِهِ بَأْسٌ.

ترجمہ: حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں: مرد کے لیے اپنے بیٹے کی بیوی اور اپنی ساس کے بال دیکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

تشریح: یہی حکم جمہورؒ کے نزدیک ہے کہ بہو اور ساس کے بال دیکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے؛ کیونکہ یہ محرمات میں سے ہیں اور سورۂ نور میں محارم کے لیے مواضعِ زینت کو دیکھنے کی اجازت دی گئی ہے۔

وفي الهداية ينظر الرجل من ذوات محارمه إلى الوجه والرأس والصدر والساقين والعضدين ولاينظر إلى ظهرها وبطنها وفخذها والأصل في قوله تعالى: ﴿وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ﴾ (الآية)۔

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ أَنَّهُ كَانَ يَكْرَهُ الْإِخْصَاءَ وَيَقُوْلُ فِيْهِ تَمَامُ الْخَلْقِ.

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما خصی ہونے کو ناپسند فرماتے تھے اور فرماتے تھے کہ خصی نہ ہونے میں خلقت کی تکمیل ہے۔

إخصاء وخصاء کے معنی ہیں خصیتین کو ختم کر دینا تا کہ شہوت باقی نہ رہے۔

خصی ہونے کا حکم

حافظ ابنِ حجرؒ فرماتے ہیں کہ آدمی خواہ چھوٹا ہو یا بڑا خصی ہونا حرام ہے، متعدد احادیث میں اس کی نہی وارد ہوئی ہے: (۱) عن عبد الله بن مسعود قال: كنا نغزوا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم وليس لنا شيئ فقلنا: ألا نستخصي فنهانا عن ذلك. (بخاری) وفي رواية أن عثمان رضي الله عنه قال: يا رسول الله! إئذن لي في الإختصاء فقال إن الله قد أبدلنا بالرهبانية الحنيفية السمحة. (طبرانی)

اس کی حکمت یہ ہے کہ شارع کا جو مقصد تکثیرِ نسلِ انسانی ہے وہ اس سے فوت ہو جاتا ہے، نیز نفس کو تکلیف دینا ہے اور ایسے نقصان وضرر میں پڑنے کا اندیشہ ہے جو ہلاکت کا

سبب ہوسکتا ہے، اسی طرح اللہ نے جو رجولیت ودیعت فرمائی اس کا ختم کرنا ہے جواز قبیلِ تغیر خلق اللہ اور کفرانِ نعمت ہے، نیز تشبہ بالنساء اور کمال کے مقابلہ میں نقص کو ترجیح دینا ہے۔

رہا غیر آدمی کو خصی کرنے کا مسئلہ تو حنفیہ کے نزدیک تمام جانوروں کو خصی کرنا جائز ہے: قال محمد في كتاب الآثار أخبرنا أبوحنيفة عن حماد عن إبراهيم أنه قال لابأس بأخصاء البهائم إذا كان يراد به صلاحها، قال وبه نأخذ، وهو قول أبي حنيفة. اور شوافع کے نزدیک غیر ماکول جانوروں کو خصی کرنا جائز نہیں ہے؛ البتہ ماکول اللحم جانور کو اسے چھوٹا ہونے کے وقت جائز ہے اور جب بڑا ہوجائے تو جائز نہیں، اور امام مالکؒ نے ماکول اللحم جانوروں کو خصی کرنے کی اجازت دی ہے، اور امام احمدؒ کے نزدیک صرف بکرے کو خصی کرنے کی اجازت ہے؛ کیونکہ اس سے گوشت ذائقہ دار ہوجاتا ہے۔ (الموسوعۃ الفقہیۃ: ۱۹/۱۲۲)

نوٹ: اس روایت کو کتاب الشعر میں ذکر کرنے کی وجہ شاید یہ ہے کہ بالوں کو حلق وغیرہ سنت طریقہ کے علاوہ کسی ممنوع شئ سے زائل نہیں کرنا چاہیے؛ چونکہ بالوں کی کثرت مردانگی کی وجہ سے ہوتی ہے اور رجولیت کو ختم کرنا گویا بالوں کو زائل کرنا ہے؛ اسی لیے اخصاء سے منع کیا گیا ہے۔

عَنْ صَفْوَانِ بْنِ سُلَيْمٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ أَنَا وَكَافِلُ الْيَتِيْمِ لَهُ أَوْ لِغَيْرِهِ فِي الْجَنَّةِ كَهَاتَيْنِ إِذَا اتَّقَى وَأَشَارَ بِإِصْبَعِهِ الْوُسْطٰى وَالَّتِيْ تَلِي الْإِبْهَامَ.

ترجمہ: صفوان بن سلیم کو یہ بات پہنچی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا خواہ یتیم اپنا ہو یا غیر کا جنت میں ہوں گے ان دو (انگلیوں) کی طرح بشرطیکہ وہ (گناہوں سے) پرہیز بھی کرتا ہو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا اپنی انگلیوں میں سے بیچ والی اور اس کے برابر والی سے۔

تشریح: حدیث کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگشت

شہادت اور بیچ والی انگلی سے اشارہ کر کے بتلایا کہ جیسا تھوڑا سا فاصلہ اور فرق تم میری ان دو انگلیوں کے درمیان دیکھتے ہو، بس اتنا ہی فاصلہ اور فرق میرے اور شخص کے مقام میں ہوگا جو اللہ کے لیے اس دنیا میں کسی یتیم کی کفالت کا بوجھ اٹھائے۔

كافل اليتيم له أو لغير: أي القائم بأمر اليتيم الذي ذا قرابة أولا قرابة له.

اپنے اور غیر کے یتیم سے مراد یہ ہے کہ اگر کسی بچہ کی ماں اپنے شوہر کے انتقال کے بعد کفالت کرے تو وہ اس کا اپنا یتیم ہوگا، یا پھر کوئی مرد ہی اپنے کسی رشتہ دار یتیم کی کفالت کرے تو وہ اپنا یتیم ہوگا؛ کیونکہ یتیم باپ کے مرنے کے بعد ہوتا ہے نہ کہ ماں کے مرنے کے بعد، اسی طرح حافظ ابنِ حجرؒ نے فرمایا: اگر کسی کا کوئی دادا یا چچا اپنے پوتے یا بھتیجے کی کفالت کرے تو وہ اپنا یتیم ہوگا اور اس کے علاوہ غیر کا یتیم ہوگا۔

أشار بأصبعيه: یہ کافل یتیم کے رفع درجہ کی ایک تشبیہ ہے اور رفع درجہ کے بیان میں مبالغہ ہے؛ ورنہ انبیاء کا درجہ خصوصاً خاتم الانبیاء کا امت کے تمام افراد سے بہت اعلیٰ وارفع ہے، آخر شہادت اور بیچ کی انگلی میں کچھ فرق بھی ہے، یہی فرق مراتب کی طرف اشارہ ہے۔

إذا اتقى: مراد یہ ہے کہ جنت کا حق دار اس وقت ہوگا جب کفالت یتیم کے ساتھ ان تمام منہیات سے رُک جائے جو مانع دخولِ جنت ہیں یا مراد یہ ہے کہ یتیم کی پرورش کرتے وقت اس کے مال میں یا اس سے برتاؤ کرتے وقت بہت محتاط رہے۔

(عون الترمذی، اوجز المسالک)

بَابٌ فِيْ إِصْلَاحِ الشَّعْرِ

(بالوں کی درستگی کا بیان)

شریعت کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ انسان اپنے سر اور ڈاڑھی کے بالوں کو درست رکھے، بالوں کو بکھرا ہوا اور پراگندہ حالت میں نہ رکھا جائے کہ ناشائستگی اور

بدتہذیبی کا مظاہرہ ہو؛ کیونکہ اس قدر زینت شریعت میں مطلوب بھی ہے۔

عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيْدٍ أَنَّ أَبَا قَتَادَةَ الْأَنْصَارِيَّ قَالَ لِرَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ لِي جُمَّةً فَأُرَجِّلُهَا قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَعَمْ وَأَكْرِمْهَا فَكَانَ أَبُوْ قَتَادَةَ رُبَمَا دَهَنَهَا فِي الْيَوْمِ مَرَّتَيْنِ لِمَا قَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَكْرِمْهَا.

ترجمہ: یحییٰ بن سعیدؒ سے روایت ہے کہ ابوقتادہ انصاری رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میرے سر کے بال مونڈھوں تک ہیں، کیا میں ان میں کنگھی کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا جی ہاں! اوران کا اکرام کرو؛ چنانچہ ابوقتادہ (اس کے بعد) کبھی کبھی دن میں دومرتبہ اپنے سر میں تیل لگاتے تھے؛ کیونکہ ان سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اپنے بالوں کا اکرام کرو یعنی خیال رکھو۔

تشریح: حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کے بال بڑے بڑے تھے، توانہوں نے دریافت کیا کہ کنگھی وغیرہ کرنا شریعت کے خلاف تونہیں ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں کنگھی کرنے کا حکم دیا، مزید فرمایا بالوں کا اکرام کرو، اس سے مراد یہ ہے کہ دھول، مٹی، گردوغبار سے ان کی حفاظت کرواور صاف ستھرے کرکے اُن میں تیل لگاؤ، یہی وجہ تھی کہ ابوقتادہ کبھی کبھی دن میں دومرتبہ بھی تیل لگالیتے تھے اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے امر کے امتثال کی وجہ سے تھا، ان کے نفس کو زینت مطلوب نہیں تھی۔

جمة: بضم الجيم وشد الميم سر کے بال جب کاندھوں تک پہنچ جائیں، لمة: وہ بال جو آدھی گردن تک آجائیں، والوفرة: وہ بال جو کانوں کی لو تک ہوں، احادیث میں مذکور ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بال تینوں حالتوں میں رہتے تھے اور حدیثِ باب سے معلوم ہوتا ہے کہ امتیوں کے لیے بھی اس طرح بال رکھنے کی اجازت ہے، تاہم جب بال بڑھائے جائیں توان کی صفائی ستھرائی اوران میں تیل لگانے اور کنگھی کرنے کا بھی اہتمام کیاجائے۔

عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ أَنَّ عَطَاءَ بْنَ يَسَارٍ أَخْبَرَهُ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمَسْجِدِ فَدَخَلَ رَجُلٌ ثَائِرُ الرَّأْسِ وَاللِّحْيَةِ فَأَشَارَ إِلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِيَدِهِ أَنِ اخْرُجْ كَأَنَّهُ يَعْنِي إِصْلَاحَ شَعْرِ رَأْسِهِ وَلِحْيَتِهِ فَفَعَلَ الرَّجُلُ ثُمَّ رَجَعَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَلَيْسَ هٰذَا خَيْرًا مِنْ أَنْ يَأْتِيَ أَحَدُكُمْ ثَائِرَ الرَّأْسِ كَأَنَّهُ شَيْطَانٌ.

ترجمہ وتشریح: زید بن اسلم سے روایت ہے کہ عطاء بن یسار نے انہیں خبر دی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبویؐ میں تشریف فرما تھے، اسی وقت بکھرے بال اور بکھری داڑھی والا ایک شخص داخل ہوا، آپؐ نے اسے اپنے ہاتھ سے اشارہ دیا کہ وہ باہر نکل جائے یعنی آپؐ کی مراد یہ تھی کہ بال اور داڑھی کو ٹھیک کر کے داخل ہو؛ چنانچہ وہ شخص بالوں کو درست کر کے واپس آیا (علامہ باجیؒ فرماتے ہیں، آپؐ نے اصلاحِ شعر کے لیے باہر بھیجا، اس سے معلوم ہوا مسجد میں بالوں میں کنگھی وغیرہ نہیں کرنی چاہیے، ممکن ہے، بال گر جائیں اور لوگوں کو کراہت ہو یا کوئی جوں وغیرہ مسجد میں گر جائے) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا یہ بہتر نہیں اس سے کہ کوئی شخص اپنے بالوں کو بکھیرے ہوئے آئے، ایسا لگے کہ شیطان ہے (یہ تشبیہ قباحت کے طور پر ہے، حقیقتاً شیطان کہنا مراد نہیں ہے) اس حدیث کا مقصد بھی یہی ہے کہ انسان کو اپنے بالوں کا خیال رکھنا چاہیے، ان کو بکھیر کر بدہیئت اور بدنما شکل اختیار نہ کرے۔

مَا جَاءَ فِيْ صَبْغِ الشَّعْرِ

(بالوں کو رنگنے کا بیان)

عَنِ ابْنِ أَبِي سَلَمَةَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ أَنَّ عَبْدَ الرَّحْمٰنِ بْنَ الْأَسْوَدِ بْنِ عَبْدِ يَغُوْثَ قَالَ وَكَانَ جَلِيْسًا لَّهُمْ وَكَانَ أَبْيَضَ الرَّأْسِ وَاللِّحْيَةِ قَالَ فَغَدَا عَلَيْهِمْ ذَاتَ يَوْمٍ وَقَدْ حَمَّرَهَا قَالَ فَقَالَ لَهُ الْقَوْمُ هٰذَا أَحْسَنُ قَالَ إِنَّ أُمِّي عَائِشَةَ زَوْجَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَرْسَلَتْ إِلَى الْبَارِحَةِ جَارِيَتَهَا

نُخَيْلَةَ فَاقْسَمَتْ عَلَيَّ لَأَصْبَغَنَّ وَأَخْبَرَتْنِي أَنَّ أَبَابَكْرٍ الصِّدِّيْقِ كَانَ يَصْبُغُ.

ترجمہ: عبدالرحمن بن اسود نے فرمایا اس خال میں کہ وہ اپنے ساتھیوں کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور ان کی ڈاڑھی اور سر کے بال سفید تھے، پھر کسی اور دن ان کی مجلس میں آئے اور انہوں نے اپنے بالوں کو لال کر لیا تھا، ابوسلمہ کہتے ہیں کہ لوگوں نے ان سے کہا کہ بہت اچھا ہے (خضاب کرنا) عبدالرحمن ابنِ اسود نے کہا میری امی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ نے گزشتہ رات میرے پاس اپنی باندی نخیلہ کو بھیجا اور مجھے یہ قسم دلائی کہ میں اپنے بالوں کو ضرور رنگوں گا اور (اس باندی کے واسطہ سے) مجھے خبر دی کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خضاب لگاتے تھے۔

قَالَ مَالِكٌ رحمه الله: فِيْ صَبْغِ الشَّعْرِ بِالسَّوَادِ لَمْ أَسْمَعْ فِيْ ذٰلِكَ شَيْئًا مَعْلُوْمًا وَغَيْرُ ذٰلِكَ مِنَ الصَّبْغِ أَحَبُّ إِلَيَّ قَالَ وَتَرْكُ الصَّبْغِ كُلِّهِ وَاسِعٌ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ لَيْسَ عَلَى النَّاسِ فِيْهِ ضَيْقٌ.

قَالَ مَالِكٌ رحمه الله: فِيْ هٰذَا الْحَدِيْثِ بَيَانُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَصْبُغْ وَلَوْ صَبَغَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَأَرْسَلَتْ بِذٰلِكَ عَائِشَةَ إِلَى عَبْدِ الرَّحْمٰنِ ابْنِ الْأَسْوَدِ.

ترجمہ: حضرت امام مالک فرماتے ہیں: بالوں پر سیاہ خضاب کرنے کے بارے میں کوئی صحیح ثابت بات نہیں سنی، اس کے علاوہ چیزوں کا خضاب میرے نزدیک پسندیدہ ہے اور فرمایا اور بالکل خضاب نہ کرنے کی بھی گنجائش ہے، ان شاء اللہ اس بارے میں لوگوں پر کوئی تنگی نہیں ہے۔

ترجمہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بالوں پر خضاب نہیں لگایا تھا، اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لگایا ہوتا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنی باندی کو عبدالرحمن کے پاس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق خبر دینے کو بھیجتیں (یعنی فعل نبی صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ قابلِ استدلال ہے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں)

تشریح: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بذاتِ خود کبھی خضاب استعمال نہیں فرمایا؛ کیونکہ آپ کے سر اور ڈاڑھی مبارک میں زیادہ سے زیادہ ۲۱/۲۰ بال سفید تھے، لہٰذا ضرورت نہیں پڑی۔ اور حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں: باب کی روایت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خضاب نہیں لگایا؛ کیونکہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے استعمال کیا ہوتا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا عبدالرحمٰن بن اسود کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خضاب لگانے کا حوالہ دیتیں نہ کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے خضاب لگانے کا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: أنّ النبي صلى الله عليه وسلم لم يخضب، اور جو بعض روایات میں ہے کہ حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس داڑھی کا ایک بال تھا جس میں مہندی کا اثر تھا، اس کا جواب محدثین نے یہ دیا ہے تیل یا خوشبو کی وجہ سے اس میں زردی آ گئی تھی جس میں اسے رکھا گیا تھا یا پھر انہوں نے خود بال کو رنگ وغیرہ لگایا ہو۔

البتہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حنا اور کتم نامی گھاس کا خضاب لگایا کرتے تھے، نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث میں خضاب لگانے کا حکم بھی فرمایا ہے؛ اس لیے خضاب لگانا سنت ہے، فتح مکہ کے دن جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے والد ابوقحافہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لگایا اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بالوں کو سفید دیکھا تو فرمایا: غيروا هذا بشيئ وجنبوه بالسواد.

اصل خضاب کے متعلق حکم یہ ہے کہ وہ سنت ہے لازم اور ضروری نہیں اگر کوئی سفید بالوں پر بالکل خضاب نہ لگائے تو اس کی بھی گنجائش ہے اور یہ قابلِ مواخذہ نہیں ہے، تاہم اگر کوئی شخص اپنے بالوں پر خضاب کرے تو مہندی اور کتم کا کرے جیسا کہ حدیث میں ہے: إن أحسن ماغير به الشيب الحناء والكتم. فائدہ: کتم ایک درخت کا نام ہے جس کے بیج سے قدیم زمانہ میں روشنائی بنائی جاتی تھی، جب مہندی کے پتے اور کتم کو ملا لیا جائے تو سیاہی سرخ خضاب بن جاتا ہے، جو بہترین معلوم ہوتا ہے اور یہ خضاب تمام فقہاء کے

نزدیک مستحب اور بہتر ہے؛ البتہ سیاہ خضاب کے متعلق فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔

سیاہ خضاب کے اغراض کے اعتبار سے اس کے احکام مختلف ہیں:

(۱) اگر مجاہد سیاہ خضاب لگائے؛ تاکہ دشمن پر رعب پڑے تو یہ بالاتفاق جائز ہے۔

(۲) کوئی دھوکہ اور خداع کے طور پر لگائے کہ اپنے آپ کو جوان ظاہر کرے؛ حالانکہ وہ جوان نہ ہو تو یہ بالاتفاق ناجائز ہے، غش وخداع کے ناجائز ہونے کی وجہ سے۔

(۳) بطورِ زینت سیاہ خضاب کا استعمال کیا جائے تو اس بارے میں اختلاف ہے، حنفیہ کے نزدیک عام حالات میں سیاہ خضاب مکروہِ تحریمی ہے اور امام نوویؒ نے بھی اسی کو مختار و پسندیدہ بتایا ہے اور محلی میں ہے کہ امام مالکؒ کے نزدیک مکروہِ تحریمی نہیں ہے اور امام احمدؒ کے نزدیک کراہتِ تحریمی ہے۔

ان تمام حضرات کا استدلال حضرت ابوقحافہؓ والی روایت سے ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنبوه السواد (مسلم) اور دوسرا استدلال ابوداؤد کی روایت سے ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: عن ابن عباس يكون قوم في آخر الزمان يخضبون بالسواد كحواصل الحمام لايريحون رائحة الجنة (آخری زمانہ میں کچھ لوگ ہوں گے جو سیاہ خضاب کریں گے، کبوتروں کے پوٹوں کی طرح وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں پائیں گے)۔

حنفیہؒ میں سے امام ابویوسفؒ نے دولہا بننے کے لیے سیاہ خصاب کی اجازت دی ہے، اسی طرح ایک جماعت نے مطلقاً اجازت دی ہے، اور ان کا استدلال ان آثار سے ہے جن میں بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم سے سیاہ خضاب کا استعمال ثابت ہے، علامہ ابن القیمؒ نے فرمایا: صحیح سند سے ثابت ہے کہ حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما سیاہ خضاب کرتے تھے، اسی طرح عبداللہ بن جعفر، سعید بن وقاص، عقبہ بن عامر، مغیرہ بن شعبہ، جریر بن عبداللہ، عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم اور تابعینؒ کی ایک جماعت سے سیاہ خضاب کا استعمال ثابت ہے۔

مجوزین نے نہی کی احادیث کا جواب یہ دیا ہے کہ سیاہ خضاب کی ممانعت اس وقت ہے جب اس کو دھوکہ وخداع کے طور پر لگایا جائے۔

اور منع کرنے والوں نے ان صحابہ رضی اللہ عنہم کے فعل کی تاویل یہ کی ہے کہ ان لوگوں نے بوقتِ جہاد استعمال کیا ہوگا یا ممکن ہے ممانعت کی حدیث ان کے پاس نہ پہنچی ہو یا سیاہ خضاب بالکل سیاہ نہ ہو؛ بلکہ سیاہی مائل ہو، واللہ اعلم۔ (تکملہ فتح الملہم: ۱۲۸/۴)

مَا يُؤْمَرُ بِهِ مِنَ التَّعَوُّذِ عِنْدَ النَّوْمِ

سونے کے وقت اور دوسرے مواقع پر جن چیزوں سے پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا ہے۔

تعوّذ عوْذ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ ہیں کسی کی پناہ میں جانا، کسی سے چمٹنا۔

سونے کی حالت میں چونکہ انسان کے حواس مکمل طور پر باقی نہیں رہتے اور اس کی دفاعی قوت ختم ہو جاتی ہے اور اس کو معلوم نہیں ہوتا ہے کیا چل رہا ہے، اسی حالت میں ممکن ہے کہ کوئی موذی شئی اسے نقصان پہنچادے؛ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ دعائیں ذکر فرمائی ہیں؛ تاکہ ان کو پڑھ کر انسان اپنی حفاظت کر سکے اور اللہ تعالیٰ کی پناہ میں چلا جائے۔

عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيْدٍ قَالَ بَلَغَنِيْ أَنَّ خَالِدَ بْنَ الْوَلِيْدِ قَالَ لِرَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنِّيْ أُرَوَّعُ فِيْ مَنَامِيْ فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قُلْ أَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللهِ التَّامَّةِ مِنْ غَضَبِهِ وَعِقَابِهِ وَشَرِّ عِبَادِهِ وَمِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِيْنِ وَأَنْ يَّحْضُرُوْنِ.

ترجمہ: یحییٰ بن سعیدؒ کہتے ہیں مجھے خبر پہنچی ہے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: اے اللہ کے نبی! میں نیند میں ڈر جاتا ہوں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: تم یہ کلمات کہہ لیا کرو "أعوذ بکلمات اللہ التامۃ إلخ" (ترجمہ: میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں، تام وکامل کلمات کے ذریعہ

اس کے غضب سے، اس کے عقاب سے اور اس کے بندوں کے شر سے اور سرکش شیاطین سے اور یہ کہ (وہ میرے پاس) آئیں۔

تشریح: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو ایک جامع دعا سکھلائی، جس میں سب سے پہلے اللہ کے عذاب اور عتاب سے پناہ چاہی گئی ہے یعنی اے اللہ! اگر مجھ سے کوئی ایسی غلطی ہو جائے جو آپ کی ناراضگی اور عتاب کا سبب ہو آپ مجھے معاف فرما دیجیے، اور اپنی ناراضگی اور عذاب سے میری حفاظت فرما دیجیے، نیز جو بندے خواہ انسان ہو یا جنات، اپنی سرکشی سے مجھے تکلیف پہنچانا چاہیں، اے اللہ! تو مجھے ان سے محفوظ رکھ، اور شیاطین کے وسوسوں سے میری حفاظت فرما۔

الکلمات التامۃ: امام نوویؒ نے فرمایا: اس سے مراد ایسے کلمات ہیں جن میں نقص وعیب نہ ہو اور وہ قرآن کریم ہے، بعض علماء نے فرمایا: کلماتِ تامہ سے مراد اسماء وصفاتِ الٰہی ہیں؛ اس لیے وہ کامل مکمل ہیں، ان میں اللہ کی ذات کی طرح کوئی نقص نہیں ہے۔

مَالِكٌ أَنَّهُ قَالَ أُسْرِيَ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَرَأَى عِفْرِيْتًا مِنَ الْجِنِّ يَطْلُبُهُ بِشُعْلَةٍ مِنْ نَارٍ كُلَّمَا الْتَفَتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَآهُ فَقَالَ لَهُ جِبْرِيْلُ أَفَلَا أُعَلِّمُكَ كَلِمَاتٍ تَقُوْلُهُنَّ إِذَا أَنْتَ قُلْتَهُنَّ طَفِئَتْ شُعْلَتُهُ وَخَرَّ لِفِيْهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَلٰى فَقَالَ جِبْرِيْلُ قُلْ أَعُوْذُ بِوَجْهِ اللّٰهِ الْكَرِيْمِ وَبِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ الَّتِيْ لَا يُجَاوِزُهُنَّ بَرٌّ وَلَا فَاجِرٌ مِنْ شَرِّ مَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمِنْ شَرِّ مَا يَعْرُجُ فِيْهَا وَشَرِّ مَا ذَرَأَ فِي الْأَرْضِ وَشَرِّ مَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمِنْ فِتَنِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمِنْ طَوَارِقِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ إِلَّا طَارِقًا يَطْرُقُ بِخَيْرٍ يَا رَحْمٰنُ.

ترجمہ: حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں: جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کرائی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سرکش جن کو دیکھا کہ وہ آگ کے شعلہ طلب کرتا ہے جب بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی طرف دیکھنے کے لیے متوجہ ہوتے ہیں، اس وقت

جبرئیل علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا، کیا میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایسے کلمات نہ سکھادوں، جن کو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) پڑھیں، جب بھی آپ ان کلمات کو پڑھیں گے تو اس کے شعلے اور آگ بجھ جائے گی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیوں نہیں (ضرور سکھلایئے) حضرت جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا کہیے: أعوذ باللہ إلخ (ترجمہ: میں اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتا ہوں، اس ذات بابرکت اور ان مکمل وتام کلمات کے وسیلہ سے جن سے کوئی نیک اور بدتجاوز نہیں کرسکتا، اس شر اور برائی سے جو آسمان سے اترتی ہے اور اس کی طرف چڑھتی ہے اور اس برائی سے جو روئے زمین پر پھیلتی ہے اور اس سے نکلتی ہے، اور شب روز کے فتنوں سے، اور رات ودن کے حوادثات سے، علاوہ اس حادثہ کے جو خیر لے کر آئے اے رحم کرنے والے!)

تشریح: راجح قول یہ ہے کہ یہاں معراج سے مراد معراج مشہور نہیں ہے؛ بلکہ اس سے مراد اسراء معنوی ہے **عِفْرِیت فعلیت من العفر**: خبیث، شرکش جن۔

بوجه الكريم: وجہ سے مراد ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔

من شر ماينزل من السماء: اس سے مراد وہ عذاب وعقاب ہیں جو مختلف شکل میں آسمان سے اترتے ہیں۔

ومايعرج فيها: اس سے مراد وہ اعمالِ سیئہ ہیں جو آسمان میں جا کر عقاب کا سبب بنتے ہیں۔

وشر ماذرأ أي بث نشر: یعنی جو روئے زمین پر شر پھیلا ہوا ہے، اور زمین سے جو خرابیاں اور برائیاں نکلتی ہیں۔

ومن فتن الليل والنهار: یعنی رات اور دن میں آنے والے فتنے۔

ومن طوارق لليل: طوارق طارقة کی جمع ہے، اس کے اصل معنیٰ کھٹکھٹانے والا اور چونکہ رات میں آنے والے کو دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت پڑتی ہے؛ اس لیے رات میں آنے والے کو طارق کہہ دیا اور یہاں رات میں آنے والا حادثہ مراد ہے۔

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ تَعَالىٰ عَنْهُ أَنَّ رَجُلًا مِنْ أَسْلَمَ قَالَ مَا نِمْتُ هٰذِهِ اللَّيْلَةَ فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ أَيِّ شَيْءٍ فَقَالَ لَدَغَتْنِيْ عَقْرَبٌ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَمَا إِنَّكَ لَوْ قُلْتَ حِيْنَ أَمْسَيْتَ أَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ لَمْ تَضُرُّكَ.

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قبیلۂ اسلم کے ایک شخص نے عرض کیا آج رات میں سو نہیں پایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے معلوم کیا کسی وجہ سے، اس نے جواب دیا مجھے بچھو نے ڈس لیا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تو نے شام کے وقت یہ کلمات کہہ لیے ہوتے: أعوذ بكلمات الله التامّات إلخ، تو تجھے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔

تشریح: جو شخص مذکورہ دعا کو صبح کو پڑھ لے تو پورے دن اور شام کو پڑھ لے، تو پوری رات تمام طرح کے شرور وفتن اور موذی جانوروں سے حفاظت رہے گی، اور اگر کوئی جانور کاٹ بھی لے تو اس کا زہر جسم میں اثر انداز نہ ہوگا، ان شاء اللہ۔

عَنِ الْقَعْقَاعِ بْنِ حَكِيْمٍ أَنَّ كَعْبَ الْأَحْبَارِ قَالَ لَوْ لَا كَلِمَاتٌ أَقُوْلُهُنَّ لَجَعَلَتْنِي الْيَهُوْدُ حِمَارًا فَقِيْلَ لَهُ وَمَا هُنَّ فَقَالَ أَعُوْذُ بِوَجْهِ اللهِ الْعَظِيْمِ الَّذِيْ لَيْسَ شَيْءٌ أَعْظَمَ مِنْهُ وَبِكَلِمَاتِ اللهِ التَّامَّاتِ الَّتِيْ لَا يُجَاوِزُهُنَّ بَرٌّ وَلَا فَاجِرٌ وَّبِأَسْمَاءِ اللهِ الْحُسْنىٰ كُلِّهَا مَا عَلِمْتُ مِنْهَا وَمَا لَمْ أَعْلَمْ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَبَرَأَ وَذَرَأَ.

ترجمہ: کعب احبارؒ کہتے ہیں: جو کلمات میں پڑھتا ہوں اگر یہ نہ ہوتے تو یہود مجھے گدھا بنا دیتے ان سے معلوم کیا گیا وہ کلمات کیا ہیں؟ تو انہوں نے کہا: "أعوذ بوجه الله العظيم" إلخ

تشریح: یہود کعب احبارؒ کے اسلام لانے کی وجہ سے ان کے دشمن ہو گئے تھے؛ اس لیے ان پر سحر وجادو کرتے رہتے تھے؛ اس لیے کعب فرماتے تھے اگر ان کلمات

کو نہ پڑھتا رہا ہوتا تو یہ مجھے گدھے کی طرح ذلیل وخوار کر دیتے۔

سوال: کیا یہ ممکن ہے کہ سحر وجادو وغیرہ سے ماہیت اور مادہ تبدیل ہو جائے؟

جواب: امام شافعیؒ نے فرمایا: جادو ٹونہ جسم کے اندر مرض وبیماری کی شکل میں اثر انداز ہو سکتا ہے؛ لیکن انسان سے گدھا نہیں بن سکتا ہے؛ اس لیے یہاں گدھا بنانے سے مراد اس کی طرح ذلیل وخوار ہونا ہے۔

وبرأ وذرأ: برأ کے معنیٰ وہ چیزیں جو تفاوت اور نقص سے پاک پیدا کی جائیں۔ ذرأ کے معنیٰ پیدا کرنا، گویا دونوں الفاظ خلق کی تاکید کے طور پر ہیں۔

بَابُ مَا جَاءَ فِي الْمُتَحَابِّيْنَ فِي اللهِ

(اللہ کے لیے محبت کرنے والوں کا بیان)

انسان مدنی الطبع ہے، باہمی تعلقات اس کی ناگزیر ضرورت ہے، اور تعلقات کا اعلیٰ معیار محبت ہے، لوگوں میں انس ومحبت ہو گی تو وہ ایک دوسرے کو نفع پہنچا سکیں گے، اس کے بغیر نہ خود دوسروں سے مانوس ہو سکتے ہیں اور نہ دوسرے اس سے مانوس ہوں گے، پھر محبت کرنے کی مختلف وجوہ ہوتی ہیں؛ لیکن بہتر محبت وہ ہے جو بے غرض ہو؛ اس لیے ضروری ہے کہ مؤمن کی مؤمن سے محبت اللہ کے لیے ہو اور اس کے احکام کے ماتحت ہو، یعنی دوسروں سے مانوس ہونا اور ان کو اپنے سے مانوس کرنا لوجہ اللہ ہو اور کوئی دنیوی غرض اس میں شامل نہ ہو۔ (تحفۃ الالمعی: ۶)

چنانچہ باب میں ذکر کردہ احادیث میں ایسی ہی محبت کے فضائل بیان کیے گئے ہیں۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَنَّهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ اللهَ تَبَارَكَ وَتَعَالىٰ يَقُوْلُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَيْنَ الْمُتَحَابُّوْنَ لِجَلَالِي الْيَوْمَ أُظِلُّهُمْ فِي ظِلِّي يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلِّي.

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: نبی صلی اللہ

علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: روزِ قیامت اللہ تعالیٰ ان کی بلندی کو جتلانے کے لیے فرمائیں گے، میرے حق اور میری طاعت کی تعظیم کے سبب محبت کرنے والے کہاں ہیں (یعنی جن کے محبت کرنے میں کوئی دنیوی غرض اور ہوائے نفس شامل نہیں تھی) آج میں ان کو گرمی کی تپش سے بچانے کے لیے اپنے سایہ میں جگہ دوں گا (قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں: ظلی میں اضافتِ تشریفی اور خلقی ہے) جس دن میرے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہیں ہوگا۔

عَنْ أَبِي سَعِيْدٍ الْخُدْرِيِّ أَوْ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَبْعَةٌ يُّظِلُّهُمُ اللهُ فِي ظِلِّهِ يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهُ إِمَامٌ عَادِلٌ وَشَابٌّ نَّشَأَ فِي عِبَادَةِ اللهِ وَرَجُلٌ قَلْبُهُ مُعَلَّقٌ بِالْمَسْجِدِ إِذَا خَرَجَ مِنْهُ حَتّٰى يَعُوْدَ إِلَيْهِ وَرَجُلَانِ تَحَابَّا فِي اللهِ اجْتَمَعَا عَلٰى ذٰلِكَ وَتَفَرَّقَا وَرَجُلٌ ذَكَرَ اللهَ خَالِيًا فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ وَرَجُلٌ دَعَتْهُ ذَاتُ حَسَبٍ وَّجَمَالٍ فَقَالَ إِنِّي أَخَافُ اللهَ رَبَّ الْعَالَمِيْنَ وَرَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ فَأَخْفَاهَا حَتّٰى لَا تَعْلَمَ شِمَالُهُ مَا تُنْفِقُ يَمِيْنُهُ.

ترجمہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سات قسم کے لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنا سایہ عنایت فرمائیں گے، جس دن ان کے سایہ کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہوگا: (۱) انصاف پرور بادشاہ (۲) اور وہ نوجوان جو اللہ کی عبات میں پروان چڑھا (۳) اور وہ شخص جس کا دل مسجد میں اُٹکا ہوا ہو جب وہ مسجد سے نکلتا ہے، یہاں تک کہ وہ مسجد کی طرف لوٹ آتا ہے (۴) اور وہ دو شخص جو اللہ کے لیے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، وہ دونوں اس پر اکٹھے ہوتے ہیں اور جدا ہوتے ہیں (۵) اور وہ شخص جس نے تنہائی میں اللہ کو یاد کیا، پس اس کی دونوں آنکھیں بہہ پڑیں (۶) وہ شخص جس کو خاندانی خوبیوں والی خوبصورت عورت نے دعوتِ عیش دی، پس اس نے کہہ دیا: میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں (۷) اور وہ شخص جس نے کوئی خیرات کی، پس اس خیرات کو چھپایا، یہاں تک کہ اس

کے بائیں ہاتھ نے نہیں جانا کہ اس کے دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا۔

تشریح: وہ خوش نصیب بندے جن کو قیامت کے دن اللہ کا سایہ نصیب ہوگا، وہ سات میں منحصر نہیں ہیں، اس حدیث میں سات کا ذکر بطورِ مثال ہے، دیگر روایات میں ان کے علاوہ بندوں کا بھی ذکر آیا ہے، یہ بندے بڑے خوش نصیب ہیں میدانِ محشر میں جب لوگ انتہائی پریشان ہوں گے، یہ بندے اللہ کے سایہ میں آرام سے ہوں گے، ایک وہ عادل بادشاہ ہے جو اپنوں اور غیروں سب کے ساتھ انصاف کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رکھے، دوسرے وہ نوجوان جو عنفوانِ شباب ہی سے اللہ کے احکام کا پابند ہو اور شروع سے اللہ کی عبادت میں دلچسپی رکھتا ہو اور وہ شخص جو مسجد سے نکلنے کے بعد بھی نماز کے انتظار میں رہتا ہے اور اگلی نماز مسجد میں آکر ہی پڑھتا ہے، اور اللہ کے لیے دو محبت کرنے والے شخص ان کی محبت عارضی اور وقتی نہیں؛ بلکہ دائمی ہے جب ملتے ہیں تب بھی محبت پائی جاتی ہے اور جدا ہوتے ہیں، تب بھی محبت پائی جاتی ہے اور تنہائی میں اللہ کا ذکر کرتے ہوئے رونے والا شخص؛ کیونکہ یہ اخلاص کا پیکر محسوس ہے، مجمع میں تو دکھاوے کے آنسو بہت سوں کے نکل جاتے ہیں اور وہ شخص جو محض اللہ کی ڈر کی وجہ سے خاندان اور خوبصورتی والی عورت کی دعوت کو ٹھکرادے اور چھپا کر صدقہ کرنے والا اس حدیث میں اخفاء کے اعلیٰ درجہ کو بیان کیا گیا، تاہم بعض اوقات صدقہ برملا اور اعلانیہ طور پر کرنے کی بھی اجازت ہے (بعض لوگوں نے اس اخفاء کی تشریح یہ کی ہے کہ شمالِ ید سے مراد اس کے بائیں طرف لوگ ہیں یا پھر مراد یہ ہے کہ صدقہ کرتے ہی اسے نسیا منسیا کردے اسے یاد نہ کرے اور مدح وتعریف کی طلب نہ ہو)۔

تنبیہ: حافظ ابنِ حجرؒ فرماتے ہیں مذکورہ صفات اگر کسی عورت میں پائی جائیں تو اس کے لیے بھی یہی فضیلت ہے سوائے ایک صورت کے، وہ یہ ہے کہ وہ بادشاہ نہیں بن سکتی اور جہاں تک "قلبه معلق بالمسجد" کا تعلق ہے تو اس کی سب سے بہترین مسجد اس کے گھر کا اندرونی حصہ ہے۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِذَا أَحَبَّ اللهُ الْعَبْدَ قَالَ جِبْرِيْلُ يَا جِبْرِيْلُ قَدْ أَحْبَبْتُ فُلَانًا فَأَحِبَّهُ فَيُحِبُّهُ جِبْرِيْلُ ثُمَّ يُنَادِي فِيْ أَهْلِ السَّمَاءِ أَنَّ اللهَ قَدْ أَحَبَّ فُلَانًا فَأَحِبُّوْهُ فَيُحِبُّهُ أَهْلُ السَّمَاءِ ثُمَّ يَضَعُ لَهُ الْقُبُوْلَ فِي الْأَرْضِ وَإِذَا أَبْغَضَ اللهُ الْعَبْدَ.

قَالَ مَالِكٌ رحمه الله: لَا أَحْسِبُهُ إِلَّا أَنَّهُ قَالَ فِي الْبُغْضِ مِثْلَ ذٰلِكَ.

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت فرماتے ہیں تو جبرئیل علیہ السلام سے فرماتے ہیں: اے جبرئیل! میں فلاں بندے سے محبت کرتا ہوں تم بھی اس سے محبت کرو، پس جبرئیل علیہ السلام اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، پھر آسمان والوں میں آواز دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں بندے سے محبت رکھتے ہیں، تمام آسمان والے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، پھر روئے زمین پر اس کے لیے محبت رکھ دی جاتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کسی بندے سے نفرت فرماتے ہیں (تب بھی یہی معاملہ ہوتا ہے)۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ میرا خیال تو یہی ہے کہ بغض وعداوت کے بارے میں یہی طریقۂ عمل ہوتا ہے۔

تشریح: إذا أحب الله العبد: قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں: حبت کے معنیٰ میلانِ قلبی ہیں اور اس کی نسبت اللہ کی طرف محال ہے، لہٰذا یہاں محبت سے مراد بھلائی کا ارادہ کرنا ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ محبت کو اگر صفاتِ ذات سے مانیں تو اس سے مراد ارادۂ خیر ہے اور اگر صفاتِ افعال کی قبیل سے مانا جائے تو اکرام واحسان کیا جانا ہے۔

إني أحبت فلانًا: ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں یہاں اللہ نے اظہارِ محبت کو بغیر کسی سبب کے بیان کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے افعال معلل بالاغراض نہیں ہوتے؛ بلکہ اللہ کی محبت بندہ سے اشتغال بالعبادۃ اور عشقِ رسول کی بنا پر ہوتی ہے۔

فیحبه أهل السماء: اللہ تعالیٰ بندہ کے مزید اکرام کے لیے آسمانوں میں فرشتوں کو محبت کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ علامہ نوویؒ فرماتے ہیں: فرشتوں کے محبت کرنے کے دو معنیٰ ہو سکتے ہیں:

(۱) ان کا نیک بندہ کے لیے دعاءِ استغفار اور اس کی تعریف کرنا (۲) یا یہی معروف محبت جو لوگوں کے درمیان ہوتی ہے یعنی فرشتے اس سے ملنے کی خواہش رکھتے ہیں؛ کیونکہ وہ اللہ کا مطیع اور فرماں بردار ہے۔

ثم یوضع له القبول: یعنی پوری روئے زمین میں اس کی محبت رکھ دی جاتی ہے؛ چنانچہ تمام لوگ جانے اَنجانے کسی سبب اور غرض کے بغیر اس کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔

یہاں یہ اشکال نہیں ہونا چاہیے کہ بعض اللہ کے نیک اور محبوب بندے ہوتے ہیں؛ لیکن انہیں کوئی پہچانتا بھی نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث کا مقصد ہے کہ کبھی کبھی اللہ تعالیٰ جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ اس کی مقبولیت کا اعلان کراتے ہیں یعنی یہ معاملہ تمام لوگوں کے ساتھ نہیں ہے۔

نیز ملا علی قاریؒ نے فرمایا کہ اس سے وہی لوگ محبت کرتے ہیں جو اہلِ ایمان اور اہلِ محبت ہیں؛ ورنہ بعض دنیاداروں کو تو سوائے دنیا کے کسی سے رغبت نہیں ہوتی اور ایسے لوگوں کو شمار تو انسانوں کی فہرست سے چوپاؤں میں چلا جاتا ہے، لہٰذا ان کے محبت نہ کرنے کا کوئی اعتبار نہیں ہے اور علامہ باجیؒ نے فرمایا اہلِ ارض سے مراد شناسا لوگ ہیں۔

وإذا أبغض الله العبد: امام مالکؒ فرماتے ہیں: اس بارے میں میرا جہاں تک خیال ہے سہیل بن ابی صالح نے یہی طریقۂ کار بیان کیا تھا یعنی جب اللہ کسی بندے سے نفرت اور اس کے ساتھ شر اور گمراہی کا معاملہ فرمانا چاہتے ہیں تو جبرئیل علیہ السلام سے اسی طرح فرماتے ہیں (یہ بات امام مالکؒ کے نزدیک محقق نہیں ہے) لیکن بغض وعداوت کے بارے میں یہی معاملہ رہتا ہے، مسلم شریف میں اس کی صراحت ہے۔

"وَإِذَا أَبْغَضَ عَبْدًا دَعَا جِبْرِيلَ فَيَقُولُ إِنِّيْ أُبْغِضُ فُلَانًا فَأَبْغِضْهُ

فَيُبْغِضُهُ جِبْرِيلُ ثُمَّ يُنَادِي فِي أَهْلِ السَّمَاءِ إِنَّ اللهَ يُبْغِضُ فُلَانًا فَأَبْغِضُوهُ فَيُبْغِضُوْنَهُ ثُمَّ تُوضَعُ لَهُ الْبَغْضَاءُ فِي الأَرْضِ''. انتھیٰ

عَنْ أَبِيْ إِدْرِيْسَ الْخَوْلَانِيِّ أَنَّهُ قَالَ دَخَلْتُ مَسْجِدَ دِمَشْقَ فَإِذَا فَتًى شَابٌّ بَرَّاقُ الثَّنَايَا وَإِذَا النَّاسُ مَعَهُ إِذَا اخْتَلَفُوْا فِيْ شَيْءٍ أَسْنَدُوْا إِلَيْهِ وَصَدَرُوْا عَنْ قَوْلِهِ فَسَأَلْتُ عَنْهُ فَقِيْلَ لِيْ هٰذَا مُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ فَلَمَّا كَانَ الْغَدُ هَجَّرْتُ فَوَجَدْتُّهُ قَدْ سَبَقَنِيْ بِالتَّهْجِيْرِ وَ وَجَدْتُّهُ يُصَلِّيْ فَانْتَظَرْتُهُ حَتّٰى قَضٰى صَلٰوتَهُ ثُمَّ جِئْتُهُ مِنْ قِبَلِ وَجْهِهِ فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ ثُمَّ قُلْتُ وَاللهِ إِنِّيْ لَأُحِبُّكَ فِي اللهِ فَقَالَ آللهِ قَالَ فَقُلْتُ آللهِ فَقَالَ آللهِ فَقُلْتُ آللهِ فَقَالَ آللهِ فَقُلْتُ آللهِ قَالَ فَأَخَذَ بِحُبْوَةِ رِدَائِيْ فَجَبَذَنِيْ إِلَيْهِ وَقَالَ أَبْشِرْ فَإِنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ قَالَ اللهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى وَجَبَتْ مُحَبَّتِيْ لِلْمُتَحَابِّيْنَ فِيَّ وَالْمُتَجَالِسِيْنَ فِيَّ وَالْمُتَزَاوِرِيْنَ فِيَّ وَالْمُتَبَاذِلِيْنَ فِيَّ.

ترجمہ وتشریح: حضرت ابوادریس خولانی سے روایت ہے انہوں نے فرمایا: میں دمشق کی مسجد میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ ایک نوجوان شخص جس کے چمکدار دانت ہیں اور لوگوں کی ان کے پاس بھیڑ ہے اور جب لوگوں کا کسی مسئلہ میں اختلاف ہوجاتا ہے ان کے پاس جاتے ہیں اور ان کی بات سے (تشفی حاصل کر کے) آتے ہیں، میں نے لوگوں سے ان کے بارے میں دریافت کیا تو مجھے بتایا گیا کہ یہ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ صحابیٔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، پھر دوسرا دن ہوا میں دوپہر کے وقت ان کے پاس گیا تو میں نے پایا کہ وہ مجھ سے پہلے ہی ظہر کے لیے جاچکے ہیں اور میں نے ان کو نماز پڑھتے ہوئے پایا، میں ان کا انتظار کرتا رہا یہاں تک کہ انہوں نے نماز پوری کی، پھر میں ان کے سامنے سے ان کے پاس آیا اور سلام کیا اور میں نے کہا بخدا! میں آپ سے برضائے الٰہی محبت کرتا ہوں تو انہوں نے خدا کی قسم کہا واقعی تم محبت کرتے ہو؟ دومرتبہ اسی طرح قسم دلائی، پھر میری چادر کا کنارہ پکڑا اور مجھے اپنی طرف کھینچا، اور فرمایا

بشارت سنو! میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میری محبت واجب ہے ان لوگوں کے لیے جو میری وجہ سے محبت کرتا ہے اور میری رضا کی خاطر بیٹھنے والوں کے لیے اور میری خاطر زیارت کرنے والوں کے لیے اور میری خاطر خرچ کرنے والوں کے لیے (ضرورت وحاجت کے وقت)۔

لغات: براق الثنايا أي أبيض السن. هجرت تهجيراً: دوپہر کے وقت جانا۔
سبقني بالتهجير، التبكير إلى صلاة حبوة: چادر کا کنارہ۔
جَبذَنِيْ (ض) جبذًا جرًّ کھینچنا۔
المتجالِس تجالس تفعال: آپس میں مل کر بیٹھنا۔
المتزاودين تزاود تفاعل: ایک دوسرے کو توشہ دینا اور ایک قرأت متزاورين تزاوز سے ہے ایک دوسرے کی زیارت کرنا۔
المتباذلين تباذل: ایک دوسرے پر مال خرچ کرنا۔

عَن مَالِكٍ أَنَّهُ بَلَغَهُ عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَبَّاسٍ أَنَّهُ كَانَ يَقُوْلُ الْقَصْدُ وَالتُّؤَدَةُ وَحُسْنُ السَّمْتِ جُزْءٌ مِّنْ خَمْسَةٍ وَّعِشْرِيْنَ جُزْءًا مِّنَ النُّبُوَّةِ.

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں میانہ روی، سکون وسنجیدگی اور خوش اسلوبی نبوت کے اجزاء میں سے پچیسواں جز ہے۔

تشریح: القصد: یعنی افراط وتفریط سے بچتے ہوئے معاملات کے اندر اعتدال اور میانہ روی اختیار کرنا نہایت عمدہ صفت ہے، علامہ تورپشتی فرماتے ہیں: اعتدال واقتصاد کبھی تو محمود اور مذموم چیزوں کے درمیان ہوتا ہے جیسے ظلم وعدل، بخل وسخا اور یہی مراد ہے باری تعالیٰ کے قول ﴿وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ﴾ سے، اور کبھی میانہ روی صرف محمود اشیاء کے درمیان ہوتی ہے اور یہ ان چیزوں میں ہوتی ہے جن میں افراط وتفریط ممکن ہو، مثلاً جود وسخاوت میں میانہ روی ہے؛ کیونکہ یہ بخل اور اسراف کے درمیان ہے اور شجاعت تہور اور جبن کے درمیان ہے اور حدیث میں یہی مقصود ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مؤمن کو عبادات، معاملات، کھانے پینے، خرچ کرنے، غرض ہر چیز میں اقتصاد اور میانہ روی کا دامن مضبوطی سے پکڑے رہنا چاہیے، گویا یہ اچھی زندگی گزارنے کا ایک قیمتی نسخہ ہے۔

التودة بضم التاء وفتح الهمزة: دوسری عمدہ صفت جو ایک مؤمن میں ہونی چاہیے کہ وہ اپنے تمام دنیوی اُمور میں سکون، وقار اور سنجیدگی کو برقرار رکھے، کوئی بات کہے تو سوچ کر بولے اور کام شروع کرے تو اس کے انجام پر نظر ہو، حتیٰ کہ چلنے، اٹھنے بیٹھنے میں سنجیدگی کا مظاہرہ ہو؛ اس لیے کہ جلد بازی شیطانی صفات میں سے ہے۔

وحسن السمت: أي حسن الهيئة والمنظر: مطلب یہ ہے کہ مؤمن کی باطنی حالت کے ساتھ ظاہری حالت بھی خوش منظر اور عمدہ ہو اس کے لباس، بالوں اور گفتار، نیز اس کے ملنے جلنے کے طریقہ سے یہ ظاہر ہو کہ ایک مکمل ومہذب اور شائستہ نبی کا متبع اور پیروکار ہے۔

جزء من خمسة وعشرين جزءا من النبوة: علامہ باجی مالکیؒ اور علامہ خطابیؒ فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ مذکورہ صفات وہ صفات ہیں جن پر انبیاء کی طبیعت کو ڈھالا گیا تھا اور ان کے التزام کا ان کو حکم دیا گیا تھا اور جن کی تعلیم کے لیے وہ بھیجے گئے تھے، مطلب یہ نہیں کہ مذکورہ صفات کو اپنے اندر پیدا کر کے درجۂ نبوت پر پہنچ جائے گا۔

اور جن بعض روایات میں چوبیسواں اور پچھتّرواں جز ہونے کی بھی بات آئی ہے ان کا حل یہ ہے کہ ان صفات کی کمیت وکیفیت کے اعتبار سے اجزاءِ نبوت مختلف ہوجاتے ہیں۔ (مرقاۃ)

مَا جَاءَ فِي الرُّؤْيَا

(خوابوں کا بیان)

الرؤيا: رأه يري کا مصدر ہے، اس کے معنیٰ ہیں: آنکھ سے دیکھنا اور دل سے دیکھنا، پھر یہ اسم کے طور پر مستعمل ہے اور الف مقصورہ کی وجہ سے الدنیا کی طرح

غیر منصرف ہے، اوراس کی جمع دُنيّ کی طرح رؤي ہے، اُردو میں اس کا ترجمہ خواب ہے۔

جاننا چاہیے کہ انسان کے ذہن کے اندر خیالات بلاتوقف جاری رہتے ہیں، نیند میں بھی اور بیداری میں بھی۔

شاہ ولی اللہؒ نے ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں خیالات کے پانچ اسباب بیان کیے ہیں:

پہلا سبب: انسان کی جبلت وفطرت ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو ایک جبلت اور فطرت پر پیدا کیا ہے جو کبھی نہیں بدلتی؛ چنانچہ جیسی فطرت ہوگی ویسے خواب آئیں گے۔

دوسرا سبب: انسان کا مادی مزاج ہے جو کھانے پینے سے بنتا ہے، یہ مزاج لوگوں میں مختلف ہوتا ہے؛ چنانچہ جس طرح کی غذا ہوتی ہے حلال ہو یا حرام اسی اعتبار سے خیالات کا ظہور ہوتا ہے۔

تیسرا سبب: عادت ومالوف ہے، جس شخص کا جس چیز سے زیادہ تعلق ہوتا ہے اس چیز کا بار بار خیال آتا ہے۔

چوتھا سبب: اچھے بُرے اتفاقات ہیں یعنی ایک شخص کسی غلط ارادہ سے کسی دینی مجلس میں جائے؛ لیکن وہاں کوئی نیک بات سنی اور اس کا خیالِ بدل گیا اور اس غلط ارادہ کو ترک کردیا۔

پانچواں سبب: اچھی بُری تاثیر ہے، بعض لوگ شیاطین سے متاثر ہوتے ہیں خواہ وہ شیاطین الانس ہو یا جن جس کی وجہ سے بُرے خیالات آتے رہتے ہیں، اس کے برعکس کبھی کوئی انسان اچھے لوگوں سے متاثر ہوتا ہے تو اچھے خیالات آنے لگتے ہیں۔

اور خوابوں کا معاملہ بھی خیالات جیسا ہے یعنی جو خیالات کے اسباب ہیں وہی خوابوں کے اسباب ہیں، اچھے اسباب پیدا ہوتے تو اچھے خواب نظر آتے ہیں اور اگر بُرے خیالات پیدا ہوتے ہیں تو بُرے خواب نظر آتے ہیں؛ البتہ ان میں فرق یہ ہے کہ خیالات میں چیزیں متشکل نہیں ہوتیں، اور خواب میں جو خیالات دل میں گزرتے ہیں، وہ دل کی آنکھوں کے سامنے متشکل ہوتے ہیں۔

اور اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ بحالت بیداری جب آدمی کچھ خیال کرتا ہے تو دماغ اس کا استغراق نہیں کر پاتا؛ کیونکہ بیداری میں تمام اعضاء اپنے کام میں مشغول رہتے ہیں جس کی وجہ سے دماغ خیالات کی طرف پوری طرح سے متوجہ نہیں ہو پاتا؛ لیکن نیند میں دماغ یکسو ہوکر خیالات کا استغراق کرلیتا ہے جس کی وجہ سے اشیاء کی وہ شکلیں حس مشترک میں ظاہر ہوجاتی ہیں۔

حقیقتِ رؤیا کے متعلق اختلاف

(۱) رؤیا کو فلاسفہ اور متکلمین کی ایک جماعت تخیّلات پر محمول کرتی ہے، وہ کہتے ہیں کہ نیند آنے کے بعد جب حسِ مشترک قوتِ خیالیہ، قوتِ وہمیہ اور قوتِ حافظہ بے کار ہوجاتی ہے، تب قوتِ متصرفہ جوڑنے توڑنے، تحلیل وترکیب وغیرہ اُمور شروع کردیتی ہے؛ چنانچہ سر کو تن سے اور تن کو سر سے جدا کرکے دوسری چیزوں کے ساتھ ترکیب دے کر ایک عجیب وغریب صورت پیدا کرتی ہے اور اس کی حقیقت متحصلہ کچھ بھی نہیں ہے؛ بلکہ یہ اُمورِ انتزاعیہ میں سے ہیں۔

(۲) جمہور فقہاء ومحدثین اور صوفیاءِ کرام فرماتے ہیں کہ رؤیا کی حقیقت کبھی خیر کبھی شر، کبھی مبشرہ اور کبھی مندرہ ہوتی ہے۔

خواب اور تعبیر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "الرؤيا ثلاث فالرؤيا الصالحة بشرىٰ من الله، والرؤيا من تحزين الشيطان والرؤيا مما يحدث بها الرجل نفسه" خواب کی تین قسمیں ہیں: (۱) نیک خواب جو اللہ کی طرف سے خوشخبری ہوتا ہے (۲) وہ خواب جو شیطان کا پریشان کرنا ہے (۳) وہ خواب جس میں آدمی اپنے دل سے باتیں کرتا ہے، یعنی خیالات۔ (ترمذی: ج ر ۲، ص ر ۱۵، ابواب الرؤیا)

شاہ صاحب قدس سرہٗ نے ان تین قسموں کی پانچ قسمیں بنائی ہیں۔ رؤیا صالحہ کی دو قسمیں کی ہیں، بشریٰ من اللہ اور رؤیا ملکی، یعنی نیک آدمی کا خواب۔ اسی طرح خیالات کی

بھی دو قسمیں کی ہیں: ایک وہ خیالات جو عادت کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں، دوسرے وہ خیالات جو کسی خلط کی زیادتی اور جسمانی تکلیف کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں، غرض! اصل اقسام تین ہیں، ان کو پھیلا کر پانچ قسمیں کی ہیں۔

پھر تین خوابوں کی تفصیل کی ہے، بشارتی خواب، ملکوتی خواب اور شیطانی خواب کی حقیقت بیان کی ہے۔ اور شیطانی خواب کا اثر زائل کرنے کی تدبیر بتلائی ہے اور آخر میں یہ بیان کیا ہے کہ تعبیر صرف بشارتی اور ملکوتی خوابوں کی ہوتی ہے، خیالات والے خوابوں کی کچھ تعبیر نہیں ہوتی، یہ بحث کا خلاصہ ہے، اب تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔

خواب کی پانچ قسمیں ہیں

اوّل وہ خواب ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خوش خبری ہوتا ہے، حدیث میں ہے کہ نبوت میں سے صرف خوش کن باتیں باقی رہی ہیں، صحابہ رضی اللہ عنہم نے دریافت کیا خوش کن باتیں کیا ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نیک خواب اور ایک روایت میں یہ اضافہ ہے: ''جس کو کوئی مسلمان دیکھے، یا اس کے لیے دیکھا جائے''۔ (مشکوٰۃ، حدیث ۴۶۰۶) جیسے حضرت ام العلاء انصاریہ رضی اللہ عنہا نے خواب دیکھا کہ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کے لیے ایک چشمہ جاری ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ چشمہ ان کا عمل ہے، جو ان کے لیے بہہ رہا ہے! (مشکوٰۃ، حدیث: ۴۶۲۰) یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے بعد از وفات بشارت ہے اور جیسے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ورقہ بن نوفل کا حال دریافت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے ان کو خواب میں سفید کپڑوں میں دیکھا ہے، اگر وہ دوزخی ہوتے تو ان پر کوئی اور لباس ہوتا۔ (مشکوٰۃ، حدیث: ۴۶۲۳) یہ ورقہ کے لیے بشارت ہے، اس قسم کے خوابوں کی بس اتنی ہی تعبیر ہوتی ہے اور اس قسم کے خوابوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں پر حقائق ومعارف بھی واشگاف کرتے ہیں، جیسا کہ آگے آرہا ہے۔

دوم ملکوتی خواب: یعنی نیک آدمی کا خواب، یہ خواب آدمی کی خوبیوں اور خرابیوں کا نورانی تمثل (تصویر سامنے آنا) ہوتا ہے، اگر خوبی متمثل ہوتی ہے تو وہ محض بشارت ہوتی ہے، اور خرابی متمثل ہوتی ہے تو وہ تنبیہ ہوتی ہے، جو نتیجہ کے اعتبار سے بشارت ہے، اور وہ خوبیاں اور خرابیاں ملکی طریقہ پر نفس میں شامل ہونے والی ہوتی ہیں (ملائکہ طاعات بجالاتے ہیں، اور برائیوں سے ان کو مَس نہیں، پس جو شخص طاعات کا اہتمام کرتا ہے، اور برائیوں سے دُور رہتا ہے، اس کی خوبیاں اور خرابیاں نفس میں ملکی طریقہ پر شامل ہوتی ہیں، طاعات مثبت پہلو سے، اور سیئات منفی پہلو سے اور ایسا ہی شخص نیک آدمی ہوتا ہے)۔

سوم شیطان کا ڈراوا: اور اس کا پریشان کرنا، اس خواب کی تفصیل اور اس کا علاج آگے آرہا ہے۔

چہارم وہ خواب جو خیالات ہوتے ہیں: جو ایسی عادت کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں جس کا نفس بیداری میں خوگر ہو چکا ہوتا ہے، اور وہ عادت قوتِ خیالیہ میں محفوظ ہوتی ہے، اور جو چیز خیال میں ہوتی ہے وہ حس مشترک میں ظاہر ہوتی ہے، یعنی اس کے تصورات آتے ہیں، جیسے شراب کا چسکہ، خواب میں بھی اس کے خیالات آتے ہیں، اسی کو "بلی کے خواب میں چھیچھڑے" کہتے ہیں۔

پنجم وہ خواب جو خیالات ہوتے ہیں: اور وہ خیالات فطری طور پر کسی خلط کے غلبہ اور بدن میں اس کی تکلیف کے احساس کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں، جیسے بیمار آدمی خواب دیکھتا ہے کہ اس کے آپریشن کی تیاری ہورہی ہے، ان آخری دو خوابوں کی کوئی تعبیر نہیں ہوتی۔

بشارتی خواب کی حقیقت

بشارتی خواب کی حقیقت یہ ہے کہ کبھی نفسِ ناطقہ کو بدن کے حجابات سے فرصت مل جاتی ہے یعنی اضطراری موت سے پہلے ہی وہ اختیاری موت مرجاتا ہے، اور یہ بات ایسے

دقیق اسباب کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے جو کافی غور و خوض کے بعد سمجھے جا سکتے ہیں، پس نفس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے علمی کمال کے فیضان کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے؛ چنانچہ نفس کی استعداد کے مطابق اس پر فیضان کیا جاتا ہے، جس کا مادہ اس کے پاس مجتمع علوم ہوتے ہیں، مثلاً اسرارِ دین کا کافی علم ہوتا ہے، تو اس سلسلہ کا کوئی نکتہ بیداری یا خواب میں کھولا جاتا ہے اور وہ اس کے لیے عظیم بشارت ہوتا ہے، منقول ہے کہ رات میں جب کوئی اہم مسئلہ حل ہو جاتا تھا تو امام محمدؒ فرماتے شاہزادوں کو امین اور مامون کو یہ دولت کہاں نصیب اور اس قسم کے خوابوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو تعلیم دیتے ہیں۔ مثلاً:

(۱) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں اللہ تعالیٰ کو بہترین صورت میں دیکھا، اللہ تعالیٰ نے پوچھا فرشتے کس امر میں بحث کر رہے ہیں؟ الیٰ آخرہ۔ اس حدیث میں درجات اور کفارات کا بیان ہے یعنی کن اعمال سے مرتبے بلند ہوتے ہیں، اور کن اعمال سے گناہ معاف ہوتے ہیں، یہ حدیث تفصیل سے ترمذی (ج / ۲، ص / ۱۵۵) میں سورۃ ص کی تفسیر میں ہے (۲) حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک طویل خواب مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دو شخص لے چلے اور مختلف مناظر دکھائے، مثلاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے شخص کے پاس سے گزرے جو بیٹھا ہوا تھا اور دوسرا کھڑا ہوا تھا، جس کے ہاتھ میں آنکڑا تھا، جس کو وہ بیٹھے ہوئے کی باچھ میں داخل کرتا تھا اور اس کو گدی تک چیر دیتا تھا الیٰ آخرہ، اس منامی معراج میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مردوں کے احوال سے واقف کیا گیا ہے، یہ حدیث تفصیل سے مشکوٰۃ (حدیث: ۴۶۲۱ و ۴۶۲۵) میں ہے

(۳) متعدد خوابوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو آئندہ پیش آنے والے واقعات سے واقف کیا ہے۔ مثلاً حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے شادی کا معاملہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دکھلایا گیا تھا (بخاری، حدیث: ۷۰۱۲) جنگِ اُحد میں پہلے شکست پھر کامیابی خواب میں دکھائی گئی تھی، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کا مقام خواب میں دکھلایا گیا تھا۔

ملکوتی خواب کی حقیقت

ملکی خواب کی حقیقت یہ ہے کہ انسان میں اچھے بُرے دونوں طرح کے ملکات (صلاحیتیں) ہوتے ہیں؛ مگر ملکات کی خوبی خرابی آدمی اسی وقت جان سکتا ہے جب وہ ملکی صورت کے لیے فارغ ہوجائے، یعنی بہیمیت کی صفت مرجائے، اور ملکیت کا راج قائم ہوجائے، پس جب آدمی ملکیت کے لیے فارغ ہوجاتا ہے، تو اس کی نیکیاں اور بُرائیاں مثالی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں، جیسے حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما نے خواب دیکھا کہ دو فرشتے ان کو پکڑ کر آگ پر لے گئے، انھوں نے کہا پناہ بخدا! پھر ایک اور فرشتہ آیا، اس نے کہا گھبراؤ نہیں! ابنِ عمر رضی اللہ عنہما نے یہ خواب اپنی بہن اُمّ المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے بیان کیا، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "نعم الرجل عبد الله لو كان يصلي من الليل" عبداللہ رضی اللہ عنہ بہت اچھا آدمی ہے، کاش! وہ تہجد پڑھتا! (بخاری، حدیث: ۱۱۲۱ و ۱۱۲۲) اس خواب میں حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما کی خوبی اور کمی دونوں مثالی صورت میں ظاہر ہوئی ہیں، پس اس شان کا آدمی (الف) خواب میں اللہ تعالیٰ کی زیارت کرتا ہے، اور اس کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری ہوتی ہے، یعنی جو شخص کامل فرماں بردار ہوتا ہے اس کو یہ سعادت نصیب ہوتی ہے۔

(ب) اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھتا ہے، اور اس کی بنیاد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی فرماں برداری یعنی محبت ہوتی ہے جو اس کے سینہ میں مرکوز ہوتی ہے۔

(ج) اور انوار و تجلیات کو خواب میں دیکھتا ہے، اور اس کی بنیاد وہ طاعتیں ہوتی ہیں جو دل اور اعضاء سے کی جاتی ہیں، وہ طاعتیں انوار و طیبات کی صورت میں جیسے شہد، گھی اور دودھ کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں۔

پس جس نے اللہ تعالیٰ کو یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یا فرشتوں کو بُری صورت میں یا غصہ کی حالت میں خواب میں دیکھا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے عقیدہ میں خلل یا کمزوری

ہے اور اس طرف اشارہ ہے کہ اس کا نفس کامل نہیں ہوا، اسی طرح جو انوار طہارت کی وجہ سے حاصل ہوتے ہیں وہ سورج اور چاند کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔

واضح رہے در حقیقت انہیں دونوں خوابوں (بشارتی اور ملکوتی) کی تعبیر ہوتی ہے۔

شیطان کا ڈراوا اور اس کا علاج

خواب میں شیطان کے پریشان کرنے کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ملعون جانور جیسے بندر، ہاتھی، کتے اور سیاہ فام انسان نظر آتے ہیں، جن سے آدمی ڈر جاتا ہے، اور دل میں وحشت اور خوف پیدا ہوتا ہے، اگر ایسی صورت پیش آئے تو اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرے، اعوذ باللہ کہہ لے اور اپنی بائیں دائیں جانب تین بات تھتکار دے، اور کروٹ بدل کر سوجائے۔ (مشکوٰۃ، حدیث: ۴۶۱۳)

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الرُّؤْيَا الْحَسَنَةُ مِنَ الرَّجُلِ الصَّالِحِ جُزْءٌ مِّنْ سِتَّةٍ وَّ أَرْبَعِيْنَ جُزْءًا مِّنَ النُّبُوَّةِ.

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مؤمن آدمی کا اچھا خواب نبوت کے چھیالیس اجزاء میں سے ایک جز ہے۔

تشریح: اس حدیث کا شانِ ورود آئندہ حدیثوں میں آرہا ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے فرمایا کہ رسالت اور نبوت منقطع ہوگئی، اب نہ کوئی نیا رسول آئے گا اور نہ نیا نبی آئے گا، تو صحابہ رضی اللہ عنہم کو تشویش ہوئی، نبوت کے ذریعہ لوگوں کو خیر کی باتیں معلوم ہوتی ہیں، اب لوگ اس سے محروم ہوجائیں گے، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا؛ مگر خوش کن باتیں ابھی باقی ہیں، ان کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا اور اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ امت کو خیر کی باتیں بتلائیں گے صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: خوش کن باتیں کیا ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مسلمان بندہ کا خواب جو کمالاتِ نبوت کا ایک جز ہے، پھر صحابہ رضی اللہ عنہم کو اطمینان ہوگیا۔

جزءِ نبوت ہونے کے معنیٰ

یہاں ایک اشکال ہوتا ہے کہ خواب جزءِ نبوت کیسے ہوسکتا ہے جبکہ نبوت ختم ہوچکی ہے؟ اس کے مختلف جوابات دیئے گئے ہیں۔

(۱) خواب سے مراد خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا خواب ہے اور یہ حقیقتاً اجزاءِ نبوت میں سے ہے؛ لیکن یہ جواب مخدوش ہے۔

(۲) مراد یہ ہے کہ رویاءِ صالحہ علومِ نبوت کا جز ہے اور علومِ نبوت باقی ہیں، اگر چہ نبوت باقی نہیں ہے۔

(۳) نبوتِ انباء سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ ہیں اعلام، خبر دینا اب مطلب یہ ہوگا کہ رؤیا اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر صادق ہے جیسا کہ نبوت کے معنیٰ ہیں اللہ کی طرف سے سچی خبر، پس رؤیاءِ صادقہ خبر میں نبوت کے مشابہ ہوا۔

(۴) نبوت معانی کثیرہ کو متضمن ہے، ان میں سے ایک اخبار بالغیب مستقبل اور ماضی کی خبر ہے جو بطریقِ علم جزئی اللہ تعالیٰ طرف سے حاصل ہوتا ہے، مومن کا رؤیاءِ صادقہ کبھی اس جز کا متضمن ہوتا ہے، رؤیائے صالحہ میں فی الجملہ غیب کی آگاہی ہوتی ہے، پس اس اعتبار سے رؤیا کو جزءِ نبوت کہہ دیا گیا۔

اس کے بعد جاننا چاہیے کہ حدیثوں میں پندرہ اعداد آئے ہیں یعنی سچا خواب نبوت کا کونسا جز ہے؟ حافظ ابنِ حجرؒ نے ان کو جمع کیا ہے، اس سلسلہ میں کم از کم ۲۴ر اور زیادہ سے زیادہ ۷۶ر کا عدد آیا ہے، اور ان اعداد میں مشہور روایت چھیالیس کی ہے جیسا کہ حدیث باب میں ہے، اس اختلافِ عدد کی توجیہ حضرت گنگوہیؒ نے یہ کی ہے کہ خواب دیکھنے والوں کے صلاح وتقویٰ کے اختلاف سے نسبتیں مختلف ہوتی ہیں، جو شخص جس قدر متقی ہوگا اس کا خواب اسی قدر اہم ہوگا اور عدد چھوٹا ہوگا، مثلاً حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا خواب سب سے اہم اور چھوٹے عدد والا ہوگا، اور دوسرے صلحاء کے اس سے کم درجے کے

ہوں گے، اور حدیث میں ۴۶/کا عدد عام صالحین کے خوابوں کے بہ نسبت ہے، اسی کو علامہ طبری نے اختیار کیا ہے۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ إِذِ انْصَرَفَ مِنْ صَلوٰةِ الْغَدَاةِ يَقُوْلُ هَلْ رَأٰى أَحَدٌ مِّنْكُمُ اللَّيْلَةَ رُؤْيَاهُ وَيَقُوْلُ لَيْسَ يَبْقٰى بَعْدِيْ مِنَ النُّبُوَّةِ إِلَّا رُؤْيَا الصَّالِحَةُ.

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب فجر کی نماز سے فارغ ہوتے تو فرماتے کیا تم سے کسی نے رات میں خواب دیکھا ہے اور فرماتے تھے کہ نبوت کے اجزاء میں سے میرے جانے کے بعد صرف اچھے خواب باقی رہ جائیں گے۔

تشریح: علامہ باجیؒ فرماتے ہیں کہ آپ کا یہ سوال اس لیے تھا؛ تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اور مؤمنین کے خواب میں مبشرات کو معلوم کریں؛ کیونکہ بسا اوقات ایسے خوابوں سے کسی وحی پر بھی واقفیت ہو جاتی تھی جیسے کہ اذان کا ثبوت عبد اللہ ابنِ زید ابنِ عبد ربہ کے خواب سے ہوا ہے۔

عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَنْ يَّبْقٰى بَعْدِيْ مِنَ النُّبُوَّةِ إِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ فَقَالُوْا وَمَا الْمُبَشِّرَاتُ يَا رَسُوْلَ اللهِ قَالَ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ يَرَاهَا الرَّجُلُ الصَّالِحُ أَوْ تُرٰى لَهُ جُزْءٌ مِّنْ سِتَّةٍ وَّأَرْبَعِيْنَ جُزْءًا مِّنَ النُّبُوَّةِ.

(ترجمہ وتشریح واضح ہے)

عَنْ أَبِيْ قَتَادَةَ بْنِ رِبْعِيٍّ يَّقُوْلُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ مِنَ اللهِ وَالْحُلْمُ مِنَ الشَّيْطَانِ فَإِذَا رَأٰى أَحَدُكُمُ الشَّيْءَ يَكْرَهُهُ فَلْيَنْفُثْ عَنْ يَّسَارِهِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ وَلْيَتَعَوَّذْ بِاللهِ مِنْ شَرِّهَا فَإِنَّهُ لَنْ يَّضُرَّهُ إِنْ شَاءَ اللهُ قَالَ أَبُوْ سَلَمَةَ إِنْ كُنْتُ لَأَرٰى الرُّؤْيَا هِيَ أَثْقَلُ عَلَيَّ مِنَ الْجَبَلِ فَلَمَّا سَمِعْتُ هٰذَا الْحَدِيْثَ فَمَا كُنْتُ أُبَالِيْهَا.

ترجمہ: حضرت ابوقتادہؓ کہتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا اچھے خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے (بشارت، تحذیر یا انذار) ہوتے ہیں، اور بُرے خیالات والے خواب شیاطین کی طرف سے ہوتے ہیں، پس جب تم میں سے کوئی ناپسندیدہ چیز دیکھے اور اس وقت اس کی آنکھ کھل جائے تو اپنے بائیں جانب تین مرتبہ تھتکارے اور اس کے شر سے اللہ کی پناہ چاہے، اللہ نے چاہا تو وہ کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔

ابوسلمہ (جو اس حدیث کے ایک راوی ہیں) کہتے ہیں: اگر میں اس طرح کے خواب دیکھ لیتا تھا تو مجھ پر پہاڑ سے زیادہ گراں گزرتا تھا؛ لیکن جب سے میں نے یہ حدیث سنی ہے مجھے کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔

تشریح: والحلم من الشطان: ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں خواب کے اندر جو فاسد خیالات اور امرِ قبیح دکھائی دیتے ہیں ان کو "حلم" کہتے ہیں، ایسے خواب شیاطین کے اثر ہوتے ہیں، شیطان ڈراؤنی شکل میں نظر آجاتا ہے تو انسان ڈر جاتا ہے، یہ خواب بے حقیقت اور ناقابلِ تعبیر ہوتے ہیں۔

تنبیہ: رؤیاءِ صالحہ کی نسبت اللہ کی طرف، اور بُرے خواب کی نسبت شیطان کی طرف کی گئی ہے؛ حالانکہ خیر وشر دونوں من جانب اللہ ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کی ذات پاک اور مقدس ہے، اسی لیے خیر کی اضافت کردی گئی اور شیطان کا مشغلہ کذب وتہویل اور مکاری ہے؛ اس لیے شر کی اضافت اس کی طرف کی گئی۔

فإذا رأى أحدكم: جب کوئی اچھا خواب دیکھے، تو اس کا تذکرہ کسی حبیب سے کرے یا کسی عقلمند سے کرے اور اللہ کا شکریہ ادا کرے۔

اور جب بُرا دیکھتے اور خوف سے آنکھ کھل جاتے تو شر سے اللہ کی پناہ مانگے اور اپنے بائیں طرف ہلکا ہلکا تھوکے اور دعا پڑھ لے جو گزشتہ ابواب میں گزری ہے۔

عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ أَبِيْهِ أَنَّهُ كَانَ يَقُوْلُ فِيْ هٰذِهِ الْآيَةِ ﴿لَهُمُ الْبُشْرىٰ فِيْ

الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ﴾ قَالَ هِيَ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ يَرَاهَا الرَّجُلُ أَوْ تُرىٰ لَهُ.

ترجمہ: حضرت ہشام اپنے والد عروہ سے بیان کرتے ہیں کہ آیت ﴿لَهُمُ الْبُشْرىٰ الْاٰية﴾ کی تفسیر وہ اچھے خواب ہیں جن کو کوئی نیک شخص بطورِ بشارت کے دیکھتا ہے اور اس کے بارے میں کسی دوسرے کو دکھائے جاتے ہیں۔

تشریح: مذکورہ آیت کے بارے میں امام رازیؒ لکھتے ہیں کہ اچھے خوابوں میں دی جانی ہے، بشارتوں کا تعلق اولیاء اللہ سے ہے، یعنی وہ مخصوص بندے جن کے ذہن ودماغ ہمیشہ یادِ الٰہی سے تروتازہ رہتے ہیں اور اکثر اوقات مخلوقاتِ ربانی میں تفکر کرتے رہتے ہیں، جس کے نتیجہ میں ان کے شب وروز جاگنا سونا ایمانی قوت سے سرشار ہوتا ہے اوران کے خواب میں اچھی اچھی چیزیں دنیا ہی میں دکھائی دی جاتی ہیں، اور آخرت میں تو ایسے نیکوکاروں کے لیے انعام واکرام کا خوب سامان ہے۔

مَا جَاءَ فِي النَّرْدِ

نرد نون کے فتحہ اور راء کے سکون کے ساتھ ایک کھیل ہے، دراصل یہ ایک عجمی بادشاہ کا نام ہے، اوراس کے نام پر اس کھیل کا نام اس لیے رکھا گیا ہے؛ کیونکہ اس نے اس کھیل کو ایجاد کیا تھا۔

نیل الاوطار میں علامہ شوکانیؒ نے فرمایا ہے: نردشیر کھیلنا تمام علماء کے نزدیک ناجائز ہے، حدیثِ باب میں ہے اللہ کے رسول نے فرمایا جس نے نردشیر کو کھیلا اس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی، اسی پر قیاس کرتے ہوئے علماء نے شطرنج کو ناجائز کہا ہے، درمختار میں ہے وکرہ تحریمًا اللعب بالنرد وکذا الشطرنج.

البتہ امام شافعیؒ اور امام ابویوسفؒ نے ایک روایت کے مطابق شطرنج کو مباح قرار دیا ہے؛ لیکن یہ اس وقت ہے جب بطور جوا اور ہمیشہ نہ کھیلا جائے اور اُمورِ واجبہ میں مخل نہ ہو اور اگر ایسی صورت پائی جائے تو بالاجماع حرام ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: امام شافعیؒ کے نزدیک شطرنج اگرچہ جائز ہے؛ لیکن مکروہ ہے؛ البتہ اس کی کراہت نردشیر کی کراہت سے ہلکی ہے۔

شریعت میں کھیل کا حکم:

جاننا چاہیے شریعتِ مصطفویہؐ انسان کی فطری تفریح اور آسودگیٔ قلب سے منع نہیں کرتی، اور شریعت میں رہبانیت اور تبتل کا کوئی مقام نہیں ہے؛ بلکہ شریعت مدنیت اور ایک صالح معاشرہ چاہتی ہے، تاہم شریعت ایسے ارتفاقات اور ایسی مشغولی کو روکتی ہے جو اُمورِ دینیہ کی ادائیگی میں مخل ہوں۔

یہ بات مسلم ہے کہ انسانی فطرت وطبیعت چستی بدن اور تفریح قلب کا سامان چاہتی ہے، اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "رَوِّحوا القلوب ساعة فساعة"، اسی لیے آپ کے اقوال وافعال میں کبھی مزاح پایا جاتا تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ تفریح قلب وبدن کے لیے اسباب اختیار کرنا شریعت کے منافی نہیں، ہاں! ان میں حد درجہ مشغولی سے شریعت روکتی ہے، یہی راز ہے بعض اوقات کچھ کھیلوں کے مباح ہونے کا اور بعض کے ناجائز ہونے کا۔

لہٰذا وہ کھیل جن سے دنیا اور آخرت کا کوئی نفع وابستہ نہ ہو ایسے کھیل حرام یا مکروہِ تحریمی ہوں گے، یہ بات فقہاء کے نزدیک متفق علیہ ہے اور وہ کھیل جن میں بظاہر کوئی دنیاوی یا دینی نفع ہو؛ لیکن ان کی ممانعت کے لیے نہی وارد ہوئی ہے، وہ بھی حرام کہلائیں گے؛ کیونکہ ان میں بظاہر جو مصلحت نظر آرہی ہے وہ نص کے مقابل میں لغو شمار کی جائے گی، یہ مسئلہ بھی علماء کے درمیان متفق علیہ ہے اور وہ کھیل جن کے بارے میں کوئی نہی وارد نہیں ہوئی ہے؛ لیکن ان میں مصلحتِ دینی یا دنیوی ہے تو اس بارے میں فقہاء کے دو نظریہ ہیں:

(۱) اگر تجربہ سے یہ بات ثابت ہوجائے کہ ان کا ضرر نفع سے زیادہ بڑھا ہوا ہے اور

اس کے مفاسد مصلحت کے مقابلہ میں اغلب ہیں تو وہ کھیل ناجائز ہوگا، علتِ نہی کے پائے جانے کی وجہ سے۔

(۲) جن کھیلوں کا حال ایسا نہ ہو؛ لیکن ان کے شغل سے واجبات میں تغافل آجائے تو مکروہ ہیں اور اگر ان میں شغل حصول منفعت اور فائدہ کی نیت سے ہو تو وہ مباح ہیں۔

اسی لیے حدیث شریف میں گھڑسواری، تیراندازی، تیراکی جیسے کھیلوں میں لگنے کی اجازت دی ہے؛ کیونکہ ان کے مصالح اور منفعت اور ان کے مقصد کے بلند ہونے کی وجہ سے یہ کھیلوں کی فہرست سے ہی نکل گئے ہیں۔

عَنْ سَعِيْدِ بْنِ أَبِيْ هِنْدٍ عَنْ أَبِيْ مُوْسَى الْأَشْعَرِيِّ رَضِيَ اللهُ تَعَالىٰ عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ لَعِبَ بِالنَّرْدِ فَقَدْ عَصَى اللهَ وَرَسُوْلَهُ.

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو نردشیر سے کھیلا اس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی۔

عَنْ عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ بَلَغَهَا أَنَّ أَهْلَ بَيْتٍ فِيْ دَارِهَا كَانُوْا سُكَّانًا فِيْهَا وَعِنْدَهُمْ نَرْدٌ فَأَرْسَلَتْ إِلَيْهِمْ لَئِنْ لَمْ تُخْرِجُوْهَا لَأُخْرِجَنَّكُمْ مِنْ دَارِيْ وَانْكَرَتْ ذٰلِكَ عَلَيْهِمْ.

ترجمہ: اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ خبر پہنچی کہ ان کے کاشنۂ رحمت میں رہائش پذیر لوگوں کے پاس شطرنج وغیرہ ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کو پیغام بھیجا کہ اگر تم اس کو نہیں نکالو گے تو میں تمہیں اپنے گھر سے نکال دوں گی اور آپ رضی اللہ عنہ نے ان پر نکیر فرمائی۔

عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ أَنَّهُ كَانَ إِذَا وَجَدَ أَحَدًا مِنْ أَهْلِهِ يَلْعَبُ بِالنَّرْدِ ضَرَبَهُ وَكَسَرَهَا.

قَالَ يَحْيَى وَسَمِعْتُ مَالِكًا يَقُوْلُ لَا خَيْرَ فِي الشَّطْرَنْجِ وَكَرِهَهَا وَسَمِعْتُهُ

يَكْرَهُ اللَّعِبَ بِهَا وَبِغَيْرِهَا مِنَ الْبَاطِلِ وَيَتْلُوْا هٰذِهِ الْاٰيَةَ ﴿فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ﴾.

ترجمہ: نافع سے روایت ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب اپنے گھر والوں میں سے کسی کو چوسر کھیلتا دیکھتے تو اس کی پٹائی کرتے اور اس کی گوٹیوں کو توڑ دیتے۔

یحییٰ کہتے ہیں: میں نے امام مالکؒ کو فرماتے ہوئے سنا: شطرنج میں کوئی بھلائی و نفع نہیں ہے اور وہ اسے ناپسند فرماتے تھے، نیز شطرنج اور بقیہ لغو چیزوں سے کھیلنے کو ناپسند فرماتے تھے اور یہ آیت تلاوت فرماتے تھے: ﴿فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ﴾.

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہدایت سے نوازا ہے تو ایسی لغویات اور فضولیات میں نہ پڑے جو راہِ ہدایت سے دُور کر دیں؛ اس لیے جب انسان ہدایت سے دُور ہو جاتا ہے تو پھر ضلال و گمراہی میں آ پڑتا ہے اور ضلال و گمراہی جہنم کا راستہ دکھلاتی ہے۔

اَلْعَمَلُ فِي السَّلَامِ

(سلام کا طریقہ)

انسان مدنی الطبع ہے، شب و روز ہر انسان دوسرے سے رفاقت اختیار کرتا ہے اور ایک کا دوسرے سے واسطہ پڑتا ہے، اس میل جول اور آپسی تعلقات کو سودمند اس وقت بنایا جا سکتا ہے جب آپس میں خوشی کا اظہار کریں، ایک دوسرے پر لطف مہربانی کریں، چھوٹے بڑوں کے مراتب پہچانیں، بڑے چھوٹوں سے شفقت و محبت سے پیش آئیں۔

پھر اس جذبہ خیر سگالی و خیر اندیشی کے اظہار کے لیے اور مخاطب کو مانوس و مسرور کرنے کے لیے کسی خاص لفظ کی تعیین ضروری ہے؛ ورنہ جذبہ تو ایک مخفی شئ ہے جس کی پہچان قرائن سے ہی ہو سکتی ہے۔

چنانچہ دنیا کی تمام متمدن اقوام نے اپنی صوابدید کے مطابق تحیہ کا طریقہ متعین کیا

ہے جو بعد میں ان کی ملت کا شعار بن گیا اور اہلِ ملت کی اسی سے شناخت ہونے لگی، مثلاً زمانۂ جاہلیت میں عرب بوقتِ ملاقات کہتے تھے: "أنعم الله بك عينًا" اللہ آپ کی آنکھیں ٹھنڈی کرے۔ (ابوداؤد، حدیث: ۵۲۲۷)

اور قانونِ اسلام کا تقاضہ یہ تھا کہ اس سلسلہ میں انبیاء اور فرشتوں کی سنت کو اپنایا جائے، اور کسی ایسے کلمہ کی تعیین کی جائے جو ذکر اور کوئی جامع دعا ہو، کوئی ایسا طریق نہ ہو جو تعظیم میں اس قدر مبالغہ پیدا کر دے جس کی حدود شرک سے مل جائیں، مثلاً سجدہ کرنا یا زمین چومنا، لہٰذا جامع مانع تحیہ سلام ہی کو قرار دیا گیا۔ (رحمۃ اللہ الواسعہ)

ذیل کی احادیث میں اسی کے آداب کا بیان ہے۔

عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يُسَلِّمُ الرَّاكِبُ عَلَى الْمَاشِيْ وَإِذَا سَلَّمَ مِنَ الْقَوْمِ وَاحِدٌ أَجْزَاءَ عَنْهُمْ.

ترجمہ: زید ابن اسلم سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سوار پیدل چلنے والے کو سلام کرے اور جب قوم میں سے ایک شخص سلام کرے تو سب کی طرف سے کافی ہو جاتا ہے۔

تشریح: حدیث شریف میں سلام کے متعلق دو ادب بیان کیے گئے ہیں:

اوّل یہ کہ جب کوئی شخص سواری پر سوار ہو کر گزرے اور راستہ میں کوئی پیدل چلنے والا مل جائے تو سوار شخص پیدل چلنے والے کو سلام کرے، محدثین نے اس کی متعدد وجوہات بیان کی ہیں: ابنِ بطالؒ فرماتے ہیں سوار شخص کے دل میں اپنی سواری کی وجہ سے کبر کا شائبہ ہو سکتا ہے، لہٰذا اس کی طرف سے سلام کرنے کا حکم دیا؛ تاکہ تواضع پیدا ہو جائے، امام مازریؒ نے فرمایا کہ: راکب کو ماشی پر ایک گونہ خصوصیت ہوتی ہے؛ اس لیے سلام میں پہل کرنے کا حکم دیا؛ تاکہ بڑائی سے محفوظ رہے، علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں سلام کو ازالۂ خوف اور اکتسابِ محبت کے لیے وضع کیا گیا ہے اور ماشی کو سوار سے بوقتِ ملاقات اندیشہ ہو سکتا ہے؛ اس لیے سلام کی ابتدا کا حکم ہوا، اسی کو امام رازی نے بیان کیا ہے۔ (شرح زرقانی: ۴)

دوسرا ادب یہ ہے کہ اگر بشکل جماعت لوگ کہیں سے گزریں یا کسی مجلس میں جائیں تو ان میں سے ایک شخص کا ہی سلام کر لینا سب کی طرف سے کافی ہوجائے گا، اسی طرح جماعت میں سے اگر ایک شخص جواب دے دے تو جمیع کی جانب سے سلام کا جواب ہوجائے گا۔

تحقیق: دوسرے مسئلہ کی بنیاد اِس بات پر ہے کہ امام نوویؒ فرماتے ہیں ابتداء بالسلام سنت ہے اور جواب واجب ہے اور اگر سلام کرنے والے پوری جماعت ہوں تو سلام سنت کفایہ ہوجاتا ہے، فردِ واحد کے سلام کرنے سے سنت کی ادائیگی ہوجائے گی، اسی طرح اگر جواب دینے والا ایک ہی شخص ہو تو اسی پر جواب دینا واجب ہے اور اگر جماعت ہے تو واجب کفایہ ہے ایک شخص کے جواب سے سقوطِ واجب ہوجائے گا؛ البتہ بہتر یہ ہے کہ پوری جماعت سلام کرے، علامہ ابنِ عبدالبرؒ نے ابتداء بالسلام کی سنیت اور جواب کے وجوب پر اجماع نقل کیا ہے، علامہ قسطلانیؒ اور حافظؒ نے بھی ردِ سلام کے واجب کفایہ ہونے پر اجماع نقل کیا ہے۔

لیکن امام ابو یوسفؒ کے نزدیک ایک شخص کا جواب بقیہ کی طرف سے کفایت نہیں کرے گا؛ بلکہ ہر فرد پر مستقلاً جواب ضروری ہے۔ امام ابو یوسفؒ کی دلیل قرآن کی آیت ﴿فَحَيُّوْا بِأَحْسَنَ مِنْهَا﴾ اور بخاری کی وہ حدیث ہے جس میں ہے: جب آدم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے فرشتوں کو سلام کیا تو تمام فرشتوں نے جواب دیا؛ کیونکہ حدیث میں ”فقالوا أي الملائكة“ ہے یعنی دونوں جگہ جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔

لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے مجیب کچھ ہوں اور نسبت تمام فرشتوں کی جانب کردی گئی ہے۔

اور جمہور کی دلیل واجب علی الکفایہ ہونے پر حدیثِ باب ہے۔

اور ابوداؤد شریف کی ایک روایت ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ”يجزئ عن الجماعة إذا مروا أن يسلم أحدهم ويجزئ عن الجلوس أن يرد أحدهم“.

اور یہی امام ابو یوسفؒ کی دلیل کا جواب ہے۔

اور امام جصاصؒ نے فرمایا: کہ ہمارے مشائخ نے سلام کے جواب کو فرضِ کفایہ قرار دیا ہے، لہٰذا جماعت میں سے ایک کا جواب تمام کی طرف سے کافی ہے۔

عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَمْرِو بْنِ عَطَاءٍ أَنَّهُ قَالَ كُنْتُ جَالِسًا عِنْدَ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ فَدَخَلَ عَلَيْهِ رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ الْيَمَنِ فَقَالَ السَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ ثُمَّ زَادَ شَيْئًا مَعَ ذٰلِكَ أَيْضًا قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ (وَهُوَ يَوْمَئِذٍ قَدْ ذَهَبَ بَصَرُهُ) مَنْ هٰذَا قَالُوْا هٰذَا الْيَمَانِيُّ الَّذِيْ يَغْشَاكَ فَعَرَّفُوْهُ إِيَّاهُ قَالَ فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا إِنَّ السَّلَامَ انْتَهٰى إِلَى الْبَرَكَةِ.

ترجمہ: محمد بن عمرو سے روایت ہے انہوں نے فرمایا: میں عبداللہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کے پاس بیٹھا ہوا تھا، اسی دوران ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کی خدمت میں ایک یمنی شخص حاضر ہوا اور اس نے السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ کہا اور اسی کے ساتھ کسی اور چیز کا بھی اضافہ کر دیا، حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے معلوم کیا یہ کون ہے؟ (کیونکہ ان دنوں آپ کی بینائی جا چکی تھی) حاضرینِ مجلس نے کہا: یہ وہ یمنی شخص ہے جو آپ کے پاس حاضر ہوتا رہتا ہے، پھر لوگوں نے ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کے سامنے اس شخص کا مکمل تعارف کرایا، محمد بن عمرو کہتے ہیں ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: سلام لفظِ برکت پر ختم ہو جاتا ہے۔

تشریح: اس حدیث میں الفاظ سلام کے حدود بتائے گئے ہیں؛ چنانچہ علامہ باجیؒ فرماتے ہیں: حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کا مقصد یہ ہے کہ سلام ''وبرکاتہٗ'' پر ختم ہو گیا، اس پر کسی اور کلمہ کا اضافہ نہ کیا جائے، اور اس کے تین اجزاء ہیں، لہٰذا اگر ان میں سے بعض اجزاء پر اکتفاء کر لیا جائے تب بھی کافی ہے، اور اگر کوئی شخص تینوں کو ادا کرے تو اس نے حدود کا استیعاب کر لیا، اب مزید کسی کلمہ کی اجازت نہ ہوگی۔

قاضی ابو محمدؒ فرماتے ہیں: سلام کی انتہا وبرکاتہٗ پر ہو جاتی ہے، اب اس پر اضافہ نہیں کیا جائے گا، اور اس سے مراد اس سلام و جواب میں اضافہ کرنا ہے جو متعین الفاظ کے

ساتھ مشروع ہوا ہے، رہا کسی کو دعا دینے کا مسئلہ تو اس کی کوئی انتہاء نہیں ہے۔

اور محلی میں مذکور ہے کہ سلام کے ''وبرکاتہٗ'' پر ختم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ سلام کے اجزاء مقاصد کی تینوں قسموں کو سمو لیتے ہیں: (۱) تکالیف سے حفاظت (۲) حصولِ منافع (۳) منافع کا اثبات اور ان میں برکت، اب اس پر بھی زیادتی زائد لا حاصل ہے۔

حنفیہؒ نے اسی کو اختیار کیا ہے؛ چنانچہ امام محمدؒ نے مؤطا میں مذکورہ اثر کو ذکر کرنے کے بعد فرمایا: ''وبه نأخذ'' لہٰذا جب وبرکاتہٗ کہہ دیا جائے تو رُک جانا چاہیے؛ کیونکہ سنت کا اتباع کرنا افضل اور بہتر ہے، اور یہی امام مالکؒ اور شافعیؒ کا مسلک ہے۔

اور اسی کی تائید ایک اور حدیث سے ہوتی ہے جس کو ترمذی، ابوداؤد، اور شعب الایمان وغیرہ میں بطریقِ عمران بن حصین ذکر کیا گیا ہے۔

روي أنه جاء إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال: السلام عليكم، فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم عشر حسنات، فجاء آخر فقال: سلام عليكم ورحمة الله، فقال عشرون حسنة، فجاء آخر، فقال: سلام عليكم ورحمة الله وبركاته، فقال: ثلاثون حسنة.

یہاں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ ایک روایت جس کی تخریج امام ابوداؤد نے معاذ بن انس سے کی ہے جس میں ''ومغفرتہٗ'' کا اضافہ ہے اور اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چالیس نیکیوں کا ذکر فرمایا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس روایت میں دو راویوں (ابومرحوم عبدالرحمٰن بن میمون اور سہل بن معاذ) کو علامہ منذریؒ نے غیر معتبر قرار دیا ہے، لہٰذا مضطرب، ضعیف اور غیر راجح کے مقابلہ میں صحیح اور قوی حدیث کو ترجیح دی جائے گی، تاہم اگر کوئی اضافہ کردے تو یہ ناجائز اور حرام نہیں ہوگا۔

قَالَ يَحْيىٰ سُئِلَ مَالِكٌ هَلْ يُسَلِّمَ عَلَى الْمَرْأَةِ فَقَالَ أَمَّا الْمُتَجَالَّةُ فَلَا أَكْرَهُ ذٰلِكَ وَأَمَّا الشَّابَّةُ فَلَا أُحِبُّ ذٰلِكَ.

ترجمہ: یحییٰ فرماتے ہیں: امام مالکؒ سے معلوم کیا گیا کہ کیا عورت کو سلام کیا جا سکتا ہے، تو امام مالکؒ نے فرمایا: بہرحال بوڑھی عمر دراز تو اس کو میں ناپسند نہیں سمجھتا اور جوان عورت (تو اس کو سلام کرنا) میں پسند نہیں کرتا۔

تشریح: جس طرح مردوں کے لیے ضروری ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کو سلام اور سلام کو خوب رواج دیں، اسی طرح عورتوں کے لیے ضروری ہے کہ عورتیں بھی آپس میں سلام کریں۔

رہا مردوں کا عورتوں کو اور عورتوں کا مردوں کو سلام کرنا تو یہ دو صورتوں میں جائز ہے:

ایک: مرد و زن محرم ہوں یا میاں بیوی ہوں، یا عورت بہت بوڑھی ہو، یا چھوٹی بچی ہو تو ایک دوسرے کو سلام کرنا جائز ہے۔

دوم: عورت اجنبی ہو؛ مگر اس کو سلام کرنے میں، یا اس کے سلام کرنے میں تہمت کا اندیشہ نہ ہو، مثلاً: عورتوں کا مجمع ہو اور ان کو کوئی مرد سلام کرے، یا محرم کی موجودگی میں اجنبی عورت کو سلام کرے، یا کوئی عورت مردوں کے مجمع کو سلام کرے تو یہ جائز ہے؛ کیونکہ ان صورتوں میں فساد کا کوئی اندیشہ نہیں، ان دونوں صورتوں کے علاوہ غیر محرم کو سلام کرنا مکروہ ہے۔

بخاری شریف میں حدیث ہے: صحابہ رضی اللہ عنہم اس بڑھیا کو سلام کیا کرتے تھے جو ہر جمعہ کو ان کی دعوت کرتی تھی، امام نوویؒ نے بھی قدرے تفصیل سے اسی کو بیان کیا ہے۔ (تحفۃ الالمعی: ج/۶، ص/۴۷۶)

اور جن حدیثوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عورتوں کو سلام کرنے کا ذکر ہے، وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت تھی، حلیمیؒ فرماتے ہیں: آپ صلی اللہ علیہ وسلم عصمت کی وجہ سے تمام فتنوں سے محفوظ تھے۔

لغات: المتجالة: جیم ولام کی تشدید کے ساتھ معنی عمر دراز عورت۔

وفي النهاية تجالت: أي أسنت، كبرت.

قال الزرقاني: المتجالة العجوز التي انقطع أرب الرجال منها.

بَابُ مَا جَاءَ فِي السَّلَامِ عَلَى الْيَهُودِيِّ وَالنَّصْرَانِيِّ

(یہ باب یہودی اور نصرانی کو سلام کرنے سے متعلق ہے)

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ أَنَّهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ الْيَهُوْدَ إِذَا سَلَّمَ عَلَيْكُمْ أَحَدُهُمْ فَإِنَّمَا يَقُوْلُ اَلسَّامُ عَلَيْكُمْ فَقُلْ عَلَيْكَ.

ترجمہ: حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب تم کو یہودی سلام کرتے ہیں تو ان میں سے کوئی کہتا ہے کہ "السام علیک" یعنی تمہیں موت آئے، لہٰذا تم ان کے جواب میں کہو "وعلیک" تمہیں ہی موت آجائے۔

تشریح: مدینہ منورہ اور اس کے قرب جوار میں جو یہودی آباد تھے، وہ مسلمانوں کو سلام کیا کرتے تھے؛ مگر ان کی شرارت یہ تھی کہ "السلام علیکم" کے بجائے السام علیکم کہتے تھے جس کے معنی ہیں تم پر موت واقع ہوجائے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا علم ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا: تم ان کے جواب میں صرف علیکم کہہ دیا کرو یعنی ہم کو نہیں تم کو موت آجائے؛ چنانچہ یہود نے یہ حرکت چھوڑ دی۔

یا پھر یہاں موت سے مراد اہانت و ذلت ہے یعنی یہود مسلمانوں کو ذلیل سمجھتے تھے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے "علیکم" کہنے کا حکم فرمایا یعنی جس ذلت و پستی کو تم ثابت کر رہے ہو اس کے تم خود مستحق ہوجاؤ۔

کفار و مشرکین اور اہلِ کتاب کو سلام کرنے کا مسئلہ

اس مسئلہ میں ابتدا ہی سے دو جماعتیں رہی ہیں۔

ایک فریق اس بات کا قائل ہے کسی بھی غیر مسلم کو لفظ "السلام علیکم" کے لفظ سے ابتداءً سلام نہ کیا جائے، اور اگر کوئی غیر مسلم سلام کردے تو اس کے جواب میں صرف "وعلیکم" یا وعلیک کہا جائے۔

ان کا استدلال اس حدیث سے ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لاتبدؤوا الیهود ولاالنصاری بالسلام. (صحیح مسلم:۲/۲۱۴)

جمہور علماء وفقہاء اور شارحین حدیث کی یہی رائے ہے، نیز امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ سے صراحتاً یہی منقول ہے۔

جبکہ دوسرے فریق کی رائے اس کے برخلاف ہے کہ کافر کو بھی ابتداءً بوقتِ ضرورت سلام کیا جاسکتا ہے، اسی طرح ''وعلیکم السلام'' کہنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے، یہ رائے حضرت عبداللہ ابنِ عباس، حضرت ابوامامہ، حضرت حسن بصری اور عمر بن عبدالعزیز وغیرہ کی طرف منسوب ہے، ان حضرات کا استدلال سلام کی عام اور مطلق روایت سے ہے، اسی اعتبار سے آیت ﴿وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا﴾ کی تفسیر میں دو رائے ہوگئی ہیں: بعض نے اسے مسلمانوں کے ساتھ خاص فرمایا اور بعض نے عام رکھا ہے، حضرت تھانویؒ بھی عموم کے قائل ہیں؛ لیکن فتویٰ پہلی رائے پر دیا گیا ہے۔

(کتاب النوازل:۱۵/۲۴۰، شامی:۹/۵۹۱)

صاحبِ مظاہر حق لکھتے ہیں:

سلام میں پہل کرنا درحقیقت اسلامی تہذیب کا بخشا ہوا ایک اعزاز ہے جس کے مستحق وہی لوگ ہوسکتے ہیں جو اسلامی تہذیب کے پیرو ہوں اور مسلمان ہیں، اس اعزاز کا استحقاق ان لوگوں کو حاصل نہیں ہوسکتا جو دین کے دشمن اور خدا کے باغی ہیں، لہٰذا ان کے ساتھ سلام وغیرہ کے ذریعہ الفت ومحبت کے مراسم کو قائم کرنا جائز نہیں ہے۔ (۵/۳۴)

اور لفظ السلام علیکم محض ایک دعا ہی نہیں ہے؛ بلکہ اسلامی شعار ہے؛ اس لیے اس کا استعمال اسلامی علامت کے طور پر ہونا چاہیے، جیسا کہ دوسرے شعار صرف مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔

تاہم اگر مسلمانوں کے غیر مسلموں سے سماجی، اقتصادی تعلقات ہوں تو بوقتِ ضرورت لفظ سلام کے علاوہ آداب وغیرہ جیسے عام الفاظ استعمال کرنے کی گنجائش ہے۔

اور اگر کسی مجلس میں مسلمان اور کافر دونوں ہوں تو مسلمانوں کی نیت سے سلام کیا جاسکتا ہے۔ (اسلام کا نظام سلام ومصافحہ)

وضاحت: حدیث میں صرف لفظ یہود ہے؛ لیکن اس سے مراد تمام اہلِ کتاب ہیں؛ بلکہ شیخ زکریا نے تمام کفار کو شامل ہے۔

(۲) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صیغہ واحد کے ساتھ جواباً ''وعلیک'' کا حکم دیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ کافر ایک ہوگا تو صیغہ جمع استعمال کرنے میں اس کی تعظیم کا اندیشہ ہے، جبکہ کافر کی تعظیم کی ممانعت ہے۔

مزید تفصیل کے لیے دیکھئے: روح المعانی: ۴/ ۱۴۷، تفسیر رازی: ۱۰، احکام القرآن للجصاص: ۲/ ۲۱۸، تحفۃ الالمعی: ۶، اوجز: ۱۷۔

جَامِعُ السَّلَامِ

(سلام سے متعلق مختلف احادیث)

عَنْ أَبِي وَاقِدٍ اللَّيْثِيِّ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَمَا هُوَ جَالِسٌ فِي الْمَسْجِدِ وَالنَّاسُ مَعَهُ إِذْ أَقْبَلَ نَفَرٌ ثَلَاثَةٌ فَأَقْبَلَ اثْنَانِ إِلىٰ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَذَهَبَ وَاحِدٌ فَلَمَّا وَقَفَا عَلىٰ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَلَّمَا فَأَمَّا أَحَدُهُمَا فَرَأىٰ فُرْجَةً فِي الْحَلْقَةِ فَجَلَسَ فِيْهَا وَأَمَّا الْاٰخَرُ فَجَلَسَ خَلْفَهُمْ وَأَمَّا الثَّالِثُ فَأَدْبَرَ ذَاهِبًا فَلَمَّا فَرَغَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ أَلَا أُخْبِرُكُمْ عَنِ النَّفَرِ الثَّلٰثَةِ أَمَّا أَحَدُهُمْ فَأَوىٰ إِلَى اللهِ فَاٰوَاهُ اللهُ وَأَمَّا الْاٰخَرُ فَاسْتَحْيٰى فَاسْتَحْيَى اللهُ مِنْهُ وَأَمَّا الْاٰخَرُ فَأَعْرَضَ فَأَعْرَضَ اللهُ عَنْهُ.

ترجمہ وتشریح: حضرت ابوواقد اللیثی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے اس دوران کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبویؐ میں تشریف فرما تھے اور لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، اتنے میں تین آدمی آئے ان میں سے دو آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کی طرف متوجہ ہوئے، اور ایک چلا گیا اور جب یہ دونوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر کھڑے ہوئے دونوں نے سلام کیا (علی یہاں "عند" کے معنیٰ میں ہے) ان میں سے ایک شخص نے حلقہ میں ایک خالی جگہ دیکھی وہ وہاں بیٹھ گیا، دوسرا لوگوں کے پیچھے بیٹھ گیا، اور تیسرا پشت پھیر کر واپس چلا گیا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (دعا، ذکر، وعظ اور نصیحت وغیرہ کی مشغولی سے) فارغ ہو گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا میں تمہیں تینوں کا حال نہ بتلاؤں؟

ایک شخص وہ ہے جس نے اللہ کی طرف رجوع کیا، اللہ سے پناہ مانگی، ٹھکانہ مانگا اللہ نے اسے ٹھکانہ دے دیا، یہ اس شخص کی طرف اشارہ ہے جس نے حلقہ میں کوئی خالی جگہ دیکھی اور اس خالی جگہ میں بیٹھ گیا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح سے اس کی تعریف فرمائی کہ اس نے اللہ سے ٹھکانہ مانگا، اللہ نے اسے ٹھکانہ عطا کیا، وہ خالی جگہ میں بیٹھ گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قربت کو حاصل کر لیا، دوسرا شخص تھا اس نے حیا کا معاملہ کیا اور مزاحمت کر کے آگے نہیں بڑھا اور آگے بیٹھنے کی کوشش نہیں کی اور شرم وحیا کرتا ہوا مجلس کے اختتام پر لوگوں کے پیچھے بیٹھ گیا، اللہ نے بھی اس کے ساتھ حیا کا معاملہ فرمایا کہ اس سے مواخذہ نہیں فرمایا۔

(**فائدہ**: جب اللہ تعالیٰ کی طرف کسی انفعالی کیفیت کی نسبت ہوتی ہے تو اس سے مراد نتیجہ ہوتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کے حیا فرمانے کے معنیٰ یہ ہیں کہ اس بات سے حیا کی کہ اس کو عذاب دے یا اس کی گرفت کرے، گویا اللہ نے اس کو گرفت سے محفوظ رکھا)

تیسرا وہ شخص ہے جس نے اعراض کیا، اللہ نے بھی اس سے اعراض کیا یعنی وہ مجلس میں حاضر نہیں ہوا تو مجلس کی برکات سے محروم رہا، اور علامہ قسطلانیؒ نے فرمایا: یہاں اعراض سے مراد عدمِ التفات ہے یعنی جب اس نے توجہ نہیں کی تو اللہ تعالیٰ نے بھی اس کے ساتھ عدمِ التفات کا معاملہ فرمایا اور یہ اللہ کے حق میں اللہ کا غصہ اس کی ناراضگی اور سزا دینا ہے۔

یہاں ایک اشکال ہے: ایک شخص کسی عذر کی وجہ سے حلقۂ علم میں شریک نہ ہو تو اسے

اللہ سے یا مجلسِ علم سے اعراض کرنے والا کیسے کہا جاسکتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ بعض محدثین کا کہنا ہے کہ وہ شخص منافق تھا؛ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بارے میں اللہ کی ناراضگی کی خبر دی ہے یا اسے بددعا دی۔

علامہ زرقانیؒ نے تائیداً ابوعمر کا قول نقل کیا ہے کہ اکثر وبیشتر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس سے اعراض کرنے والے منافق ہی ہوتے تھے۔

اور اگر کوئی مؤمن ہی تھا تو ہوسکتا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی اس کے بلاعذر مجلس سے اعراض کرنے کو بتادیا گیا ہو۔

(انعام الباری: ۲/۳۳۰، شرح الزرقانی: ۴/، اوجز: ۱۷)

تنبیہ: امام بخاریؒ نے اس حدیث کو کتاب العلم میں آدابِ مجلسِ درس کے سلسلہ میں ذکر فرمایا ہے، حضرت امام مالکؒ نے اس حدیث کی تخریج اس لیے کی ہے کہ آنے والے لوگوں نے سلام کیا تھا، یہی ترجمۃ الباب ہے۔

آدابِ مجلس

حافظ ابنِ حجرؒ نے فرمایا: اس حدیث پاک سے مجلس میں حاضری کے آداب معلوم ہوگئے یعنی جب علمی مجلس یا حلقۂ درس میں حاضری ہوتو اوّلاً سلام کرنا چاہیے، پھر جو خالی جگہ ہو اس کو پُر کرکے بیٹھ جائے، یہاں تک کہ اگر لوگوں کو اذیت نہ ہوتو پھلانگ کر بھی آگے بڑھ سکتا ہے؛ لیکن اگر درمیان مجلس میں جگہ نہ ہو یا جگہ ہو؛ لیکن خالی جگہ کو بھرنے میں تکلیف کا اندیشہ ہوتو مجلس کے ختم پر اور کنارہ پر بیٹھ جائے۔

لغات: ''نفر'' بفتح النون والفاء تین سے دس مردوں کی جماعت۔

''فُرجة'': دو چیزوں کے درمیان خالی جگہ۔

أدبر: تولی واپس چلے جانا، مڑجانا۔

الحلقة: مجلس، جماعت۔

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّهُ سَمِعَ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ وَسَلَّمَ عَلَيْهِ رَجُلٌ فَرَدَّ عَلَيْهِ السَّلَامَ ثُمَّ سَأَلَ عُمَرُ الرَّجُلَ كَيْفَ أَنْتَ فَقَالَ أَحْمَدُ إِلَيْكَ اللهَ فَقَالَ عُمَرُ ذٰلِكَ الَّذِي أَرَدْتُّ مِنْكَ.

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو سنا اس حال میں ایک شخص نے انہیں سلام کیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا، پھر اس سے معلوم کیا کہ تم کیسے ہو؟ اس نے کہا میں اللہ کی تعریف بیان کرتا ہوں آپ کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرا مقصد تم سے یہی تھا۔

تشریح: اس روایت میں ملاقات کا طریقہ بتلایا گیا ہے یعنی جب کسی کے پاس جاؤ تو سب سے پہلے سلام کرنا چاہیے، پھر ایک دوسرے سے حال واحوال معلوم کرنے چاہئیں اور احوال پوچھے جانے پر اس کا جواب یہی ہو کہ ہر حال میں اللہ کا شکر ہے؛ کیونکہ اللہ کا شکر ادا کرنے سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتے ہیں اور فضل وکرم میں اضافہ فرماتے ہیں؛ اسی لیے جب آدمی نے حالت پوچھے جانے کے جواب میں الحمدللہ! کہا تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرا مقصد یہی تھا یعنی ہر لحہ خدا کی حمد وثنا ہونی چاہیے: اس لیے کہ ہم اللہ کی اتنی نعمتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں جن کو شمار میں لانا ناممکن ہے۔

لغت: أحمد إليك الله: اس جملے کی مختلف توجیہ کی گئی ہیں:

أحمد الله منتهيا إليك، أحمد الله معك، انهى إليك الحمد.

مَالِكٌ عَنْ إِسْحَاقَ بْنِ عَبْدِ اللهِ بْنِ أَبِي طَلْحَةَ أَنَّ الطُّفَيْلَ بْنَ أُبَيِّ ابْنِ كَعْبٍ أَنَّهُ كَانَ يَأْتِي عَبْدَ اللهِ بْنَ عُمَرَ فَيَغْدُوْا مَعَهُ إِلَى السُّوْقِ قَالَ فَإِذَا غَدَوْنَا إِلَى السُّوْقِ لَمْ يَمْرُرْ عَبْدُ اللهِ بْنُ عُمَرَ عَلَى سِقَاطٍ وَّلَا صَاحِبِ بَيْعَةٍ وَّلَا مِسْكِيْنٍ وَّلَا أَحَدٍ إِلَّا سَلَّمَ عَلَيْهِ قَالَ الطُّفَيْلُ فَجِئْتُ عَبْدَ اللهِ بْنَ عُمَرَ يَوْمًا فَاسْتَتْبَعَنِيْ إِلَى السُّوْقِ فَقُلْتُ لَهُ وَمَا تَصْنَعُ فِي السُّوْقِ وَأَنْتَ لَا تَقِفُ عَلَى الْبَيْعِ وَلَا تَسْأَلُ عَنِ السِّلَعِ وَلَا تَسُوْمُ بِهَا وَلَا تَجْلِسُ فِيْ مَجَالِسِ

السُّوْقِ قَالَ وَأَقُوْلُ اجْلِسْ بِنَا هٰهُنَا نَتَحَدَّثُ قَالَ فَقَالَ لِيْ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ يَا أَبَا بَطْنٍ وَكَانَ الطُّفَيْلُ ذَا بَطْنٍ إِنَّمَا نَغْدُوْ مِنْ أَجَلِ السَّلَامِ نُسَلِّمُ عَلٰى مَنْ لَّقِيْنَا.

ترجمہ وتشریح: طفیل ابن ابی ابن کعب عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس آتے جاتے تھے، پھران کے ساتھ بازار جاتے تھے، طفیل کہتے ہیں: جب ہم بازار جاتے تو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نہیں گزرتے کسی چھوٹے یا بڑے دوکاندار پراور نہ کسی مسکین پر، الغرض کسی کے پاس سے بھی؛ مگر یہ کہ آپ رضی اللہ عنہ اسے سلام کیا کرتے تھے، طفیل کہتے ہیں ایک دن جب میں ان کے پاس گیا (پھرانہوں نے معمول کے مطابق) بازار جانے کے لیے مجھے ساتھ لے لیا، تو میں نے کہا آپ کا بازار میں کیا کام ہے؟ نہ ہی آپ خرید وفروخت کے بارے میں کچھ واقفیت حاصل کرتے ہیں اور نہ کسی کے بارے میں پوچھتے ہیں اور نہ بھاؤ لگاتے ہیں اور نہ بازار کی مجالس میں بیٹھتے ہیں، طفیل کہتے ہیں میں نے ان سے کہا آپ ہمارے پاس بیٹھ جاؤ اور ہمیں حدیثیں پڑھاؤ (یعنی بازار میں جب کسی کام سے نہیں جاتے تو بہتر ہے ہم بیٹھ کر علم سیکھیں سکھائیں) طفیل کہتے ہیں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے مجھ سے کہا: اے پیٹ والے! (طفیل کا پیٹ نکلا ہوا تھا) ہم بازار صرف سلام کی وجہ سے جاتے ہیں اور جس سے ملاقات ہوتی ہے ہم اس سے سلام کرتے ہیں (یعنی ہمارا بازار جانا دنیاوی غرض سے نہیں ہوتا؛ بلکہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان "سلام کو پھیلاؤ اور جانے انجانے ہر ایک کو سلام کرو" کی وجہ سے جاتے ہیں اور چونکہ بازار میں زیادہ آدمی ہوتے ہیں؛ اس لیے فرمانِ نبوی پر عمل کرنے اور ثواب کو حاصل کرنے کا زیادہ موقع ہوتا ہے) پس ہمارا مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔

لغات: غدا (ن) غدواً: صبح کے وقت جانا، جانا۔ سقاط: بردہ فروش جو چھوٹے چھوٹے سامان بیچتا ہے۔

صاحب بيعة: بڑا دوکاندار۔ استتبعني استتباعاً: کسی کو پیچھے لینا۔

سلع (واحد) سلعة: سامان۔ سام (ن) سومًا بھاؤ لگانا۔

عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيْدٍ أَنَّ رَجُلًا سَلَّمَ عَلىٰ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ فَقَالَ السَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُهُ وَالْغَادِيَاتُ وَالرَّائِحَاتُ فَقَالَ لَهُ عَبْدُ اللهِ بْنُ عُمَرَ وَعَلَيْكَ أَلْفًا كَأَنَّهُ كَرِهَ ذٰلِكَ.

ترجمہ: یحییٰ بن سعید سے روایت ہے کہ ایک شخص ابنِ عمر رضی اللہ عنہما کی خدمت میں حاضر ہوا اور "السلام عليكم ورحمة الله وبركاته" (اور اس نے ان کلمات کا اضافہ کردیا) الغاديات والرائحات. تم پر سلامتی ہو اور اللہ کی رحمت اور اس کی برکت اور صبح وشام آنے والی نعمتیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ سب تجھ پر ہزار بار ہوں، گویا آپ نے (معروف سلام پر اضافہ) کو ناپسند فرمایا۔

تشریح: اکثر احادیث میں مکمل سلام وبرکاتہٗ تک ہے؛ چونکہ ان کلمات کے ساتھ سلام اسلام کا شعار اور اس کی خصوصیت ہے اور اس کی امتیازی شان ہے اور کسی کو دعا دینا یہ بُری بات نہیں ہے؛ بلکہ باعثِ اجر وثواب ہے؛ لیکن اگر کلماتِ دعا کو معروف سلام کے ساتھ جوڑ دیا جائے گا تو اس کی اصل حیثیت اور امتیاز ختم ہو جائے گا، اور کوئی کچھ دوسرا کچھ جب اس میں اضافہ کرے گا تو اس کا مذاق بن جائے گا، نیز دوسرے کلمات کو ملانا ایک گونہ کلماتِ نبی پر اضافہ ہے جس میں بدعت کی بو آتی ہے؛ اسی لیے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو ناگوار گزرا تھا، لہٰذا اگر کسی کو دعائیں دینی ہوں تو شوق سے دی جائیں؛ لیکن انداز اس طرح ہونا چاہیے کہ سلام کے کلماتِ معروف میں اضافہ نہ ہو۔

لغت: الغاديات والرائحات، أي نِعَمٌ تغدو وتروح، أو الطير تغدو وتروح، أو الملائكة رائحات وعاديات.

مَالِكٌ أَنَّهُ بَلَغَهُ إِذَا دَخَلَ الْبَيْتَ غَيْرَ الْمَسْكُوْنِ يَقُوْلُ اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلىٰ عِبَادِ اللهِ الصَّالِحِيْنَ.

ترجمہ: حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں جب کوئی شخص ایسے گھر میں داخل ہو جہاں کسی کی رہائش نہ ہو تو یہ الفاظ کہنا مستحب ہے السلام علینا الخ

تشریح: قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جب تم گھروں میں داخل ہو تو پہلے سلام کرو، لہٰذا جب کسی رہائشی گھر میں داخل ہو تو معروف سلام کرے اور اگر غیر رہائشی گھر میں داخل ہو تو مذکورہ طریقہ پر سلام کرے، یعنی اپنے آپ کو اور اللہ کے نیک بندوں کے لیے سلامتی کی دعا کرے جیسے تشہد میں کرتے ہیں۔

کِتَابُ الْاِسْتِئْذَانِ

(گھر میں داخل ہوتے وقت اجازت طلبی کا بیان)

الاستئذان: طلب لإذن المراد ھھنا طلب الإباحة بالدخول المكان.
امام نوویؒ نے استئذان کے مشروع ہونے پر علماء کا اجماع نقل کیا ہے اور اسے قرآن وحدیث دونوں سے ثابت کیا ہے، سورۂ نور (آیت ۲۷) میں ارشاد پاک ہے: اے ایمان والو! تم اپنے گھر کے علاوہ دوسرے کے گھروں میں داخل مت ہو، یہاں تک کہ تم اجازت حاصل کرلو اوران کے رہنے والوں کوسلام کرلو اور حدیثیں باب میں آرہی ہیں۔

استئذان کی حکمت ومصلحت

اللہ تعالیٰ نے ہرانسان کو رہنے کے لیے ایک جگہ اور مقام عطا فرمایا ہے خواہ وہ جگہ بطورِ ملک ہو یا بطورِ رعاریت واجرت، اور اس جگہ ومقام عطا کرنے کا مقصد راحت وسکون کا حصول ہے، اورسکون واطمینان کی بقا اسی وقت ممکن ہے جب غیر کی مداخلت کے بغیر آزادی کے ساتھ اپنا کام اورآرام کرسکے، اس کی آزادی میں خلل ڈالنا گھر کی مصلحت فوت کرنا ہے جو بڑی ایذا کی بات ہے اور کسی کو بھی ناحق تکلیف پہنچانا حرام ہے، لہٰذا استیذان کی بڑی مصلحت انسان کی آزادی میں دخیل ہونے اور ایذا رسانی سے بچانا ہے۔
دوسری مصلحت فواحش اور بے حیائی کا انسداد ہے؛ کیونکہ بغیر اجازت داخل ہونے میں غیر محرم پر یا اعضاء غیر مستورہ پر نظر پڑ جانے کا اندیشہ ہے، تیسری مصلحت انسان بعض

اوقات اپنے گھر کی تنہائی میں ایسے کام میں مشغول ہوتا ہے جس پر دوسروں کی اطلاع کو مناسب نہیں سمجھتا، اگر کوئی بلا اجازت داخل ہوجائے تو اس پوشیدہ چیز پر مطلع ہوجائے گا جس کو صاحبِ بیت مخفی رکھنا چاہتا ہے، اور یہ بات اس کے لیے باعثِ اذیت ہوسکتی ہے۔

نیز اجازت طلبی خود وارد شخص کے لیے بھی مفید ہے؛ کیونکہ جب اجازت کے بعد دخول ہوگا، تو گفتگو میں اطمینان ہوگا؛ ورنہ اچانک آدھمکنے پر صاحبِ خانہ آنے والے شخص کو دفع کرنے کی کوشش کرے گا۔

استیذان کا مسنون طریقہ:

مسنون طریقہ یہ ہے کہ آنے والا پہلے سلام کرے، پھر نام بتلا کر اجازت طلب کرے، حدیث میں ہے کہ بنو عامر کے ایک شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح اجازت طلب کی ''أألِجُ؟'' میں اندر آؤں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خادم سے کہا: یہ شخص استیذان کا طریقہ نہیں جانتا تم باہر جا کر اسے طریقہ سکھلاؤ کہ کہے: السلام علیکم أ أدخل؟ ان صاحب نے آپ کی بات خود ہی سن لی؛ چنانچہ انہوں نے اسی طرح اجازت طلب کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دیدی۔ (ابوداؤد، حدیث: ۵۱۷۷)

اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص پہلے سلام نہ کرے اس کو اندر آنے کی اجازت مت دو۔ (مشکوۃ: ۴۶۷۶)

اور یہ سلام استیذان ہے، پھر جب داخل ہوجائے تو دوبارہ سلام کرے۔

(تحفۃ الالمعی: ۶/ ۴۶۴-۴۶۵)

اجازت طلبی کی کیفیت:

اگر کسی کے دروازہ پر جا کر اجازت طلب کی، سلام کیا، گھنٹی وغیرہ بجائی؛ مگر اندر سے کوئی جواب نہیں آیا تو دوبارہ اجازت طلب کرے، پھر بھی جواب نہ ملنے پر تیسری مرتبہ اجازت طلب کرے، اب بھی جواب نہ ملے تو لوٹ جائے۔ (مسلم شریف) نیز باب میں

بھی آئندہ حدیث آرہی ہے جس میں تین مرتبہ اجازت طلب کرنے کا بیان ہے، اسی طرح کی روایت حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تین مرتبہ اجازت سے تقریباً یہ بات طے ہوجاتی ہے کہ آواز سن لی گئی ہے؛ مگر صاحبِ خانہ یا تو ایسی حالت میں ہے کہ جواب نہیں دے سکتا، مثلاً: نماز میں مشغول ہے، یا قضائے حاجت کر رہا ہے وغیرہ وغیرہ یا ہوسکتا ہے اس کو اس وقت ملنا منظور نہیں ہے، پس ایسی حالت میں جمے رہنا اور مسلسل دستک دیتے رہنا مصلحت کے خلاف اور باعثِ ایذا ہے جس سے بچنا واجب ہے۔

(معارف القرآن: ۶/ ۳۹۲، تفسیر رازی: ۲۳/ ۱۹۶)

باعتبار مکان اجازت کے مختلف احکام:

سورۂ نور کی آیت ۲۷ میں مکان کے اعتبار سے استیذان کے مختلف احکام بیان کیے گئے ہیں۔

مکانات کی چار قسمیں ہیں: (۱) وہ مکان جو کسی شخص کے ساتھ خاص ہو، اس میں کسی دوسرے کے آنے کا احتمال نہ ہو تو اس گھر میں ظاہر ہے کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔

(۲) وہ مکان جو کسی دوسرے کا ہو خواہ محارم کا ہو یا غیر محارم کا، اگر محارم کا ہو تب بھی اجازت لینا بہتر ہے، آئندہ آنے والی حدیث میں ہے کہ ایک صحابیؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ گھر میں اپنی ماں کے ساتھ رہتا ہوں اور ان کی خدمت بھی کرتا ہوں، کیا تب بھی مجھے اجازت لینے کی ضرورت ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ضرورت ہے، صحابی رضی اللہ عنہ نے تین مرتبہ سوال کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تینوں مرتبہ اثبات میں جواب دیا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وجہ بتلائی کہ اجازت لینا اس لیے بہتر ہے کہ ہوسکتا ہے کسی وقت تمہاری ماں برہنہ حالت میں ہوں اور تم بغیر اجازت کے

داخل ہوجاؤ گے تو یہ ان کے لیے باعثِ مشقت اور تمہارے لیے شرمندگی کا سبب ہوسکتا ہے؛ بلکہ امام رازیؒ نے محارم سے بھی اجازت لینا واجب قرار دیا؛ البتہ ان کے لیے کچھ تخفیف ہے اور اگر وہ گھر محارم کا نہ ہو؛ بلکہ کسی اجنبی کا ہو تو مرد اور عورت ہر ایک کے لیے استیذان واجب ہے۔

(۳) تیسری قسم وہ مکان جس میں بالفعل کسی کے رہنے یا نہ رہنے دونوں کا احتمال ہو تو ایسے گھروں میں بھی طلبِ اجازت ضروری ہے کہ اگر واقعی اس میں کوئی موجود ہو تو ظاہر ہے اور اگر وہ شخص وہاں موجود بھی نہ ہو پھر بھی کسی کی ملکیت میں بلا اجازت داخل ہونا دوسرے کی ملکیت میں تصرف کرنا ہے جو ناجائز ہے۔

(۴) چوتھی قسم وہ مکانات جو کسی شخص کی رہائش کے لیے مخصوص نہ ہوں جیسے مسجد، مدرسہ، خانقاہ وغیرہ یعنی جن کو برتنے اور استعمال کرنے کا عام لوگوں کو حق ہو تو ان مکانات میں دخول کے لیے اجازت کی ضرورت نہ ہوگی، تاہم اگر مساجد اور مدارس وغیرہ میں خارجی و داخلی مصلحت کی وجہ سے اجازت کو ضروری قرار دیا گیا ہو تو پھر اجازت طلب کرنے کے بعد ہی داخل ہونا چاہیے۔

مسئلہ: جس مکان میں کسی شخص کی صرف بیوی رہتی ہو تو دخول کے لیے شوہر کو استیذان واجب تو نہیں؛ لیکن اجازت لینا یا کسی طرح باخبر کردینا مستحب ہے، حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کی زوجہ فرماتی ہیں کہ عبداللہ جب بھی گھر آتے تو دروازہ بجا کر پہلے آنے کی خبر دیتے؛ تاکہ وہ ہمیں کسی ایسی حالت میں نہ دیکھیں جو انہیں ناپسند ہو۔

(ابنِ کثیر، معارف القرآن)

اجازت طلبی کے وقت دروازہ کے سامنے کھڑا نہ ہو؛ بلکہ دائیں بائیں کھڑا ہوجائے

قال علیه السلام: لاتستاذن وأنت مستقبل الباب.

(تفسیر رازی: ۲۳/۱۹۷)

نیز اجازت طلب کرتے وقت شگاف سے جھانکنے کی کوشش نہ کرے؛ کیونکہ

استیذان کی مشروعیت کا مقصد ہی نظر پڑنے سے بچانا ہے۔

عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَأَلَهُ رَجُلٌ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللهِ اسْتَأْذِنُ عَلٰى أُمِّيْ فَقَالَ نَعَمْ فَقَالَ الرَّجُلُ إِنِّيْ مَعَهَا فِي الْبَيْتِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اسْتَأْذِنْ عَلَيْهَا فَقَالَ الرَّجُلُ إِنِّيْ خَادِمُهَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اسْتَأْذِنْ عَلَيْهَا أَتُحِبُّ أَنْ تَرَاهَا عُرْيَانَةً قَالَ لَا قَالَ فَاسْتَأْذِنْ عَلَيْهَا.

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے دریافت کیا اے اللہ کے رسول! (گھر میں داخل ہوتے وقت) کیا میں اپنی ماں سے اجازت لوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں! پھر اس آدمی نے کہا میں گھر میں اسی کے ساتھ رہتا ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پھر بھی اجازت لے، اس نے کہا میں اپنی ماں کی خدمت کرتا ہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پھر بھی اجازت طلب کرو، کیا تم اس بات کو پسند کرو گے کہ تم اس کو برہنہ دیکھو اس نے کہا نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بس پھر اجازت لے کر داخل ہو۔

تشریح: سائل کے ذہن میں یہ تھا کہ جب میری ماں اور ہم ایک ہی مکان میں رہتے ہیں اور محارم بھی ہیں تو میرے لیے استیذان کی کیا ضرورت ہے؟ استیذان تو اجنبی کے لیے ہونا چاہیے؛ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خلجان دُور کرتے ہوئے فرمایا: تمہارے لیے بھی اجازت لینا بہتر ہے، پھر اس آدمی نے کہا میں ان کی خدمت بھی کرتا ہوں، جس کی وجہ سے میرا بار بار آنا جانا رہتا ہے اور مجھے اجازت میں حرج ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں اجازت لینے کا حکم فرمایا اور وجہ یہ بتلائی کہ اگرچہ وہ محارم میں سے ہے جن سے اجازت لینا واجب نہیں؛ لیکن ممکن ہے وہ کسی حالت میں ہوں جو قابلِ دید نہ ہو، مثلاً تمہاری غیوبت میں جسم کے کسی حصہ کو کھولنے کی ضرورت پڑ جائے، لہٰذا ایسی صورت میں داخل ہونا باعث شرمندگی ہوگا۔

عَنْ أَبِي مُوْسَى الْأَشْعَرِيِّ أَنَّهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْاِسْتِئْذَانُ ثَلٰثٌ فَإِنْ أُذِنَ لَكَ فَادْخُلْ وَإِلَّا فَارْجِعْ.

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: داخل ہونے کی اجازت تین مرتبہ لینا چاہیے، اگر تمہیں اجازت دے دی جائے تو داخل ہو جائے؛ ورنہ واپس ہو جاؤ۔

عَنْ رَبِيْعَةَ بْنِ أَبِي عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَنْ غَيْرِ وَاحِدٍ مِّنْ عُلَمَاءِهِمْ أَنَّ أَبَا مُوْسَى الْأَشْعَرِيِّ جَاءَ يَسْتَأْذِنُ عَلٰى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَاسْتَأْذَنَ ثَلٰثًا ثُمَّ رَجَعَ فَأَرْسَلَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ فِيْ أَثَرِهِ فَقَالَ مَالَكَ لَمْ تَدْخُلْ فَقَالَ أَبُوْ مُوْسَى الْأَشْعَرِيُّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ الْاِسْتِئْذَانُ ثَلٰثٌ فَإِنْ أُذِنَ لَكَ فَادْخُلْ وَإِلَّا فَارْجِعْ فَقَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ وَمَنْ يَّعْلَمُ هٰذَا لَئِنْ لَّمْ تَأْتِنِيْ بِمَنْ يَّعْلَمُ ذٰلِكَ لَأَفْعَلَنَّ بِكَ كَذَا وَكَذَا فَخَرَجَ أَبُوْ مُوْسٰى حَتّٰى جَاءَ مَجْلِسًا فِي الْمَسَاجِدِ يُقَالُ لَهُ مَجْلِسُ الْأَنْصَارِ فَقَالَ إِنِّيْ أَخْبَرْتُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ إِنِّيْ سَمِعْتُ مِنْ رَّسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ الْاِسْتِئْذَانُ ثَلٰثٌ فَإِنْ أُذِنَ لَكَ فَادْخُلْ وَإِلَّا فَارْجِعْ فَقَالَ لَئِنْ لَّمْ تَأْتِنِيْ بِمَنْ يَّعْلَمُ هٰذَا لَأَفْعَلَنَّ بِكَ كَذَا وَكَذَا فَإِنْ كَانَ سَمِعَ ذٰلِكَ أَحَدٌ مِّنْكُمْ فَلْيَقُمْ مَعِيَ فَقَالُوْا لِأَبِيْ سَعِيْدٍ الْخُدْرِيِّ قُمْ مَعَهُ وَكَانَ أَبُوْ سَعِيْدٍ أَصْغَرَهُمْ فَقَامَ مَعَهُ فَأَخْبَرَ ذٰلِكَ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ فَقَالَ عُمَرُ لِأَبِيْ مُوْسٰى أَمَا إِنِّيْ لَا أَتَّهِمُكَ لٰكِنِّيْ خَشِيْتُ أَنْ يَّتَقَوَّلَ النَّاسُ عَلٰى رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.

ترجمہ وتشریح: حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لائے اور گھر میں داخل ہونے کی اجازت طلب کرنے لگے، پھر جب انہوں نے تین مرتبہ اجازت طلب کر لی (اور اندر سے کوئی جواب نہیں آیا) تو واپس ہو گئے (پھر حضرت کو معلوم ہوا کہ واپس ہو گئے) تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو بلانے کے لیے

ان کے پیچھے ایک آدمی بھیجا جب آ گئے تو حضرت نے معلوم کیا تم گھر میں داخل کیوں نہیں ہوئے؟ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اجازت تین مرتبہ لی جائے گی، اگر اجازت ملجائے تو داخل ہوجاؤ؛ ورنہ واپس ہوجاؤ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اس حدیث کو اور کون جانتا ہے؟ اگر تم اسے میرے پاس لے کر نہیں آئے تو میں تمہارے ساتھ ایسا ایسا کروں گا (یعنی تمہیں سزا دوں گا) ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس سے اٹھ کر مسجد میں ایک مجلس لگی ہوئی تھی وہاں آئے جسے مجلسِ انصار کہا جاتا تھا، انہوں نے مجلس میں آ کر کہا میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مذکورہ حدیث بیان کی ہے؛ لیکن انہوں نے کہا اگر تم میرے پاس کسی ایسے شخص کو نہیں لاؤ گے جو اس حدیث کو جانتا ہو تو میں تمہیں سزا دوں گا، پس اگر تم میں سے کسی نے اس حدیث کو سنا ہو تو میرے ساتھ کھڑا ہوجائے (اور میرے ساتھ چلے) حاضرینِ مجلس نے ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے کہا تم کھڑے ہوجاؤ اور وہ اس مجلس میں سب سے چھوٹے تھے (یعنی یہ حدیث اتنی مشہور ہے کہ چھوٹے بڑے سب جانتے ہیں) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ ان کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور اس حدیث کے بارے میں بتلایا یعنی تصدیق کی، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے کہا میرا مقصد تم پر تہمت لگانا نہیں تھا کہ تم نے حدیث گھڑ لی ہے؛ بلکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کر کے باتیں نہ گھڑیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اس طرح تحقیق کرنے کا مقصد نعوذ باللہ ایک طویل صحبت صحابی پر الزام لگانا نہیں تھا؛ بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث کے سلسلہ میں یہ شدتِ احتیاط تھی اور وہ چاہتے تھے کہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب بات میں جرأت سے کام نہ لیں؛ بلکہ تحقیق اور اعتماد کے ساتھ حدیث کو جانتے ہوں تبھی اسے بیان کریں۔

مذکورہ دونوں روایتوں میں استیذان کا طریقہ بتایا گیا ہے۔

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں افسوس ہے آج کل اجازت طلبی

میں اتنی غفلت برتی جاتی ہے ایسا لگتا ہے کہ استیذ ان کی آیات منسوخ ہوگئی ہیں (نعوذ باللہ من ذلک)۔

اَلتَّشْمِيتُ فِي الْعُطَاسِ

التشمت لغة: الدعاء بالخير والبركة.

تشميت: قال ابن عبدالبر في "التمهيد" أمّا التشميت: فمعناه: أبعدك الله عنك الشماتة. اللہ آپ کو دشمنوں کی شماتت اور ہنسی سے محفوظ رکھے۔

(شرح الزرقانی: ۴)

العطاس بضم العين من عطس (س،ن) عطسة: چھینکنا۔

چھینک کی حقیقت اطباء نے یہ بین کی ہے کہ جریانِ دم کے تسلسل سے رگوں کے اندر ہوا پیدا ہو جاتی ہے جسے اللہ چھینک کے ذریعہ نکال دیتے ہیں؛ اسی لیے چھینک اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے؛ کیونکہ اگر وہ ہوا نہ نکلے تو رگوں کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے، نیز اس سے جسم کے اندر چستی اور نشاط پیدا ہو جاتا ہے؛ اسی لیے بطورِ شکر یہ اتنی دعائیں مشروع ہوئی ہیں۔

تشمیت کا فائدہ وحکمت:

علامہ ابنِ دقیق العیدؒ نے فرمایا کہ: تشمیت کا فائدہ مسلمانوں کے درمیان الفت ومحبت قائم کرنا ہے، نیز چھینکنے والے کو کسر نفسی کی تعلیم دینا ہے اور تواضع پر اُبھارنا ہے۔

تشمیت کا حکم:

چھینکنے والے کے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کہنے کے جواب میں يَرْحَمُكَ اللّٰهُ کہنے کے بارے میں اختلاف ہے۔

(۱) شوافع میں سے امام نوویؒ نے فرمایا: یہ سنت علی الکفایہ ہے مجلس میں سے ایک کا جواب دینا سب کی طرف سے کافی ہے، بعض مالکیہؒ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔

(۲) ظاہریہ، مالکیہؒ میں سے ابنِ مزینؒ اور بعض شوافعؒ کے نزدیک فرضِ عین ہے، علامہ ابنِ قیمؒ نے اسی قول کو ترجیح دی ہے، ان کے دلائل درج ذیل ہیں:

بخاری اور مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث ہے: **خمس تجب للمسلم علی المسلم** اوران میں تشمیت کا بھی ذکر ہے، اس کے علاوہ مسلم اور مسند احمد وغیرہ کی وہ روایات ہیں جن میں **حق المسلم علی المسلم** کا ذکر ہے اوران میں تشمیت کو بھی شمار کیا گیا ہے۔

علامہ ابن القیمؒ نے فرمایا: ان احادیث میں صراحۃً ''جب'' ہے یا ''علی'' اور ''حق'' جیسے الفاظ ہیں جو فرضیت کو ثابت کرتے ہیں۔

(۳) حضرات حنفیہ، اکثر حنابلہ، شوافع اور مالکیہ میں سے، ابنِ رشد اور ابن العربی کے نزدیک فرضِ کفایہ ہے، حافظ ابنِ حجرؒ نے اسی کو ترجیح دی ہے۔

شامی میں ہے: **تشمیت العاطس فرض علی الکفاية عند الأکثرین.**

(شامی: ۹/ ۵۹۳)

ان حضرات نے فرمایا: ذکر کردہ تمام احادیث بلاشبہ وجوب وفرضیت پر دلالت کرتی ہیں؛ لیکن یہ فرض علی الکفایہ ہونے کے منافی نہیں ہیں، مثلاً سلام کا جواب دینا بھی انہیں حقوق میں ذکر کیا گیا ہے؛ لیکن وہ بالاتفاق واجب علی الکفایہ ہے، لہٰذا جب مجلس میں سے کسی نے بھی **الحمد للہ** کے جواب میں **یرحمك اللہ** کہہ دیا تو سب کی طرف سے وجوب ادا ہو جائے گا؛ البتہ یہ وجوب اسی وقت ہے، جب چھینکنے والے نے **الحمد للہ** کہا ہو۔ (کشف الباری: ۶/ ۶۵۵)

شامی میں ہے: **وإنما یستحق العاطس التشمیت إذا حمد اللہ تعالی، وأما إذا لم یحمد اللہ لایستحق لدعاء لأن العطاس نعمة من اللہ تعالیٰ فمن لم یحمد اللہ بعد عطاسه لم یشکر نعمة اللہ تعالیٰ، وکفران النعمة لایستحق الدعاء.** (شامی: ۹/ ۵۹۳)

تشمیت کے حکم سے مستثنیٰ لوگ:

(۱) جس نے الحمد للہ نہ کہا ہو۔

دوم کافر اس حکم کے تحت داخل نہیں ہے، ابوداؤد میں ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: "كان اليهود يتعاطسون عند النبي صلى الله عليه وسلم رجاء أن يقول يرحمكم الله، فكان يقول يهديكم الله ويصلح بالكم.

سوم: زکام کی وجہ سے چھینکنے والے کو بھی جواب دینا ضروری نہیں ہے، باب میں حدیث آنے والی ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ چھینکنے والے سے فرمایا: تمہیں زکام ہے۔

اس طرح کی روایت مصنف عبدالرزاق، مصنف ابن ابی شیبہ اور ترمذی شریف میں نقل کی گئی ہے؛ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ زکام کا حکم کب لگے گا؟ تو علامہ ابن العربیؒ نے شرح ترمذی میں فرمایا: "والأصح أن ذلك في الثالثة"

یہاں اعتراض یہ ہوتا ہے کہ جو شخص بیمار ہے اور زکام زدہ ہے وہ تو مزید دعاؤں کا مستحق ہے، پھر تین مرتبہ کے بعد یرحمك الله کہنے کی نہی کیوں ہے؟

جواب یہ ہے کہ یہاں یرحمك الله کہنا ایک مخصوص عمل کے طور پر شرعاً وضع کیا گیا ہے، لہٰذا اس کے علاوہ اس کو دوسری دعائیں دی جاسکتی ہیں، اب مسئلہ یہ ہے کہ ایک شخص کو زکام کے سبب چھینکیں آرہی ہیں؛ لیکن وہ ہر بار الحمد للہ کہتا ہے تو کیا ہر بار جواب ضروری ہے؟

تو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث سے، جسے ابویعلی نے ذکر کیا ہے، ممانعت معلوم ہوتی ہے: إذا عطس أحدكم فليشمته جليسه فإن زاد على ثلاث فهو مزكوم ولا يشمته بعد ثلاث. اس میں تین مرتبہ کے بعد تشمیت سے منع کیا گیا ہے۔

اس کے برخلاف عبید ابنِ رفاعہ کی وہ حدیث جس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا، اس سے

جواز واختیار معلوم ہوتا ہے، اس کے الفاظ ہیں: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم يشمت العاطس ثلاثا فإذا زاد فإن شئت فشمته وإن شئت فلا. لیکن مذکورہ دونوں حدیثوں کی سند میں ضعف ہے؛ البتہ علامہ ابن العربی نے فرمایا کہ اگرچہ سند میں ضعف ہے؛ لیکن یہ دعائے خیر ہے اور اس میں تعلق ومحبت کا اظہار ہے اور علامہ ابنِ عبدالبرؒ نے بہتر اور اولیٰ ہونے کی بات کہی ہے۔ (کشف الباری:۶/۶۵۷)

تشمیت کا طریقہ بخاری شریف کی روایت میں بیان کیا گیا ہے: عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: إذا عطس أحدكم فليقل الحمد لله وليقل له أخوه أوصاحبه يرحمك الله، فإذا قال له يرحمك الله فليقل يهديكم الله ويصلح بالكم. (بخاری)

لیکن باب میں آئندہ آنے والی حدیث میں ہے کہ "یرحمك الله" کا جواب "يغفر الله لنا ولكم" سے دینا چاہیے۔

شارح بخاری ابنِ بطالؒ نے امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے بارے میں لکھا ہے کہ انہوں نے حدیث میں وارد دونوں طرح کے جملوں میں اختیار دیا ہے۔

ابنِ رشدؒ نے فرمایا: يغفر الله لنا ولكم کہنا زیادہ بہتر ہے؛ کیونکہ مکلف طلب اور دعائے مغفرت کا زیادہ محتاج ہے۔ (فتح الباری:۱۰/۷۴۳، بحوالہ: کشف الباری)

عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنَّ عَطَسَ فَشَمِّتْهُ ثُمَّ إِنْ عَطَسَ فَشَمِّتْهُ ثُمَّ إِنْ عَطَسَ فَشَمِّتْهُ ثُمَّ إِنْ عَطَسَ فَقُلْ لَهُ أَنْتَ مَضْنُوْكٌ قَالَ عَبْدُ اللهِ بْنُ أَبِيْ بَكْرٍ لَا أَدْرِيْ أَبَعْدَ الثَّالِثَةِ أَوِ الْأَرْبَعَةِ.

ترجمہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر کسی کو چھینک آئے تو تم اس کو دعا دو، پھر چھینک آئے تو پھر دعا دو، پھر چھینک آئے تو پھر دعا دو، اگر پھر چھینک آئے تو کہو تمہیں زکام ہے، عبداللہ بن ابوبکر نے فرمایا: مجھے معلوم نہیں تین بار کے بعد کہے یا چار بار کے بعد۔

تشریح: حدیث پاک میں چھینک والے کو دعا دینے کی ترغیب دی گئی ہے، بشرطیکہ چھینکنے والا چھینک کے بعد الحمد لله کہے، بصورتِ دیگر دعا کا مستحق نہیں اور یہ دعا تین بار چھینکنے تک دی جائے گی، اس کے بعد پھر چھینکیں آتی ہیں تو کہہ دو آپ کو زکام ہے، اب بھی اگر چھینکنے والا الحمد لله کہے تو اختیار ہے چاہے سننے والا یرحمك الله کہے یا نہ کہے۔

راوی کہتے ہیں مجھے یہ یاد نہیں ہے کہ میرے شیخ نے تین مرتبہ کے بعد کہا تھا یا چار مرتبہ کے بعد یعنی آپ کو زکام ہے تین چھینکوں کے بعد کہا جائے گا یا چار چھینکوں کے بعد؟

لغت: مضنوك أي مزكوم الضناك بضم الضاد الزكام.

عَنْ نَافِعٍ أَنَّ عَبْدَ اللهِ بْنَ عُمَرَ كَانَ إِذَا عَطَسَ فَقِيْلَ لَهُ يَرْحَمُكَ اللهُ قَالَ يَرْحَمُنَا اللهُ وَإِيَّاكُمْ وَيَغْفِرُ لَنَا وَلَكُمْ.

ترجمہ: نافع کہتے ہیں جب عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو چھینک آتی تو اس کے جواب میں کہا جاتا تھا یرحمك الله اور عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما جواب میں کہتے یرحمنا الله الخ

تشریح: اس روایت میں یہ طریقہ بتایا گیا ہے کہ جب چھینک آئے چھینکنے والا الحمد لله کہے، پھر سننے والا یرحمك الله کہے، پھر دوبارہ اس کے جواب میں چھینکنے والا دعا دے، مذکورہ روایت میں دعا یرحمنا الله ہے اور دوسری روایات میں الگ دعائیں ہیں؛ اس لیے محدثین نے ہر طرح دعا دینے کا اختیار دیا ہے، تاہم وہی دعائیں کی جائیں تو زیادہ بہتر ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہیں۔

مَا جَاءَ فِي الصُّوَرِ وَالتَّمَاثِيْلِ

صور صورة کی جمع ہے جس کے معنیٰ ہیں: کسی چیز کی ایسی خاص ہیئت جو اس کو دوسرے سے ممتاز کر دے۔

تماثیل تِمثال کی جمع ہے، کسی چیز کی صورت کا دوسرے کے اندر ہونا، دو چیزوں کے درمیان مساوات ہونا۔

صورت اور تمثال میں فرق:

تصویر اور صورت بول کر کبھی نفسِ شئ مراد لے لی جاتی ہے، اور کبھی وہ چیز مراد ہوتی ہے جو کسی کی ہیئت اور شکل بیان کرے، جبکہ تمثال صرف اس چیز کو کہیں گے جو کسی چیز کی ہیئت وحالت کو بیان کرے۔

لیکن فقہاء کے کلام میں تتبع کرنے سے پتا چلتا ہے کہ دونوں لفظوں میں کوئی فرق نہیں ہے؛ بلکہ دونوں مترادف ہیں؛ البتہ بعض لوگوں نے یہ فرق بیان کیا ہے کہ تمثال صرف ذی روح تصاویر کو کہتے ہیں اور تصویر ذی روح غیر ذی روح دونوں کو عام ہے۔

تصویروں کے احکام:

(۱) ایسی چیزوں کی تصویر بنانا بالاتفاق جائز ہے جو انسانی کاری گری سے وجود میں آتی ہیں جیسے گھر، گاڑی، کشتی اور مسجد وغیرہ کی تصویر؛ کیونکہ انسان نے ان چیزوں کو خود اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے، تو ان کی تصویر بھی بنا سکتا ہے۔

(۲) ان جمادات کی تصویر جن کو اللہ نے پیدا کیا ہے، جیسے پہاڑ، وادی، سمندر، چاند، سورج، آسمان، ستارے، اسی طرح درخت، پیڑ پودے، پھول وپھل وغیرہ کی تصویر بنانا بالاتفاق جائز ہے۔

اس کی دلیل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: من صور صورة في الدنيا كلف أن ينفخ فيها الروح وليس بنافخ. اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ممانعت صرف ذی روح کے ساتھ خاص ہے اور دوسری دلیل حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے: أنه نهى المصور عن التصوير، ثم قال له إن كنت فاعلًا فصور الشجر ومالا روح فيه. اس روایت میں غیر ذی روح کی تصویر کشی کی صراحتاً اجازت ہے۔

(۳) انسان اور دوسرے جانداروں کی تصویر کشی کے حکم کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔

علماء کی ایک چھوٹی سی جماعت اس کو بالکل حلال قرار دیتی ہے اور ممانعت کی حدیثوں کے متعلق ان کا جواب ہے کہ تصویر کشی کی ممانعت اس وقت ہے جب ان کو عبادت کرنے کے لیے بنایا جائے۔

ان کی دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿قَالَ اَتَعۡبُدُوۡنَ مَا تَنۡحِتُوۡنَ ﴿۹۵﴾ وَ اللّٰہُ خَلَقَکُمۡ وَ مَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹۶﴾﴾ یعنی اس آیت میں عبادت کے لیے تراشے ہوئے بتوں کی عبادت کرنے پر مذمت کی گئی ہے۔

دوسرا مسلک امام مالکؒ اور بعض سلفؒ کا ہے، ان حضرات کے نزدیک تصویر کشی کی حرمت کے ثبوت کے لیے تین شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے:

(۱) انسان یا دوسرے جاندار کی تصویر سایہ دار ہو یعنی تمثال مجسم ہو، پس اگر سایہ دار اور مجسم نہ ہو؛ بلکہ دیوار، کاغذ اور کپڑے وغیرہ پر نقش کی گئی ہو تو یہ حرام نہیں ہے؛ بلکہ مکروہ ہے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ وہ تصویر مکمل اعضاء والی ہو، لہٰذا اگر کوئی ایسا عضو کاٹ دیا جائے جس کے بغیر حیوان زندہ نہیں رہتا ہے جیسے سر، پیٹ، سینہ تو یہ تصویر حرام نہ ہوگی۔

تیسری شرط یہ ہے کہ جاندار کی تصویر کو کسی ایسی چیز سے بنایا ہو جو پائیدار ہو جیسے لوہا، پیتل، تانبا، سمینٹ، لکڑی وغیرہ اور کسی ایسی چیز سے تصویر بنائی جائے جو دیر تک باقی نہیں رہتی، مثلاً آٹے، موم اور تربوز وغیرہ کے چھلکے سے تو یہ حرام نہ ہوگی۔

مسلک ثانی کے قائلین کا استدلال باب میں آنے والی روایت سے ہے جس میں ''إلا ماكان رقما في ثوب'' کا اضافہ ہے یعنی تصویر کشی حرام ہے، الا یہ کہ وہ کسی کپڑے وغیرہ میں منقش ہو۔

تیسرا مذہب امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا ہے، ان حضرات کے نزدیک

جاندار کی تصویر مطلقاً حرام ہے، خواہ سایہ دار ہو یا غیر سایہ دار، مجسم ہو یا غیر مجسم؛ بلکہ امام نوویؒ نے تو اس کی حرمت پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے۔

ان حضرات کا استدلال متعدد احادیث سے ہے:

(۱) إن أشد الناس عذابًا يوم القيامة المصورون. (متفق علیہ) اس حدیث میں مصورین کے لیے بروزِ قیامت عذاب کی وعید ہے۔

(۲)وعن ابن عباس أنه قال لمصور سمعت رسول الله يقول: كل مصور في النار يجعل له بكل صورة صورها نفسٌ فيعذبه في جهنم.

(۳)قال رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال الله تعالىٰ: ومن أظلم ممن ذهب يخلق خلقا كخلقي فيخلقوا ذرة، أو ليخلقوا حبة أو ليخلقوا شعيرة. (طحاوي)

جواب: جن حضرات کے نزدیک تصویر کشی بالکل جائز ہے یا اس کی بعض صورتیں جائز ہیں، ان کا مذہب باطل ہے؛ اس لیے کہ حدیث پاک میں تصویر کی ممانعت اور اس پر وعید کو مطلق رکھا گیا ہے جس میں جاندار کی ہر قسم کی تصویر شامل ہے۔

اور "إلا ماكان رقما في ثوب" کا تعلق غیر جاندار سے ہے یا اس سے مراد وہ تصویر ہے جس کو روندا جائے یعنی وہ چلنے یا بیٹھنے کی جگہ ہو؛ کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سفر سے تشریف لائے، میں نے الماری پر تصویر والا پردہ لٹکا رکھا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پھاڑ دیا اور فرمایا: قیامت کے دن تصویر بنانے والوں کو سخت عذاب دیا جائے گا۔

فائدہ: تصویر کشی تو جمہور علماء کے نزدیک حرام ہے، رہا تصویر والی شئ کو گھر میں رکھنا تو اس بارے میں درمختار میں تفصیل ہے کہ اگر تصویر بیٹھنے کی جگہ یا چلنے کی جگہ ہو کہ اس کی پامالی ہوتی ہو یا پھر اتنی چھوٹی ہو جس کے اعضاء واضح طور پر دکھائی نہ دیتے ہوں یا پھر اس کا سر یا ایسا عضو کٹا ہوا ہو جس کے بغیر جاندار زندہ نہیں رہ سکتا یا پھر غیر جاندار جیسے

درختوں وغیرہ کی تصویر تو ان تمام صورتوں میں گھر میں تصویر ہونے پر کوئی وعید نہیں، جیسا کہ حدیث شریف میں خود موجود ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے تصویر والے پردہ کو پھاڑ کر تکیے بنالیے تھے۔

تصویر کشی کی علتِ حرمت:

علماء نے اس کی متعدد علتیں بیان فرمائی ہیں: (۱) تصویر غیر اللہ کی تعظیم کے غلو کا ذریعہ بنتی ہے، یہاں تک کہ غلو بڑھتے بڑھتے اس کی عبادت تک لے جاتا ہے۔
(۲) اس میں اللہ کی تخلیق سے مشابہت کی کوشش ہوتی ہے (۳) تصویر کشی میں ان مشرکین کے ساتھ تشبہ ہے جو بتوں کو بناتے اور تراشتے ہیں (۴) کسی جگہ میں تصویر کا ہونا دخولِ ملائکہ سے مانع ہے، یقیناً یہ تمام چیزیں ناجائز اور وعید کی مستحق ہیں، لہٰذا جو چیز اس (تصویر کشی) کا ذریعہ بنے گی وہ بھی ناجائز اور حرام ہوگی۔

کیمرہ کی تصویر کا حکم:

کیمرہ کی تصویر کے جواز کا فتویٰ سب سے پہلے مصر کے ایک مفتی علامہ شیخ بخیطؒ نے دیا تھا؛ اس لیے جزیرۃ العرب میں اس کا شیوع ہونے لگا؛ لیکن اکثر فقہاء وعلماء اس کے عدمِ جواز کے قائل ہیں، تفصیل کے لیے (جدید کتب مسائل اور فتاویٰ سے رجوع کیا جاسکتا ہے)۔

موضعِ حاجت میں تصویر:

اب چونکہ موجودہ دَور کے فقہاء کے درمیان کیمرہ کی تصویر کے سلسلہ میں اختلاف پیدا ہوگیا ہے جس سے اس میں کچھ نہ کچھ ظنیت آگئی ہے، لہٰذا بوقتِ ضرورت پاسپورٹ اور آئی ڈی وغیرہ کے لیے تصویر بنوانے کی فقہاء نے اجازت دی ہے۔

مَالِكٌ عَنْ إِسْحَاقَ بْنِ عَبْدِ اللهِ بْنِ أَبِي طَلْحَةَ [illegible] إِسْحَاقَ مَوْلَى

الشِّفَاءِ أَنَّهُ قَالَ دَخَلْتُ أَنَا وَعَبْدُ اللهِ بْنُ أَبِي طَلْحَةَ عَلىٰ أَبِي سَعِيْدٍ الْخُدْرِيِّ نَعُوْدُهُ فَقَالَ لَنَا أَبُوْ سَعِيْدٍ أَخْبَرَنَا رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّ الْمَلَائِكَةَ لَا تَدْخُلُ بَيْتًا فِيْهِ تَمَاثِيْلُ أَوْ تَصَاوِيْرُ شَكَّ إِسْحَاقُ لَايَدْرِيْ أَيَّتَهُمَا قَالَ أَبُوْ سَعِيْدٍ.

ترجمہ: شفاء کے غلام رافع بن اسحاق بیان کرتے ہیں کہ میں اور عبداللہ بن ابی طلحہ حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کے پاس ان کی عیادت کے لیے گئے، تو حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ نے ہم سے فرمایا: ہم کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی کہ فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کوئی تصویر ہو، اسحاق کو شک ہے، وہ نہیں جانتے حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ نے تصویر اور تماثیل میں سے کیا کہا۔

تشریح: امام نوویؒ فرماتے ہیں: وہ فرشتے داخل نہیں ہوتے جو رحمت، برکت اور استغفار لے کر آتے ہیں، اور حفاظتی فرشتے تو ہمیشہ ہر حال میں انسان کے ساتھ رہتے ہیں۔

عَنْ عُبَيْدِ اللهِ بْنِ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُتْبَةَ بْنِ مَسْعُوْدٍ أَنَّهُ دَخَلَ عَلىٰ أَبِي طَلْحَةَ الْأَنْصَارِيِّ يَعُوْدُهُ قَالَ فَوَجَدَ عِنْدَهُ سَهْلَ بْنَ حُنَيْفٍ فَدَعَا أَبُوْطَلْحَةَ إِنْسَانًا فَنَزَعَ نَمَطًا مِّنْ تَحْتِهِ فَقَالَ لَهُ سَهْلُ بْنُ حُنَيْفٍ لِمَ تَنْزِعُهُ قَالَ لِأَنَّ فِيْهِ تَصَاوِيْرَ وَقَدْ قَالَ فِيْهَا رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَاقَدْ عَلِمْتَ قَالَ سَهْلٌ أَلَمْ يَقُلْ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَّا مَا كَانَ رَقْمًا فِيْ ثَوْبٍ قَالَ بَلىٰ وَلٰكِنَّهُ أَطْيَبُ لِنَفْسِيْ.

ترجمہ: عبیداللہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی عیادت کے لیے حاضر ہوئے، کہتے ہیں کہ انہوں نے وہاں سہل بن حنیف کو پایا، اسی دوران ابوطلحہ نے ایک شخص کو بلایا اور اپنے نیچے سے ایک چادر نکالنے کو کہا، سہل بن حنیف نے پوچھا اسے کیوں نکلوا رہے ہیں؟ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا اس میں تصویریں ہیں اور ان کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا ہے تم اسے جانتے ہو، سہل بن حنیف نے کہا: کیا نبی

صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا: ''مگر یہ کہ تصویر اور نقش کپڑے میں ہو'' (یعنی کپڑے وغیرہ میں تصویر ہو تو کوئی حرج نہیں) ابوطلحہ نے کہا ہاں! لیکن (ان سے بچنا بھی) میں اپنے لیے پسند کرتا ہوں۔

تشریح: إلا ماكان رقما في ثوب: یعنی حضرت ابوطلحہ نے چادر نکالنے کی وجہ بتائی کہ اس میں تصویریں ہیں اور تصویر کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وعید بیان فرمائی ہے، اس پر سہل رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس تصویر کی ممانعت اور وعید بیان کی ہے اس سے مراد وہ تصاویر یں ہیں جو جسم اور سایہ دار ہوں اور جو کپڑے وغیرہ پر نقش ہو وہ وعید میں داخل نہیں، اسی کو امام مالکؒ اور بعض دوسرے اسلاف نے لیا ہے۔

لیکن گزشتہ تفصیل میں اس کا جواب آچکا ہے کہ کپڑے وغیرہ پر غیر ذی روح کی تصویر کی اجازت ہے اور جاندار کی ہر قسم کی تصویر ناجائز ہے۔

لکنه أطیب لنفسي کا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے سہل بن حنیف کی بات سے اتفاق کیا کہ کپڑے وغیرہ میں غیر جاندار کی تصویر جائز ہے؛ لیکن میں ہر طرح کی تصویر سے بچنا اپنے لیے پسند کرتا ہوں۔

لغت: نَمَطٌ: چادر جمع انماط.

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا أَنَّهَا اشْتَرَتْ نُمْرُقَةً فِيْهَا تَصَاوِيْرُ فَلَمَّا رَاٰهَا رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَامَ عَلَى الْبَابِ وَلَمْ يَدْخُلْ فَعَرَفَتِ الْكَرَاهَةَ فِيْ وَجْهِهِ وَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللهِ! أَتُوْبُ إِلَى اللهِ وَرَسُوْلِهِ مَا ذَا أَذْنَبْتُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا بَالُ هٰذِهِ النُّمْرُقَةِ قَالَ اشْتَرَيْتُهَا لَكَ تَقْعُدُ عَلَيْهَا وَتُوَسِّدُهَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ أَهْلَ هٰذِهِ الصُّوَرِ يُعَذَّبُوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يُقَالُ لَهُمْ أَحْيُوْا مَا خَلَقْتُمْ ثُمَّ قَالَ إِنَّ الْبَيْتَ الَّذِيْ فِيْهِ هٰذِهِ الصُّوَرُ لَا تَدْخُلُهُ الْمَلٰئِكَةُ.

ترجمہ: اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک چھوٹا تکیہ خریدا جس میں تصویریں تھیں (آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب تشریف لائے) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دیکھا تو دروازہ پر کھڑے ہوگئے اور اندر داخل نہیں ہوئے، پس حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور پر ناراضگی کے آثار دیکھ لیے، اور کہا میں اللہ اور اس کے رسول کے سامنے توبہ کرتی ہوں، (آپ مجھے بتلا دیجیے) مجھ سے کیا گناہ ہوگیا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اس وسادہ کا کیا معاملہ ہے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا یہ میں نے آپ کے لیے خریدا ہے کہ آپ اس پر بیٹھیں اور اسے بطور تکیہ لگائیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ان تصویر والوں کو قیامت کے دن عذاب دیا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا جو تم نے پیدا کیا ہے اسے زندہ کرو، پھر مزید فرمایا جس گھر میں یہ تصویر ہوتی ہیں فرشتے اس میں داخل نہیں ہوتے۔

تشریح: اس روایت سے صاف پتہ چلتا ہے کہ تصویر کشی مطلقاً ممنوع ہے، خواہ کپڑے پر ہو یا جسم اور مجسد ہو۔

أحيوا ما خلقتم: حافظ ابنِ حجرؒ فرماتے ہیں: یہ امر تعجیز ہے یعنی وہ اپنی بنائی ہوئی تصویر کے اندر روح پھونکنے پر قادر نہیں ہوسکتا، لہٰذا اس کو مستقل عذاب دیا جاتا رہے گا۔

ترکیب: تقعد عليها جملہ مستانفہ ہے جو نمرقہ کے خریدنے کے سبب کو بتا رہا ہے۔

لغت: نُمْرَقة جمعه نمارق، وسادة صغيرة.

مَا جَاءَ فِيْ أَكْلِ الضَّبِّ

(گوہ کھانے کا بیان)

گوہ: چھپکلی کی شکل کا رینگنے والا ایک جانور ہے، جو جسم میں چھپکلی سے بڑا ہوتا ہے، اس کا مسکن پہاڑ اور درختوں کے کھوکھلے تنے ہوتے ہیں۔

گوہ کھانا جائز ہے یا نہیں یہ مختلف فیہ اور معرکۃ الآراء مسئلہ ہے: ائمہ ثلاثہؒ کے نزدیک گوہ حلال ہے اور حنفیہ کے نزدیک حرام ہے؛ لیکن احناف میں سے امام طحاویؒ جواز کے قائل ہیں، اور علامہ عینیؒ نے شرح بخاری میں مکروہِ تنزیہی ہونے کو ترجیح دی ہے، علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے فرمایا: محدثین احناف مکروہِ تنزیہی (خلافِ اولیٰ) سمجھتے ہیں اور فقہائے احناف حرام قرار دیتے ہیں، فتویٰ حرام ہونے پر ہے۔

ائمہ ثلاثہؒ کی دلیل باب میں مذکور روایت ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لست بأكل وبمحرمه".

(۲) ترمذی شریف میں ہے: "سئل عن أكل الضب؟ فقال: "لا آكله ولا أحرّمه". (ترمذی: ۱/۲)

(۳) باب کی ایک روایت میں ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تو گوہ کو نہیں کھایا؛ لیکن عبداللہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے فرمایا: کھاؤ۔

(۴) مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چند صحابہ رضی اللہ عنہم تھے اور گوہ کا گوشت لایا گیا، ازواجِ مطہرات میں سے کسی نے آواز دے کر کہا: یا رسول اللہ! یہ گوہ کا گوشت ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "كلوا فإنه حلال ولكنه ليس من طعامي".

حرمت کے دلائل:

(۱) عن عبد الرحمٰن بن شبل أن النبي صلى الله عليه وسلم نهى عن أكل لحم الضب. (أبوداؤد) قال الحافظ اسناده حسن.

عن عائشة رضي الله عنها أنه اهدي لها ضب فسألت النبي صلى الله عليه وسلم عن أكله فنهاها عنه فجاء سائل فأرادت أن تطعمه إياه فقال صلى الله عليه وسلم أتطعمينه مالا تأكلين؟ قال الإمام محمد

دل ذلك على كراهته لنفسه ولغيره، وقال وبه نأخذ وهو قول أبي حنيفة. (كتاب الآثار للإمام محمد الشيباني)

ان روایات کے علاوہ یہ بات طے ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے گوہ کبھی نہیں کھائی اور مختلف موقعوں پر اس کی مختلف وجہ بیان فرمائی، مثلاً کبھی فرمایا: ہمارے علاقہ میں گوہ نہیں ہوتی؛ اس لیے مجھے پسند نہیں، اور کبھی فرمایا کہ شاید بنی اسرائیل کی ایک قوم اسی جانور کی شکل میں مسخ کی گئی ہے اور شاہ ولی اللہؒ نے فرمایا: جب مسخ ہوتا ہے حرام جانور کی شکل میں ہوتا ہے، اور کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تقذّراً نہیں کھائی اور کبھی یہ وجہ بیان فرمائی کہ میرے پاس کسی بھی وقت فرشتہ آجاتا ہے، اور میں اس کو نہیں کھاتا؛ کیونکہ اس میں بُو آتی ہے۔ (تحفۃ الالمعی: ۵/ ۱۳۴)

پھر حافظ ابنِ حجرؒ نے تطبیق دی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع میں مسخ کے احتمال کی وجہ سے ممانعت فرمائی اور اسی زمانہ میں ہانڈیاں الٹوادیں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے توقف فرمایا یعنی نہ کھایا نہ منع فرمایا، پھر جب یہ بات سامنے آئی کہ مسخ شدہ لوگوں کی نسل باقی نہیں رہتی تو کھانے کی اجازت مرحمت فرمائی؛ مگر پھر بھی نہ کھاتے اور نہ حرام قرار دیتے تھے، پس گوہ کو کھانا جائز ہوا اور جس کو گھن آئے اس کے لیے نہ کھانا اولیٰ ہے۔

(فتح الباری: ۹/ ٦٦٦)

اس کے برعکس شیخ خلیل احمدؒ نے اس طرح تطبیق دی ہے کہ پہلے آپ صلی اللہ علیہ نے اباحتِ اصلیہ کی بنا پر اجازت دی اور گھن آنے کی وجہ سے خود نہیں کھائی اور نہ کھانے کی مختلف وجوہات بیان کیں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جواز میں تردد ہوا، پھر آخر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی ممانعت کردی، پس حرام ہوگئی۔ (بذل المجہود)

اور حنفیہ کی اس تطبیق میں چند اُصول ملحوظ ہیں:

(۱) جب مبیح ومحرم روایات میں تعارض ہوتا ہے تو ترجیح محرم کو ہوتی ہے۔

(۲) قرآنِ کریم میں طیب کو کھانے کا حکم ہے اور خبیث سے بچنے کا اور احنافؒ

خبیث وطیب کے سلسلہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذوق کا اعتبار کرتے ہیں؛ چنانچہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تقذّر محسوس کیا تو اس کو خبیث قرار دے دیا گیا۔

نیز گوہ حشرات الارض میں سے بھی ہے اور ان کا کھانا حرام ہے۔

(تحفۃ الالمعی: ۵/ ۱۳۷)

عَنْ سُلَيْمَانَ ابْنِ يَسَارٍ أَنَّهُ قَالَ دَخَلَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْتَ مَيْمُوْنَةَ بِنْتِ الْحَارِثِ فَإِذَا ضِبَابٌ فِيْهَا بَيْضٌ وَمَعَهُ عَبْدُ اللهِ بْنُ عَبَّاسٍ وَخَالِدُ بْنُ الْوَلِيْدِ فَقَالَ مِنْ أَيْنَ لَكُمْ هٰذَا فَقَالَ أَهْدَتْهُ لِيْ أُخْتِيْ هُزَيْلَةُ بِنْتُ الْحَارِثِ فَقَالَ لِعَبْدِ اللهِ بْنِ عَبَّاسٍ وَخَالِدِ بْنِ الْوَلِيْدِ كُلَا فَقَالَ أَوَلَا تَأْكُلُ أَنْتَ يَارَسُوْلَ اللهِ فَقَالَ إِنِّيْ تَحْضُرُنِيْ مِنَ اللهِ حَاضِرَةٌ قَالَتْ مَيْمُوْنَةُ أَنَسْقِيْكَ يَا رَسُوْلَ اللهِ مِنْ لَّبَنٍ عِنْدَنَا؟ فَقَالَ نَعَمْ. فَلَمَّا شَرِبَ قَالَ مِنْ أَيْنَ لَكُمْ هٰذَا؟ فَقَالَتْ أَهْدَتْهُ لِيْ أُخْتِيْ هُزَيْلَةُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَرَأَيْتَكِ جَارِيَتَكِ الَّتِيْ كُنْتِ اسْتَأْمَرْتِنِيْ فِيْ عِتْقِهَا أَعْطِيْهَا أُخْتَكِ وَصِلِيْ بِهَا رَحِمَكِ تَرْعٰى عَلَيْهَا فَإِنَّهُ خَيْرٌ لَّكِ.

ترجمہ وتشریح: سلیمان بن یسار رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اُم المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا بنتِ حارث کے گھر تشریف لے گئے، جلد ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کھانا پیش کیا گیا جس میں گوہ اور انڈے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بھی تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے معلوم کیا کہ یہ کھانا تمہارے پاس کہاں سے آیا ہے؟ (علامہ باجیؒ کہتے ہیں تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ ہدیہ کا ہے یا صدقہ کا)، (اور حافظ ابنِ حجرؒ فرماتے ہیں: سوال کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اکثر وہ لوگ جو دیہاتوں میں رہتے ہیں انہیں بہت سے حیوانات کا علم نہیں ہوتا اور جب کسی جانور کا بھون لیا جاتا ہے تو اس میں تمیز کرنا سوال کیے بغیر مشکل ہو جاتا ہے) اور جب حضرت میمونہ رضی

اللہ عنہا نے جواب دیا کہ یہ میری بہن ہزیلہ نے مجھے ہدیہ کیا ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابنِ عباس رضی اللہ عنہما اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے فرمایا: تم دونوں اس کو کھالو، دونوں نے دریافت کیا یا رسول اللہ! کیا آپ نہیں کھائیں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میرے پاس اللہ تعالیٰ کے پاس سے فرشتہ آتا ہے (مازری کہتے ہیں کہ شاید گوہ کے گوشت میں کوئی بُو ہوگی لہسن پیاز کی طرح؛ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانا چھوڑ دیا، اور اس طرح کی بوئیں فرشتوں کو پسند نہیں ہیں)۔

حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا پھر دریافت کرتی ہیں ہمارے پاس دودھ ہے کیا آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پلائیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جی ہاں! (میں دودھ پیوں گا)۔

پھر جب دودھ نوش فرما چکے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ دودھ تمہارے پاس کہاں سے آیا؟ (ضب کے سلسلہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حصول کا سوال پہلے کیا؛ اس لیے گوہ کا ہدیہ معروف نہیں تھا اور دودھ کے بارے میں نوش فرمانے کے بعد سوال کیا؛ کیونکہ ہدیۂ لبن معتاد تھا اور یہ سوال بدلہ کے لیے تھا)، حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: یہ دودھ بھی میری بہن کی طرف سے ہدیۃً آیا ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے معلوم کیا کہ تمہارا اس باندی کے بارے میں کیا خیال ہے جس کے آزاد کرنے کے سلسلہ میں تم مجھ سے مشورہ کررہی تھیں؟ یعنی کیا تمہارا خیال ہے کہ تم اسے اپنی بہن کو دے دو صلہ رحمی کے طور پر، وہ تمہاری بہن کا خیال رکھے گی؛ اس لیے یہ تمہارے لیے آزاد کرنے سے بہتر ہے۔

یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ غلام باندی کو آزاد کرنا بہتر ہے یا صلہ رحمی کرنا؟

ابنِ بطالؒ فرماتے ہیں ذی رحم کو کوئی چیز ہدیہ کرنا آزادی سے افضل ہے؛ لیکن بہتر بات یہ ہے کہ دونوں عمل اختلافِ احوال کے اعتبار سے افضل اور غیر افضل ہوجاتے ہیں، مثلاً آپ کے کسی قریبی کو شدتِ ضعف کی وجہ سے خادم کی سخت ضرورت ہو اس وقت صلہ رحمی کے طور پر ہدیہ دینا زیادہ افضل ہے، اور عمومی حالت میں عتق زیادہ بہتر ہے

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنْ خَالِدِ بْنِ الْوَلِيْدِ بْنِ الْمُغِيْرَةِ أَنَّهُ دَخَلَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْتَ مَيْمُوْنَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأُتِيَ بِضَبٍّ مَحْنُوْذٍ فَأَهْوٰى إِلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِيَدِهِ فَقَالَ بَعْضُ النِّسْوَةِ اللَّاتِيْ فِيْ بَيْتِ مَيْمُوْنَةَ أَخْبِرُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَا يُرِيْدُ أَنْ يَّأْكُلَ مِنْهُ فَقِيْلَ هُوَ ضَبٌّ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَرَفَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدَهُ فَقُلْتُ أَحَرَامٌ هُوَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ فَقَالَ لَا. وَلٰكِنَّهُ لَمْ يَكُنْ بِأَرْضِ قَوْمِيْ فَأَجِدُنِيْ أَعَافُهُ قَالَ خَالِدٌ فَاجْتَرَرْتُهُ فَأَكَلْتُهُ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْظُرُ.

ترجمہ وتشریح: حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر آئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھونی ہوئی گوہ پیش کی گئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک اس کی طرف بڑھایا تو کچھ عورتیں جو اس وقت حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے پاس موجود تھیں انہوں نے کہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم جس چیز کو تناول فرمانا چاہتے ہیں اس کے بارے میں بتادو (بخاری میں ہے بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کھانے کا نام جانے بغیر اپنا دست مبارک اس کی طرف بڑھاتے ہوں) حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے بتایا یارسول اللہ! یہ گوہ ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ اٹھالیا، خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ! کیا یہ حرام ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں؛ لیکن یہ میری قوم کی زمین میں نہیں ہوتی؛ اس لیے میں اس کا کھانا ناپسند کرتا ہوں۔

(یہاں اعتراض ہوسکتا ہے کہ حجاز مقدس میں گوہ کثرت سے ہوتی ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کیوں فرمایا: میری قوم کے علاقہ میں نہیں ہوتی؟

حافظ ابن حجرؒ نے جواب دیا ہے کہ: قوم سے مراد قریش اور علاقہ سے مراد صرف مکہ ہے اور مکہ میں نہ ہونے سے پورے عرب کی نفی نہیں ہوتی)

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا اور اسے کھانے لگا، اسی دوران کہ آپ مجھے دیکھ رہے تھے۔

لغت: حنذ (ض) حنذاً گوشت بھوننا۔

أعاف: کراہت کی وجہ سے کسی چیز کو کھانا چھوڑنا۔

اجتررته: أي جذبته.

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ أَنَّ رَجُلًا نَادىٰ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللهِ مَا تَرىٰ فِي الضَّبِّ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَسْتُ بِاٰكِلِهِ وَلَا بِمُحَرِّمِهِ.

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پکارا اور دریافت کیا: یا رسول اللہ! آپ گوہ کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟ (اس کو کھایا جائے یا نہیں) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب عنایت فرمایا: نہ میں اسے کھاتا ہوں اور نہ حرام قرار دیتا ہوں۔

مَا جَاءَ فِيْ أَمْرِ الْكِلَابِ
(کتوں کے متعلق احکام)

کلاب جمع ہے کلب کی۔

فقہاء ومحدثین نے کتوں کی تین قسمیں کی ہیں:

(۱) کلب عقور (کاٹنے والا) (۲) وہ کتے جو کھیتی وغیرہ کی حفاظت اور شکار کے لیے پالے جاتے ہیں (۳) وہ کتے جو مذکورہ دونوں قسموں کے علاوہ ہیں یعنی عام کتے۔

کتوں کے متعلق چند احکام:

(۱) کتا پالنا: امام نوویؒ نے فرمایا کہ بغیر ضرورت کے کتا پالنا جائز نہیں ہے؛ البتہ

شکار کرنے اور کھیتی اور مویشیوں کی حفاظت کے لیے جائز ہے، اسی کو ابنِ قدامہؒ نے "المغنی" میں ذکر فرمایا ہے؛ کیونکہ شریعت میں بلا ضرورت کتا پالنے کو نقصِ اجر کا سبب قرار دیا گیا ہے، اسی طرح کی بات عمدۃ القاری، فتاویٰ عالمگیریہ اور اجناس کے اندر ہے۔

(۲) دوسرا حکم کتوں کو قتل کرنا: مذکورہ تینوں قسموں میں سے کلبِ عقور کے قتل کرنے پر اور دو قسم کے کتوں کو قتل نہ کرنے پر ابن العربیؒ نے اجماع نقل کیا ہے۔

تیسری قسم کے بارے میں اختلاف ہے، امام مالکؒ عام کتوں کو قتل کرنے کا حکم دیتے ہیں، ان کی دلیل آئندہ باب میں آنے والی حدیث ہے، قاضی عیاضؒ نے فرمایا: یہ امام مالکؒ اور ان کے تمام اصحاب کا مذہب ہے۔

امام مالکؒ کے علاوہ تمام فقہاء و محدثین کے نزدیک بلا وجہ عام کتوں کو قتل کرنا جائز نہیں ہے اور عام کتوں کو قتل کرنے کا حکم منسوخ ہے، یہی حکم فتح القدیر اور درمختار میں نقل کیا گیا ہے۔

امام الحرمینؒ فرماتے ہیں: اوّلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام کتوں کو قتل کرنے کا حکم دیا، پھر اس حکم میں تخفیف ہوئی اور بالکل کالے کتے کو مارنے کا حکم دیا گیا، پھر اخیر میں ہر ایسے کتے کو مارنے کا حکم منسوخ ہو گیا جس میں کوئی ضرر نہ ہو خواہ کالا ہو یا اس کے علاوہ، اور ناسخ حضرت جابر رضی اللہ عنہ اور ابنِ مغفل کی حدیثیں ہیں جن کی تخریج امام مسلم نے کی ہے۔

عَنْ جَابِرَ بْنِ عَبْدِ اللهِ يَقُوْلُ أَمَرَنَا رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِقَتْلِ الْكِلَابِ حَتّٰى إِنَّ الْمَرْأَةَ تَقْدَمُ مِنَ الْبَادِيَةِ بِكَلْبِهَا فَنَقْتُلُهُ ثُمَّ نَهَى النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ قَتْلِهَا وَقَالَ عَلَيْكُمْ بِالْأَسْوَدِ الْبَهِيْمِ ذِي النُّقْطَتَيْنِ فَإِنَّهُ شَيْطَانٌ.

عَنِ ابْنِ الْمُغَفَّلِ قَالَ أَمَرَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِقَتْلِ الْكِلَابِ ثُمَّ قَالَ مَا بَالُهُمْ وَبَالُ الْكِلَابِ. (مسلم شریف:۲)

مَالِكٌ عَنْ يَزِيْدَ بْنِ خُصَيْفَةَ أَنَّ السَّائِبَ بْنَ يَزِيدَ أَخْبَرَهُ أَنَّهُ سَمِعَ سُفْيَانَ بْنَ أَبِي زُهَيْرٍ وَهُوَ رَجُلٌ مِّنْ أَزْدِ شَنُوْدَةٍ مِّنْ أَصْحَابِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُحَدِّثُ نَاسًا مَّعَهُ عِنْدَ بَابِ الْمَسْجِدِ فَقَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنِ اقْتَنٰى كَلْبًا لَا يُغْنِيْ عَنْهُ زَرْعًا وَلَا ضَرْعًا نَّقَصَ مِنْ عَمَلِهِ كُلَّ يَوْمٍ قِيْرَاطٌ قَالَ أَنْتَ سَمِعْتَ هٰذَا مِنْ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِيْ وَرَبِّ هٰذَا الْمَسْجِدِ.

ترجمہ: حضرت سائب بن یزیدؒ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے قبیلۂ ازدشنوءۃ کے سفیان بن ابی زہیر نامی ایک شخص جو صحابی رسول ہیں، لوگوں سے بیان کرتے ہوئے سنا مسجد کے دروازہ پر: انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص ایسا کتا پالے جو اس کی کھیتی کے بھی کام نہ آئے اور نہ اس کے مویشیوں کے بھی تو اس کے عمل میں سے روزانہ ایک قیراط کی مقدار ثواب کم ہوجاتا ہے، سائب بن یزید نے تاکیداً دریافت کیا کہ کیا تم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سنی ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا: جی ہاں! اس مسجد کے رب کی قسم!

تشریح: کتوں کے متعلق کچھ احکام شروع باب میں گزر گئے ہیں، یہاں مزید چند بحثیں ہیں۔

(۱) حدیث پاک میں بلاضرورت کتا پالنے والوں کے لیے وعید بیان کی گئی ہے کہ ایسے لوگوں کے نامۂ اعمال سے اجر وثواب کم ہونے لگتا ہے۔ قیراط کیا ہے؟ صاحبِ محلی نے فرمایا: قیراط اصل میں دانق کو کہتے ہیں اور یہاں اس سے مراد ایک متعین مقدار ہے جو اللہ کو معلوم ہے، یہی بات علامہ باجی نے بیان فرمائی ہے۔

(۲) نقص اجر سے کیا مراد ہے؟ اور کون سے عمل سے کم ہوگا؟ تو حافظ ابنِ حجرؒ نے اس بارے میں فرمایا: ممکن ہے کہ کتے پالنے والے کو کسی ایسے عمل کی توفیق نہ ہو جس کا ثواب ایک قیراط ہوسکتا تھا، یا یہ بھی مراد ہوسکتا ہے کہ کتے کو پالنے کیوجہ سے جو گناہ حاصل

ہوا ہے وہ ایک قیراط کو پہنچ جائے، پھر اس کے ثواب میں سے اسی قدر کم کر دیا جائے، ابن التین بیان کرتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اگر کتا نہ پالتا تو اس کا عمل کامل ہوتا اور اس کے پالنے کی وجہ سے ناقص رہ گیا۔

(۳) نقص اجر کا سبب کیا ہے؟ امام نوویؒ فرماتے ہیں: علماء نے مختلف وجوہات بیان کی ہیں:

بعض کی رائے یہ ہے کہ کتے کے گھر میں ہونے کی وجہ سے ملائکہ کا دخول ممتنع ہو جاتا ہے اور بعض شراح نے فرمایا؛ کیونکہ وہ گزرنے والوں کو تکلیف پہنچاتا ہے اور ان کے پیچھے لگ جاتا ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اس حکم سے نہ رکنے کی سزا ہے جس میں کتے کو پالنے کی ممانعت ہے، ایک قول یہ بھی ہے کہ جب کتا گھر میں ہوگا تو غفلت کے وقت برتن میں منھ ڈال سکتا ہے اور مالک کو معلوم نہ ہو سکے گا؛ حالانکہ اس کا جھوٹا ناپاک ہے، اسی طرح کی وجہ حافظ ابنِ حجرؒ نے بیان فرمائی ہے۔

اور شاہ ولی اللہؒ نے ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں کتا پالنے کی ممانعت کی حکمت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''والسر في ذلك أنه يشبه الشيطان بجبلته لأن ديدنه لعب وغضب، وإطراح في النجاسات، وإيذاء الناس، ويقبل الإلهام من الشياطين فرأى منهم صدوداً وتهاوناً''. (حجۃ اللہ: ۱/ ۱۸۵)

(۴) اب بحث یہ ہے کہ اس حدیث میں ''قیراط'' ہے اور آگے آنے والی حدیث میں قیراطان تثنیہ ہے، اس کی مختلف توجیہہ کیگئی ہیں: (۱) یہ دو طرح کے کتوں کے بارے میں ہے جو زیادہ تکلیف دہ ہے اس کے پالنے سے دو قیراط کم ہوں گے اور جو اس کے مقابلہ میں کم ہے اس سے ایک، یا پھر مقامات کے اعتبار سے ہے، مثلاً مدینہ منورہ زیادہ افضل ہے اس میں دو قیراط اور بقیہ مقامات میں ایک قیراط کم ہوگا یا یہ دو زمانوں کا حکم ہے، پہلے ایک کا حکم آیا بعد میں حکم میں سختی سے کام لیا گیا۔

پھر بعض علماء نے فرمایا: ایک قیراط عملِ نہار سے کم ہوگا اور عملِ لیل سے، یا ایک قیراط فرائض سے اور ایک نوافل سے؛ لیکن صحیح یہ ہے کہ ان چیزوں کو طے کرنا مشکل ہے؛

کیونکہ یہ ایک توقیفی چیز ہے جس کی صحیح مقدار اور محل نقص صرف باری تعالیٰ کو معلوم ہے۔
(تکملہ فتح الملہم: ۱/ ۴۹۴، ۹۵)

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنِ اقْتَنٰى كَلْبًا إِلَّا ضَارِيًا أَوْ كَلْبَ مَاشِيَةٍ نَقَصَ مِنْ عَمَلِهٖ كُلَّ يَوْمٍ قِيْرَاطَانِ.

ترجمہ: حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص کتا پالے سوائے شکاری اور مویشیوں (کی حفاظت کے کتے) کے تو اس کے عمل سے روزانہ دو قیراط کم ہو جاتے ہیں۔

لغت: ضاريًا أي معلمًا للصيد معتاداً له، يقال ضري الكلب يضري كشرب يشرب، ضرى وضراوة، عوده بكلبه.

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَمَرَ بِقَتْلِ الْكِلَابِ.

ترجمہ: عبداللہ ابنِ عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتوں کو قتل کرنے کا حکم دیا ہے۔

نوٹ: تشریح باب کے آغاز میں مذکور ہے۔

مَا جَاءَ فِيْ أَمْرِ الْغَنَمِ

(بکریوں کا بیان)

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ رَأْسُ الْكُفْرِ نَحْوَ الْمَشْرِقِ وَالْفَخْرُ وَالْخُيَلَاءُ فِيْ أَهْلِ الْخَيْلِ وَالْإِبِلِ وَالْفَدَّادِيْنَ أَهْلِ الْوَبَرِ وَالسَّكِيْنَةُ فِيْ أَهْلِ الْغَنَمِ.

ترجمہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اصل کفر مشرق کی طرف ہے اور فخر وتکبر گھوڑے اور اونٹ والے اور فدادین دیہاتیوں میں ہوتا ہے اور سکون وقار بکری پالنے والوں میں ہوتا ہے۔

تشریح: رأس الكفر نحو المشرق: مشرق سے مراد فارس اور دوسرے عجمی علاقے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ان علاقہ کے لوگوں میں کفر کی شدت تھی؛ کیونکہ ان کے پاس نہ کوئی شریعت تھی اور نہ کوئی کتاب اور انہوں نے اپنے شدتِ کفر کے سبب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خط مبارک کو پھاڑ دیا اور انہیں علاقوں میں جنگِ جمل، صفین وغیرہ ہوئیں جن میں بہت سارے مسلمان شہید ہو گئے۔

اور رأس الکفر سے مراد فتنہ ہو تو اس سے مراد دجال ہے؛ کیونکہ اس سے بڑا کوئی فتنہ نہیں ہے اور دوسری احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ مشرق کی طرف سے نکلے گا۔

والفخر والخيلاء في أهل الخيل: اور اپنے مال و دولت اور نسب حسب کا مظاہرہ کرنا اور تکبر و بڑائی دکھانا ان لوگوں میں ہوتا ہے جن کے پاس گھوڑے اور اونٹوں کی کثرت ہوتی ہے اور وہ فدادین ہیں، فداد کہتے ہیں تیز آواز نکالنے والے کو اور یہاں مراد ہے وہ لوگ ہیں جو اپنے جانوروں کو ہانکنے کے لیے آواز نکالتے ہیں یا فداد ہل چلانے والے کو کہتے ہیں اہلِ وبر کہتے ہیں جن کے پاس کچے گھر ہوتے ہیں مراد دیہاتی ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جن کے پاس اونٹ، گھوڑوں کی کثرت ہوتی ہے، مزید یہ کہ وہ ہروقت اپنے کھیتوں میں مشغول رہتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے دل سخت ہوجاتے ہیں اور ان کو علم وحکمت سے کوئی تعلق نہیں رہتا ان میں اپنی کثرتِ مال کی وجہ سے فخر وریا اور تکبر و بڑائی داخل ہوجاتی ہے اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی مذمت فرمائی ہے۔

والسكينة في أهل الغنم: حافظ ابنِ حجرؒ فرماتے ہیں: اہلِ غنم میں سکون ووقار کی بات اس لیے کہی گئی ہے؛ کیونکہ ان کے پاس اہلِ وبر اور دیہاتیوں کی طرح مال کا توسع اور کثرت نہیں ہوتی جو فخر و تکبر کا سبب ہے۔

اور بعض علماء نے فرمایا تمام جانوروں کو چھوڑ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بکری والوں کو سکون، وقار اور تواضع سے متصف کرنے کی وجہ، لوگوں کو تواضع پر اُبھارنا ہے کہ

بکری ایک کم قیمت، سیدھا، اطمینان والا جانور ہے جس کے پالنے سے دل میں بڑائی پیدا نہیں ہوتی۔

واضح رہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کثیر اونٹ والوں کو متکبر اور بکری کو متواضع قرار دیا ہے، یہ قاعدۂ کلیہ نہیں؛ بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اکثر لوگوں کے احوال کو بتلایا ہے۔

عَنْ أَبِيْ سَعِيْدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَنَّهُ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُوْشِكُ أَنْ يَّكُوْنَ خَيْرُ مَالِ الْمُسْلِمِ غَنَمًا يُّتْبِعُ بِهَا شَعَفَ الْجِبَالِ وَمَوَاقِعَ الْقَطْرِ يَفِرُّ بِدِيْنِهِ مِنَ الْفِتَنِ.

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: وہ زمانہ جلد آرہا ہے کہ مسلمان کا بہترین مال وہ بکریاں ہوں گی جن کو وہ لیے پھرے گا پہاڑ کی چوٹیوں پر اور بارش کی جگہوں پر، وہ اپنا دین لے کر فتنوں سے بھاگے گا۔

تشریح: اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بطورِ پیشین گوئی یہ بات فرمائی ہے کہ بہت جلد وہ زمانہ آرہا ہے کہ فتنوں کا ایسا غلبہ ہوگا کہ شہر اور گاؤں میں رہنا دشوار ہوجائے گا، آدمی مجبور ہوکر پہاڑوں کی چوٹیوں پر اور بیابانوں میں ٹھکانہ تلاش کرے گا۔

أن يكون خير مال المسلم غنم: آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان فتنوں کے وقت میں مسلمان کا سب سے بہترین مال بکری ہوگی؛ کیونکہ جب انسان فتنوں کے خوف سے پہاڑوں اور وادیوں میں رہائش اختیار کرے گا تو اسے زندگی گزارنے کے لیے جب کھانے پینے کی ضرورت ہوگی تو بکری کا دودھ پی کر گزارا کرلے گا اور چونکہ دوسرے جانوروں کے مقابلہ میں ایسے مقامات پر بکری کو لے جانا آسان ہے یا پھر مطلب یہ ہے کہ جس کے پاس بکری ہوگی وہ فتنوں میں کم سے کم مبتلا ہوگا؛ کیونکہ اکثر و بیشتر بکری ان کے پاس ہوتی ہے جن کے پاس مال پیسہ کم ہوتا ہے اور مال کی قلت، قلتِ فتنہ کا سبب ہے؛ کیونکہ مال ہی سب سے بڑا فتنہ ہے۔

سوال: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ تنہائی اختیار کرنے میں دین کی حفاظت ہے تو تنہائی اختیار کرنا بہتر ہے یا لوگوں کے درمیان رہنا؟

جواب: حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا: اس میں اختلاف ہے:

جمہور کا مسلک یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ اختلاط زیادہ بہتر ہے؛ اس لیے لوگوں کے درمیان رہ کر دینی علوم حاصل کیے جاسکتے ہیں اور دوسروں کو سکھائے جاسکتے ہیں، نیز اختلاط سے مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے اسی سے شعائرِ اسلام کا قیام ہوتا ہے جبکہ بعض لوگوں کے نزدیک عزل اور تنہائی بہتر ہے۔

اور امام نوویؒ فرماتے ہیں اگر اختلاطِ ناس سے گناہ میں پڑنے کا غالب گمان نہ ہو تو مخالطت بہتر ہے؛ ورنہ تنہائی بہتر ہے اور بعض مشائخ نے فرمایا مذکورہ حکم افراد واوقات اور زمانہ کے اعتبار سے بدلتا رہے گا۔

لغات: شعف الجبال: پہاڑ کی چوٹی۔

مواقع القطر: پہاڑوں کے درمیان وادیاں اور درّے جہاں پانی بہتا ہے۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَا يَحْتَلِبَنَّ أَحَدٌ مَاشِيَةَ أَحَدٍ بِغَيْرِ إِذْنِهِ أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يُؤْتَىٰ مَشْرُبَتُهُ فَتُكْسَرَ خِزَانَتُهُ فَيُنْقَلَ مِنْهُ طَعَامُهُ وَإِنَّمَا تَخْزِنُ لَهُمْ ضُرُوْعُ مَوَاشِيْهِمْ أَطْعِمَاتِهِمْ فَلَا يَحْتَلِبَنَّ أَحَدٌ مَاشِيَةَ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِهِ.

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کوئی شخص کسی دوسرے کے جانور کا دودھ اس کی اجازت کے بغیر نہ دوہے کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ اس کے گھر میں آیا جائے، پس اس کی الماری کو توڑ دیا جائے اور اس میں سے اس کا غلہ منتقل کیا جائے، لوگوں کے لیے ان کے چوپایوں کے تھن ہی ان کے کھانے جمع کر کے رکھتے ہیں، لہٰذا ہرگز نہ دوہے کوئی کسی کے جانور کو؛ مگر اس کی اجازت سے۔

تشریح: یہ حدیث امام بخاریؒ نے کتاب اللقطہ میں ذکر کی ہے اور اس کا مقصد

اس بات کی وضاحت کرنا ہے کہ اگر کسی کا جانور کہیں گھومتا مل جائے تو اس کے تھنوں میں سے دودھ دوہ لینا لقطہ نہیں ہے؛ بلکہ چوری ہے اور اس کو ایک مثال سے سمجھایا ہے:

ایک شخص نے اپنے کمرہ کی ایک الماری میں غلہ رکھا ہوا ہے، پس اگر اس کمرہ میں گھس کر اس الماری کا تالا وغیرہ توڑ کر غلہ لے کر چلا جائے تو اس کو کوئی پسند نہیں کرتا اور اسے چوری کہا جاتا ہے، اسی طرح لوگوں کے جانوروں کے تھنوں میں ان کے طعام جمع ہیں، پس ان کی اجازت کے بغیر ان کو دوہ لینا چوری شمار ہوگی۔

علامہ ابن عبدالبرؒ فرماتے ہیں: اس حدیث میں اس بات کی تنبیہ کی گئی ہے کہ کوئی شخص دوسرے شخص کی چیز بغیر اجازت کے نہ لے اور خاص طور پر دودھ کو اس لیے ذکر فرمایا؛ کیونکہ اس کو انسان معمولی سمجھتا ہے اور تساہل برتتا ہے؛ اس لیے واضح فرمادیا کہ دودھ کی چوری بھی غلہ جات کی چوری کی طرح ہے۔

تاہم اجازت عام ہے، خواہ صراحۃً ہو یا دلالۃً ہو، اور جن لوگوں کے سامان کو بغیر اجازت لیا جاسکتا ہے اس کی تفصیل سورۂ نور میں موجود ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: مذکورہ حکم حالتِ اضطرار کے علاوہ ہے، پس مضطر کے لیے بلا اجازت دودھ دوہنے کی اجازت ہوگی۔

لغات: مشربة: میم کے فتحہ اور راء کے ضمہ اور زیر کے ساتھ: بالاخانہ۔ خِزانة: سامان رکھنے کی جگہ۔

اطعمات اطعمة کی جمع: مراد دودھ۔

مَالِكٌ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وسَلَّمَ قَالَ مَامِنْ نَبِيٍّ إِلَّا وَقَدْ رَعٰى غَنَمًا قِيْلَ أَنْتَ يَا رَسُوْلَ اللهِ قَالَ وَأَنَا.

ترجمہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہر نبی نے بکریاں چرائی ہیں، عرض کیا گیا اے اللہ کے رسول! آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بھی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: ہاں! میں نے بھی۔

تشریح: حافظ ابنِ حجرؒ فرماتے ہیں: انبیاء کو نبوت دیے جانے سے پہلے بکریاں چرانے کا الہام کیے جانے میں حکمت یہ ہے کہ تاکہ ان کو اس عہدہ اور ذمہ داری کی مشق ہو جائے جو ان کو امت کے سلسلہ میں دی جائے گی، اس کے لیے بکریوں کے ساتھ رہنے سے شفقت اور بردباری پیدا ہوگی؛ کیونکہ جب جانور اِدھر اُدھر بکھر جاتے ہیں اور آپس میں لڑتے ہیں یا کوئی درندہ یا چور ان کو اٹھا لیتا ہے تو صبر وتحمل سے کام لینا پڑتا ہے، نیز طبائع کے اختلاف کی پہچان اور جانوروں کی کڑی نگرانی اور ان سے الفت ومحبت بکری کے پالنے سے پیدا ہوتی ہے، یہی تمام چیزیں ایک اچھے رہنما میں بھی ہونی چاہئیں؛ تاکہ وہ اپنی امت کے ساتھ بہتر طریقہ سے معاملہ کر سکے، پس اسی لیے اللہ نے انبیاءِ کرام علیہم السلام کو بکریاں چرانے کا الہام کیا۔

مَا جَاءَ فِي الْفَارَةِ تَقَعُ فِي السَّمْنِ وَالْبَدْءِ بِالْأَكْلِ قَبْلَ الصَّلٰوةِ

(گھی، تیل وغیرہ میں چوہے کے گر جانے اور نماز سے عین قبل کھانا شروع کرنے کا بیان)

عَنْ نَافِعٍ أَنَّ ابْنَ عُمَرَ كَانَ يُقَرَّبُ إِلَيْهِ عَشَاءُهُ فَيَسْمَعُ قِرَاءَةَ الْإِمَامِ وَهُوَ فِي بَيْتِهِ فَلَا يَعْجَلُ عَنْ طَعَامٍ حَتّٰى يَقْضِيَ حَاجَتَهُ مِنْهُ.

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا رات کا کھانا لگا دیا جاتا تھا اور وہ اپنے گھر سے امام کی قراءت سنتے رہتے تھے، پھر بھی وہ کھانے کو جلدی جلدی ختم نہیں کرتے تھے، یہاں تک کہ اپنی حاجت پور کر لیں۔

تشریح: جمہور فقہاء وعلماء فرماتے ہیں: جب دسترخوان پر کھانا لگا دیا جائے اور کوئی شخص کھانا شروع کر دے اتنے میں جماعت کھڑی ہو جائے تو چاہیے کہ اطمینان سے کھانا کھا لے، پھر نماز ادا کرے۔ جمہورؒ کے نزدیک ایسا کرنا مستحب ہے، تاہم اگر کھانا

چھوڑ کر نماز پڑھ لے تو کوئی حرج نہیں ہے، جبکہ ظاہریہ کے نزدیک اگر کھانا چھوڑ کر نماز ادا کر لی گئی تو نماز باطل ہو جائے گی۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: کھانا سامنے آجانے کے بعد اسے چھوڑ کر نماز پڑھنا مکروہ اس لیے ہے؛ کیونکہ اس وقت قلب کھانے کی طرف مشغول رہے گا اور خشوع وخضوع فوت ہو جائے گا اور کھانا چھوڑ کر نماز پڑھنا مکروہ اس وقت ہو گا جب وقت میں گنجائش ہو، پس اگر وقت تنگ ہو کہ کھانے سے فارغ ہونے تک وقتِ صلاۃ نکل جائے گا تو نماز کو مؤخر کرنا جائز نہیں ہے۔

اور حنفیہ کے نزدیک وقت تنگ ہو یا کشادہ پہلے کھانے سے فارغ ہو جائے؛ کیونکہ نماز کی اصل اور روح خشوع اور خضوع ہے، جب وہی باقی نہ رہے تو وہ نماز بے معنیٰ ہے۔
اور امام مالکؒ فرماتے ہیں: اگر کھانا ہلکا ہو تو پہلے کھانا کھالے، پھر نماز پڑھے اور اس میں بہت دیر لگ جائے تو پہلے نماز پڑھ لینی چاہیے۔ (عمدۃ القاری: ۵ باب الاذان)

خلاصہ: مبتلا بہ کو خود فیصلہ کر لینا چاہیے کہ اگر اسے کھانے کی شدت اشتیاق ہو تو پہلے کھانا کھالے اور پھر نماز پڑھ لے اور اگر یہ محسوس ہو نماز پڑھنے تک کھانے کو مؤخر کرنے میں اشتغالِ قلب بالطعام نہ ہوگا تو نماز پڑھ لینا بہتر ہے۔

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَبَّاسٍ عَنْ مَيْمُوْنَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُئِلَ عَنِ الْفَارَةِ تَقَعُ فِي السَّمْنِ فَقَالَ اَنْزِعُوْهَا وَمَا حَوْلَهَا فَاطْرَحُوْهُ.

ترجمہ: اُمّ المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس چوہے کے بارے میں معلوم کیا گیا جو گھی میں گر جائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس چوہے اور اس کے اِردگرد کے گھی کو نکال کے پھینک دو۔

تشریح: ابنِ بطالؒ نے شرح بخاری میں فرمایا کہ علماء کا اس میں اتفاق ہے کہ مذکورہ حکم جمے ہوئے گھی کے بارے میں ہے کہ اگر اس میں چوہا گر جائے تو چوہے کو اور اس

کے اِردگرد کے گھی کو پھینک دیا جائے اور بقیہ کو استعمال کرلیا جائے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مردار کو حرام اور ناپاک قرار دیا ہے اور چونکہ گھی جما ہوا ہے؛ اس لیے اس کا اثر ایک محدود دائرہ تک ہوگا، لہٰذا نجاست اور مجاورِ نجاست کا حکم دیا گیا اور بقیہ میں اثر نجاست کے نہ پائے جانے کی وجہ سے اسے کھانے کی اجازت ہے۔

اور ایسا گھی تیل اور اسی قبیل کی دیگر سیال چیزیں جو جمی ہوئی نہ ہوں اگر ان میں مردار گر جائے تو اس کے نہ کھانے کے بارے میں بھی تمام علماء کا اتفاق ہے۔

البتہ کھانے کے علاوہ کسی اور طریقہ سے اس سے انتفاع جائز ہے یا نہیں؟ اس بارے میں اختلاف ہے۔

ایک جماعت کہتی ہے کہ مذکورہ اشیاء سے کسی بھی قسم کا انتفاع جائز نہیں ہے، یہ قول حسن بن صالح اور احمد بن حنبلؒ کا ہے، ان کی دلیل حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "فإن كان مائعا فلا تقربوه" یعنی گھی وغیرہ اگر سیال ہو تو اس کے قریب بھی مت جاؤ، گو نفی عام ہے۔

اور ایک دوسری روایت سے بھی انہوں نے استدلال کیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لعن الله اليهود، حرمت عليهم الشحوم فباعوها، وأكلوا ثمنها" یعنی یہود کو چربی کھانے سے منع کیا گیا تھا؛ لیکن حیلہ بازی کرتے ہوئے اسے بیچ کر اس کی آمدنی کو استعمال کیا، ان کے اس عمل سے اللہ کے نبی نے ان پر لعنت بھیجی، یہی معاملہ ناپاک گھی اور تیل کا ہے یعنی جس طرح اس کا کھانا ناجائز ہے، اسی طرح اس کا بیچنا بھی موجبِ لعنت ہے۔

دوسری جماعت جس میں امام مالکؒ، شافعیؒ اور سفیان ثوریؒ وغیرہ ہیں فرماتے ہیں: اس طرح کے تیل و گھی سے چراغ جلانا اور صابن وغیرہ میں استعمال کرنا جائز ہے؛ لیکن بیع جائز نہیں، ان حضرات کا استدلال حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وإن كان مائعا فاستصبحوا به"

اور متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم کا بھی یہی فتویٰ ہے: ''وقد روي عن علي بن طالب وابن عمر وعمران بن حصين رضي الله عنهم أنهم أجازوا الاستصباح به''

نیز ان حضرات کا کہنا ہے کہ بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن سے انتفاع جائز ہے؛ لیکن ان کی بیع جائز نہیں ہے۔

اور امام ابوحنیفہؒ، فقیہ ابواللیثؒ اور صحابہ میں سے ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ، اسی طرح سالمؒ اور قاسمؒ ان سب حضرات نے ایسے تیل اور گھی کے بارے میں چراغ اور صابن میں استعمال کے ساتھ ساتھ بیع کی بھی اجازت دی ہے، بشرطیکہ بوقتِ بیع اس کی وضاحت کردی جائے۔

ان کی دلیل حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مذکورہ روایت ہے جس میں ''فاستصبحوا'' کے بعد ''انتفعوا'' کا اضافہ بھی ہے اور خرید و فروخت انتفاع کے قبیل سے ہے۔

اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث ہے: ''أباح رسول الله صلى الله عليه وسلم في السمن تقع فيه الميتة الانتفاع به''.

لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ اُکل و شرب کے علاوہ ہر قسم کا نفع اس سے اٹھانا جائز ہے۔

وقد روي عن أبي موسى الأشعري، قال: لاتأكلوه وبيعوه، وبينو لمن تبيعونه منه.

وعن خالد بن أبي عمران أنه قال، سألت القاسم وسالماً عن الزيت تموت فيه الفارة، هل يصلح أن يؤكل منه؟ فقالا: لا! قلت أفيبيعه؟ فقالا: نعم! ثم كلوا ثمنه وبينوا لمن يشتريه.

اور حنفیہؒ کی طرف سے فریقِ اوّل کی روایت کا جواب یہ ہے کہ: ''لاتقربوه'' سے مراد ''لاتقربوه أكلا'' ہے۔

اور یہود پر چربی کے بیچنے کی وجہ سے جو لعنت ہے وہ اس لیے ہے؛ کیونکہ یہود کے لیے شحم کو اللہ نے بالذات حرام قرار دیا تھا اور یہاں تیل اور گھی وغیرہ کا عین حرام نہیں؛ بلکہ مردار کی مجاورت کی وجہ سے اس کو نجس قرار دیا گیا۔ہے؛ ورنہ حقیقتاً وہ قابلِ انتفاع ہے۔

اور فریقِ ثانی نے جو حدیث پیش کی ہے وہ ہمارے خلاف نہیں؛ کیونکہ اس میں انتفاع کی ایک نوع کا ذکر ہے اور بھی اقسام ہو سکتی ہیں۔

(عمدۃ القاری: ۳، تمہید: ۱۰/۳۹، مبسوط: ۱۰/۱۹۸، شرح ابن بطال)

مَا يُتَّقَىٰ مِنَ الشُّؤْمِ

(بدفالی سے بچنے کا بیان)

شُؤْمٌ: بضم الشين وبعده الهمزة كما قال الطيبي واوه همزة خففت فصارت واواً.

لغة: الشر: ورجل مشئوم أي غير مبارك، وتشاؤم القوم به مثل تطيروا.

شؤم کا مطلب ہے بدشگونی لینا، اس کی حقیقت یہ ہے کہ کسی کا نام سن کر یا کسی وقت، مہینہ اور دن سے یا پھر کسی ناپسندیدہ انسان یا جانور کو دیکھ کر یا مبغوض اشیاء کو دیکھ کر انسان نامبارک کلمات کہے یا اپنے ذہن کو کسی بُری خبر یا بُرے حادثہ کے لیے تیار کرلے، اس کو بدشگونی کہتے ہیں، حدیث میں اس کو طیرہ بھی کہا گیا ہے؛ کیونکہ جاہلیت میں طریقہ یہ تھا کہ جب اہلِ عرب کسی کام کے لیے نکلتے، تو ایک پرندہ اُڑاتے، اگر وہ دائیں جانب جاتا تو اس کو خیر سمجھ کر اس کام کی ابتدا کردیتے، اور اگر بائیں سمت اُڑتا تو اس کو نامناسب سمجھ کر کام کو ترک کردیتے تھے۔

اس کے برخلاف کسی اچھے نام کو سن کر یا کسی بابرکت شئ کو دیکھ کر دل میں اچھا خیال لینا نیک فالی ہے۔

شریعت کے اندر نیک فالی محمود و مستحسن ہے جب کہ بدفالی مذموم ہے؛ بلکہ اگر اشیاء مبغوضہ کو اگر مؤثر بالذات مان لیا جائے تو بات شرک تک پہنچ جاتی ہے۔

کیونکہ نیک فالی میں اطمینان اور خوشی میسر ہوتی ہے، اللہ کے رحم وکرم کی امید پیدا ہوتی ہے اور اس طرح کے خیالات بہرحال بہتر ہیں، جب کہ بدشگونی میں رنج و تردد وتذبذب کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور اللہ کی رحمت سے مایوسی پیدا ہوتی ہے، یہ چیزیں ظاہر ہیں شریعت کی رو سے ناپسندیدہ اور ممنوع ہیں۔

چونکہ جاہلیت کے زمانہ میں بدشگونی کافی حد تک پھیلی ہوئی اور لوگوں کے اعتقاد طرح طرح کی چیزوں سے جڑے ہوئے تھے؛ اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا سدِّ باب فرمایا اور اس بات کی تعلیم دی کہ مؤثر بالذات صرف اللہ کی ذات ہے، امام مالکؒ نے اسی تعلیم سے متعلق احادیث کو اس باب میں جمع کیا ہے۔

عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ السَّاعِدِيِّ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنْ كَانَ فَفِي الْفَرَسِ وَالْمَرْأَةِ وَالْمَسْكَنِ يَعْنِي الشُّؤْمَ.

ترجمہ: حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ اگر نحوست ہوتی تو گھوڑے، عورت اور گھر میں ہوتی۔

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الشُّؤْمُ فِي الدَّارِ وَالْمَرْأَةِ وَالْفَرَسِ.

ترجمہ: عبداللہ ابنِ عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نحوست گھر میں، عورت میں اور گھوڑے میں ہوتی ہے۔

عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيْدٍ أَنَّهُ قَالَ جَاءَتِ امْرَأَةٌ إِلٰى رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللهِ دَارٌ سَكَنَّهَا وَالْعَدَدُ كَثِيْرٌ وَالْمَالُ وَافِرٌ فَقَلَّ الْعَدَدُ وَذَهَبَ الْمَالُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَعُوْهَا ذَمِيْمَةً.

ترجمہ: یحیٰ ابن سعید انصاریؒ فرماتے ہیں کہ ایک عورت خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئی اور اس نے عرض کیا: ایک گھر ہے جس میں ہم نے سکونت اختیار کی اس حال میں کہ افراد بہت اور مال بڑی مقدار میں تھا (اس گھر میں آنے کے بعد) افراد کم ہو گئے

اور مال ختم ہوگیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس مذموم گھر کو چھوڑ دو۔

تشریح: ترمذی، ابوداؤد اور ابنِ ماجہ وغیرہ کی حدیث میں بدفالی کی مطلقاً ممانعت آئی ہے؛ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''لاعدویٰ ولاطیرۃ'' اور ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''الطیرۃ شرك''

لیکن یہاں اعتراض یہ ہوتا ہے کہ امام مالکؒ نے اس باب جن حدیثوں کو ذکر فرمایا ہے، اسی طرح امام بخاریؒ نے ان حدیثوں کی تخریج کی ہے ان میں تین چیزوں میں نحوست کے موجود ہونے کی بات ذکر کی گئی ہے جو کہ ان احادیث سے تعارض ہے جن میں نحوست و بدفالی کی مطلق نفی کی گئی، کیا حقیقتاً تین چیزوں میں نحوست ہوتی ہے؟ اس صورت میں تعارض کا جواب کیا ہوگا؟ اور اگر نہیں تو ان کی توجیہ کیا ہے؟

محدثین نے فرمایا ہے کہ امام مالکؒ اور ابنِ قتیبہؒ نے ان کو ظاہر پر محمول کیا ہے؛ چنانچہ ابنِ قتیبہؒ فرماتے ہیں کہ ان تین چیزوں میں نحوست کی وجہ یہ ہے کہ اہلِ جاہلیت فال کے لیے پرندے اُڑاتے تھے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے منع کیا، اور ان کو بتلایا کہ بدشگونی کوئی چیز نہیں ہوتی؛ لیکن جب وہ نہ رکے تو ان چیزوں میں باقی چھوڑ دی گئی۔

علامہ قرطبیؒ نے فرمایا کہ اگرچہ ان حضرات نے مذکورہ احادیث کو ظاہر پر محمول کیا ہے؛ لیکن یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ ان کا اعتقاد جاہلیت کے مانند ہرگز نہیں ہوسکتا؛ بلکہ ان کی مراد یہ ہے کہ اللہ مسبب الاسباب ہیں اور بعض اشیاء میں نفع وضرر کی تاثیر پیدا فرمادیتے ہیں۔

اور بقیہ علماء نے ان احادیث کو ظاہر پر محمول نہ کرکے ان کی مختلف توجیہات کی ہیں؛ چنانچہ علامہ باجیؒ فرماتے ہیں کہ حدیث میں بطورِ فرض فرمایا گیا ہے کہ اگر کسی چیز میں نحوست ہوتی تو ان تینوں چیزوں میں ہوتی، اسی کو قاضی عیاضؒ نے اختیار فرمایا ہے، اگر نحوست کا وجود ہوتا تو مذکورہ تینوں اشیاء میں ہوتا؛ کیونکہ عورت، گھوڑا اور گھر سب سے زیادہ نحوست قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں؛ لیکن نحوست کا وجود ہی نہیں ہے، یہی بات امام

طحاویؒ نے ذکر کی ہے، علامہ مازریؒ کہتے ہیں کہ اگر بدشگونی کی کوئی حقیقت ہوتی تو ان تینوں چیزوں میں ہوتی؛ کیونکہ لوگوں کے دلوں میں بدشگونی کا خیال ان چیزوں کی طرف سے زیادہ آتا ہے، نیز خاص طور پر انہیں تین چیزوں کو ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان سے انسان کا تعلق قریبی ہے۔

اور حافظؒ نے ''فتح'' میں فرمایا کہ اس بات کا بھی امکان ہے کہ شؤم کو یہاں عدمِ موافقت اور سوءِ طبع پر محمول کرلیا جائے، یعنی ان تینوں چیزوں کے اندر مزاولت دوامی ہوتی ہے اور یہ موافق آجائیں تو زہے قسمت اور اگر ناموافق ہوجائیں تو پریشانی کا سبب ہوجاتی ہیں۔

حضرت گنگوہیؒ نے ''کوکب'' میں فرمایا کہ شؤم کے دو معنیٰ ہوسکتے ہیں: (۱) نحوستِ مطلقہ (۲) طبیعت کے ناموافق شیٔ؛ پس جن حدیثوں میں بطورِ نفی کہا گیا وہاں نحوست مطلقہ مراد ہوگی، اور جن احادیث شؤم کو بطورِ اثبات ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد طبیعت کے ناموافق اور پریشان کن شیٔ مراد ہوگی۔

مذکورہ تینوں چیزوں میں نحوست کی کیفیت:

گھر کا منحوس ہونا، اس کا تنگ ہونا، صحن کا تنگ ہونا اور پڑوسیوں کا بداخلاق ہونا ہے اور عورت کا منحوس ہونا اس کا بددین وفاسق ہونا، بدخلق ہونا، بانجھ ہونا اور سواری کی نحوست اس کا اپنی پشت پر سوار نہ ہونے دینا، اس کا بدکنا وغیرہ۔

اب یہاں یہ اشکال ہوتا ہے کہ باب کی آخری حدیث میں ہے کہ ایک عورت نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے گھر کے منحوس ہونے کے بارے میں شکایت کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو گھر تبدیل کرنے کا حکم کیوں دیا؟ جبکہ حقیقتاً کسی چیز میں نحوست سرایت ہی نہیں کرتی ہے؟ نیز اس گھر کو مذموم کیوں قرار دیا؟ شارحین نے اس کے مختلف جوابات دیے ہیں:

علامہ ابنِ عبدالبرؒ نے فرمایا کہ: جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ وہ گھر کی بُرائی کر رہی ہے، اور ناپسندیدہ سمجھ رہی ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے وہاں سے منتقل ہونے کا حکم دیا؛ تاکہ کوئی بدشگونی اس کے دل میں نہ بیٹھ جائے۔

اور محلی میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ نے تحویلِ مکانی کا حکم اس لیے فرمایا؛ تاکہ اس کے دل سے وہ زعم باطل دُور ہو جائے کہ یہ مصیبت گھر کی وجہ سے آئی ہے، جب جگہ تبدیل ہو جائے گی تو اس طرح کے خیالات خود بخود زائل ہو جائیں گے۔

علامہ ابنِ العربیؒ نے فرمایا: اللہ کی جانب سے لوگوں کی موت اور مال کے ختم ہو جانے کا فیصلہ اسی وقت اور اسی گھر میں تھا، اور اہلِ خانہ نے اسے نحوست سمجھ لیا؛ اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں تحویل مکانی کا حکم دیا؛ تاکہ کوئی غلط عقیدہ ان کے دل میں نہ جم جائے۔

شیخ الحدیثؒ فرماتے ہیں: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نقلِ مکانی کا حکم فسادِ موسم، تنگی یا کسی اور وجہ سے دیا تھا؛ اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''ذمیمہ'' یعنی اس کو مذموم کہا اور ان چیزوں کا بدشگون سے کوئی تعلق نہیں، اسی کو شیخ نے بذل میں ذکر فرمایا ہے۔

(اوجز: ۱۷/۳۲۹-۳۳۰، المنتقی)

مَا يُكْرَهُ مِنَ الْأَسْمَاءِ

(ناپسندیدہ ناموں کا بیان)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اچھے معنیٰ والے ناموں کو پسند فرماتے تھے، اور بُرے معنیٰ والے ناموں کو ناپسند فرماتے تھے اور کبھی کبھار عملاً ایسے ناموں کو تبدیل بھی فرما دیا کرتے تھے، اور قولاً بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اچھے اسماء رکھنے کی تاکید فرماتے تھے؛ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''إنكم تدعون يوم القيامة باسمائكم واسماء آبائكم، فأحسنوا اسماءكم''. (ابوداؤد)

علامہ طبریؒ فرماتے ہیں: والدین کو بچہ کا ایسا نام نہیں رکھنا چاہیے جس میں تزکیۂ نفس کے معنیٰ ہوں؛ کیونکہ قرآن میں اس کو منع فرمایا گیا﴿فَلَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ﴾ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس طرح کے ناموں سے منع فرمایا ہے، اسی طرح ایسے ناموں کا انتخاب نہیں کرنا چاہیے، جس کے معنیٰ قبیح ہوں جس کے معنیٰ میں شب وشتم ہو، اور سننے میں کریہہ معلوم ہوں؛ کیونکہ اگرچہ نام رکھنے کا مقصد صرف لوگوں کو پہچاننا ہے، اصل صفت اس سے مراد نہیں ہوتی؛ لیکن جب کوئی سننے والا کسی نام کو سنتا ہے تو خیال ہوتا ہے کہ یہ مسمّٰی کی صفت ہے؛ اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ شریفہ تھی جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی سے اس کا نام پوچھتے اور اس کے نام کے معنیٰ اچھے ہوتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہوتے تھے اور اس سے نیک فالی لیتے تھے اور جب کوئی قبیح المعنیٰ بتاتا تو ناپسند فرماتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے نام کو کسی اچھے نام میں تبدیل فرمادیا کرتے تھے؛ لیکن یہ ایک حکم اختیاری ہے نہ کہ امرِ شرعی جس کا ماننا لازم اور ضروری ہو؛ چنانچہ سعید ابن مسیّب کے دادا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نام معلوم کیا، انہوں نے بتایا ''حزن'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارا نام سہیل ہے؛ لیکن انہوں نے جواب دیا میں اپنے آباء واجداد کا رکھا ہوا نام تبدیل نہیں کروں گا؟ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کچھ نہیں کہا اور نہ کوئی نکیر فرمائی۔

اشکال: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدشگونی سے منع فرمایا ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود کیوں بُرے ناموں کو ناپسند فرماتے اور ان کو بدل دیتے تھے؟

جواب: علامہ باجیؒ فرماتے ہیں: کراہت اسماء میں اور بدشگونی میں فرق ہے؛ کیونکہ بدفالی الفاظ وغیرہ میں نہیں ہوتی؛ بلکہ زمانۂ جاہلیت میں بدشگونی یہ تھی کہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ اگر خاص طریقہ سے اس سے ملوں گا تو بُرا ہوجائے گا، میرے سامنے کوئی چیز آجائے تو بدشگون ہوجائے گا جبکہ کراہت اسماء میں یہ بات نہیں ہے؛ بلکہ ان کی

ناپسندیدگی ان کو ذکر کرنے اور سننے میں کراہت کی وجہ سے ہے، مثلاً ایک نام حرب ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ یہ شخص جہاں بھی جائے گا وہاں جھگڑے اور فساد ہوں گے؛ بلکہ یہ نام معنیٰ اور سننے میں عجیب اور کریہہ معلوم ہوتا ہے، واللہ اعلم۔ (المنتقی)

عَنْ يَحْيَى ابْنِ سَعِيْدٍ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِلَقْحَةٍ تُحْلَبُ مَنْ يَحْلِبُ هٰذِهِ فَقَامَ رَجُلٌ فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا اسْمُكَ فَقَالَ الرَّجُلُ مُرَّةُ فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اجْلِسْ ثُمَّ قَالَ مَنْ يَحْلِبُ هٰذِهِ فَقَامَ رَجُلٌ فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا اسْمُكَ؟ فَقَالَ لَهُ حَرْبٌ. فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اجْلِسْ ثُمَّ قَالَ مَنْ يُحْلِبُ هٰذِهِ فَقَامَ رَجُلٌ فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا اسْمُكَ قَالَ يَعِيْشُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ احْلِبْ.

ترجمہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اونٹنی کے بارے میں فرمایا: اس کو دوہا جائے گا تو اس کا دودھ کون دوہے گا؛ چنانچہ ایک شخص کھڑا ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے معلوم کیا تمہارا نام کیا ہے؟ تو اس نے جواب دیا میرا نام مرہ ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا: تم بیٹھ جاؤ، دوسری مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس اونٹنی کو کون دوہے گا؟ پھر ایک شخص کھڑا ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے بھی معلوم کیا تمہارا نام کیا ہے؟ اس نے جواب دیا: حرب، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم بھی بیٹھ جاؤ، پھر تیسری مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ نے فرمایا: اس کو کون دوہے گا؟ پھر ایک شخص کھڑا ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے نام پوچھا، اس نے جواب دیا میرا نام یعیش ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم دوہو۔

تشریح: اس واقعہ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا: آپ ہمیں بدشگونی سے روکتے ہیں، تو آپ خود بدفالی لے رہے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

میں بدفالی نہیں لے رہا؛ بلکہ میں اچھے نام والوں کو ترجیح دیتا ہوں یعنی پہلے دو ناموں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی بدشگونی نہیں لی تھی؛ بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ تلاش کر رہے تھے کہ کوئی اچھے نام والا مل جائے اور پھر ایسا ہی ہوا۔

لغات: مُرَّةٌ ضد الحلو: کڑوا۔ حرب: لڑائی۔ یعیش: مضارع عیشًا: اچھی زندگی گزارنا، یہاں مضارع بطور علم ہے۔

عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيْدٍ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَالَ لِرَجُلٍ مَّا اسْمُكَ فَقَالَ جَمْرَةُ قَالَ ابْنُ مَنْ قَالَ ابْنُ شِهَابٍ قَالَ مِمَّنْ قَالَ مِنَ الْحُرْقَةِ قَالَ أَيْنَ مَسْكَنُكَ قَالَ بِحَرَّةِ النَّارِ قَالَ بِأَيِّهَا قَالَ بِذَاتِ لَظًى قَالَ عُمَرُ أَدْرِكْ أَهْلَكَ فَقَدِ احْتَرَقُوْا قَالَ فَكَانَ كَمَا قَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ.

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص سے معلوم کیا تمہارا نام کیا ہے؟ اس نے کہا: جمرہ (چنگاری) پھر پوچھا کس کے بیٹے ہو؟ اس نے کہا: شہاب (شعلہ) کا، پھر پوچھا کس قبیلہ سے ہو؟ اس نے کہا حُرَقہ (آگ) سے اور معلوم کیا تمہاری رہائش کہاں ہے؟ اس نے کہا حرہ نار میں مزید معلوم کیا وہ کہاں پڑتا ہے؟ اس نے کہا ذاتِ لظی میں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے فرمایا: اپنے گھر والوں سے مل وہ جل چکے ہوں گے۔ راوی کہتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جیسا فرمایا ویسا ہی ہوا۔

تشریح: جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی مکمل شناخت معلوم کی اور اس نے ہر چیز کا تعلق اشیاءِ حارہ سے جوڑ دیا تو حضرت نے فرمایا: میرے خیال ہے کہ تو اپنے گھر کو دیکھ، وہاں سب جل چکے ہوں گے، حضرت کا یہ فرمانا بطورِ بدفالی نہیں؛ بلکہ انہوں نے ویسے ہی ایک بات ارشاد فرمائی کہ جس کا نام، ولدیت، قبیلہ، مقام سب اشیاءِ آتش زنی پر مشتمل ہوں تو وہ صرف جل ہی سکتے ہیں؛ لیکن یہ بات الگ ہے کہ وہ اپنے اہل میں لوٹا تو سب کچھ آگ کی نظر ہو چکا تھا؛ کیونکہ بعض مرتبہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی زبان سے وہ بات کہلوا دیتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ مقدر فرما چکے ہوتے ہیں۔

مَا جَاءَ فِي الْحِجَامَةِ وَأُجْرَةِ الْحَجَّامِ

(پچھنا لگوانے اور حجام کے اُجرت لینے کا بیان)

حدیث پاک میں پچھنا لگانے کی بڑی اہمیت وفضیلت بیان کی گئی ہے؛ کیونکہ اس سے وہ فاسد خون نکل جاتا ہے جس کی وجہ سے بہت زیادہ امراض پیدا ہوتے ہیں جن کو امراضِ دموی کہا جاتا ہے، امراضِ دموی کا سب سے بڑا علاج خون نکلوانا ہے، نیز خون نکلوانے کے دوسرے طریقوں کے مقابلہ کی بہ نسبت حجامہ کو زیادہ پسند اس لیے کیا گیا ہے کہ وہ خون کو نواحئ جلد سے خارج کردیتا ہے؛ چنانچہ اطباء اس بات کے قائل ہیں کہ گرم آب وہوا میں رہنے والوں کو فصد کے مقابلہ میں پچھنے لگوانا زیادہ مفید ہوتا ہے، تاہم حجامہ لگوانے سے پہلے موسم، بیماری، ایام، آب وہوا سب کا خیال رکھ کر، پچھنا لگوانا چاہیے، بسا اوقات مذکورہ چیزوں کی عدمِ موافقت کی وجہ سے فائدہ کی جگہ نقصان اٹھانا پڑتا ہے؛ چنانچہ ایسے واقعات بھی موجود ہیں کہ پچھنا لگوانے سے قوتِ حافظہ ختم ہوگئی؛ اسی لیے حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجامہ کے ایام کی نشاندہی فرمائی ہے؛ چنانچہ آپ ۱۷، ۱۹ یا ۲۱ر تاریخ میں پچھنا لگواتے تھے، اس کی حکمت یہ ہے کہ ان تاریخوں میں خون جوش مارتا ہے۔

اجرۃ الحجام:

اجرۃ الحجام کے بارے میں فقہاء کے درمیان کچھ اختلاف ہے۔

ائمہ ثلاثہؒ اور ایک روایت کے مطابق امام احمدؒ اس کو حلال کہتے ہیں، ان حضرات کی دلیل باب میں مذکور حدیث ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوطیبہ سے پچھنا لگوایا اور اسے اُجرت دی، اس سے معلوم ہوا حجام کے لیے اُجرت لینا جائز ہے؛ کیونکہ قاعدہ ہے: ”ما أخذ حرامه أعطی حرامه“ یعنی جس چیز کا لینا حرام ہے اس کا دینا بھی حرام ہے۔

لیکن مسلم شریف کی ایک حدیث میں ہے: "قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ثمن الكلب خبيث، ومهر البغي خبيث، وكسب الحجام خبيث" یعنی حدیث میں اجرۃ الحجام کو خبیث قرار دیا گیا ہے جس سے مستفاد ہوتا ہے کہ اجرۃ الحجام حرام ہے۔

(۱) چنانچہ امام احمدؒ اور ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ حجام اگر آزاد شخص ہو تو اس کے لیے حجامت کا پیشہ اختیار کرنا مکروہ ہے اور اس پر ملنے والی اجرت کو اپنی ذات پر خرچ کرنا حرام ہے؛ البتہ غلاموں اور جانوروں پر خرچ کرسکتا ہے اور غلام کے لیے مطلقاً جائز ہے اور ان کا یہ موقف اس وجہ سے ہے؛ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس کو اجرت دی تھی وہ غلام تھے۔

(۲) امام طحاویؒ اور کچھ دوسرے علماء کا خیال یہ ہے کہ پہلے حرام تھی، پھر اس کا حکم منسوخ ہوگیا۔

(۳) ابن جوزیؒ نے فرمایا: اُجرتِ حجام کے مکروہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ: یہ ان چیزوں میں سے ہے جس کو ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے لیے بلا اجرت اخلاقاً انجام دینا چاہیے۔

(۴) علامہ خطابیؒ فرماتے ہیں کہ: اصلاً اجرت الحجام جائز ہے اور حدیث میں جو خبیث کہا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں دناءت ہے، گویا یہ ترغیب دی گئی ہے کہ ایک مسلم کو دنی اور خبیث پیشہ اختیار نہ کر کے ایسا ذریعۂ معاش تلاش کرنا چاہیے جو افضل اور بہتر ہو؛ کیونکہ دنیا میں حلال پیشے ہر قسم کے ہیں، ادنیٰ بھی اعلیٰ بھی، لہٰذا ایک مؤمن کی صفت یہ ہونی چاہیے کہ ایسے کام کو ذریعۂ معاش بنائے جس میں انسان عزت کے ساتھ زندگی گزار سکے۔

(۵) علامہ آبیؒ نے فرمایا کہ ممانعت ایک خاص طریقۂ حجامہ میں ملنے والی اجرت کی ہے جو جاہلیت میں رائج تھی کہ لوگ جانوروں کے فصد لگاتے تھے اور اس سے جو خون نکلتا

تھا اسے جمع کر کے بیچتے تھے؛ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجرت کو خبیث قرار دیا ہے۔

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّهُ قَالَ احْتَجَمَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَجَمَهُ أَبُوطَيْبَةَ فَأَمَرَ لَهُ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِصَاعٍ مِنْ تَمْرٍ وَأَمَرَ أَهْلَهُ أَنْ يُخَفِّفُوْا عَنْهُ مِنْ خَرَاجِهِ.

ترجمہ: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پچھنا لگوایا (چنانچہ) ابوطیبہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پچھنا لگایا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ایک صاع کھجور دینے کا حکم دیا، اور اس کے گھر والوں (یعنی جن کا وہ غلام تھا) کو حکم دیا کہ اس سے اس کا خراج کم کر دیں۔

تشریح: احتجم رسول الله صلى الله عليه وسلم: محلی میں مذکور ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پچھنا سترہ رمضان کو عصر کے بعد لگوایا تھا۔ علامہ زرقانیؒ فرماتے ہیں: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پچھنا کسی عضو میں تکلیف کی وجہ سے لگوایا تھا اور ایک روایت میں ہے کہ دردِ سر کی وجہ سے لگوایا تھا۔

حجمه أبوالطيبة: حافظ ابنِ حجرؒ نے ابوطیبہ کا نام نافع ذکر کیا اور فرمایا: علامہ باجیؒ سے ان کا نام دینار بتانے میں وہم ہو گیا ہے؛ چنانچہ امام احمدؒ اور طبرانیؒ نے ایک روایت محیصہ بن مسعود کے بارے میں بیان کی ہے: "كان له غلام حجام يقال له نافع أبوطيبة، فأنطلق إلى النبي صلى الله عليه وسلم يسأله عن خراجه".

فأمر له برسول الله صلى الله عليه وسلم بصاع من تمر: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوطیبہ کو بطورِ اُجرت حجامہ ایک صاع کھجور دینے کا حکم فرمایا اور بعض روایتوں میں ایک صاع یا دو صاع شک کے ساتھ منقول ہے۔

وأمر النبي أهله أن يخففوا من خراجه: ابوطیبہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے خراج کے بارے میں بات کی تھی، کہ میرے آقا مجھ سے زیادہ خراج لیتے ہیں،

مصنف ابنِ ابی شیبہ میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: تمہارا اخراج کتنا ہے؟ انہوں نے کہا: دو صاع، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے موالی سے ایک صاع کم کرنے کو کہا اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ ان کا خراج تین صاع تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کم کرا دیا۔

خراج بفتح الخاء: رقم یا کمائی کی وہ مقدار جو آقا اپنے غلام پر لازم کرتا ہے کہ تجھے ہر دن یا ہر مہینہ اتنے اتنے دینے ہیں۔

مَالِكٌ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: إِنْ كَانَ دَوَاءٌ يَبْلُغُ الدَّاءَ فَإِنَّ الْحِجَامَةَ تَبْلُغُهُ.

ترجمہ: امام مالکؒ کو یہ بات پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر کوئی دوا بیماری کو پہنچتی ہے (یعنی لگتی ہے) تو حجامہ پہنچتا ہے۔

تشریح: یہ روایت امام مالکؒ کے بلاغات میں سے ہے، اس کا مقصد پچھنا لگوانے کی اہمیت اور فضیلت اور دموی بیماری کے ختم کرنے میں اس کے مفید ہونے کو بتانا ہے، ایک دوسری حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”أن خير ماتداويتم به الحجامة“

اکثر محدثین کی رائے یہ ہے کہ یہ تاکیدی حکم اہلِ حجاز کے لیے ہے؛ کیونکہ ان لوگوں کا خون رقیق ہوتا ہے جس میں پچھنا لگوانا بہت مفید ہے۔

عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنِ ابْنِ مُحَيِّصَةَ الْأَنْصَارِيِّ أَحَدِ بَنِيْ حَارِثَةَ أَنَّهُ اسْتَأْذَنَ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ إِجَارَةِ الْحَجَّامِ فَنَهَاهُ عَنْهَا فَلَمْ يَزَلْ يَسْأَلُهُ وَيَسْتَأْذِنُهُ حَتّٰى قَالَ: اعْلِفْهُ نَاضِحَكَ يَعْنِيْ رَقِيقَكَ.

ترجمہ: ابن محیصہ انصاری حارثی رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پچھنا لگوانے کی اُجرت لینے کے بارے میں اجازت طلب کی، آپ صلی اللہ علیہ نے منع فرمایا، وہ بار بار اصرار کرتے رہے اور اجازت طلب کرتے رہے، یہاں تک کہ آپ صلی

اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس اجرت کا اپنی اونٹنی کو چارہ کھلا دو اور اس کو یعنی غلام کو کھلا دو۔

تشریح: أنه استأذن أجارة الحجام: یعنی وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کر رہے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ مجھے حجامہ کی اُجرت لینے اور کھانے کی اجازت دے دیجیے، امام نوویؒ نے فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا منع فرمانا صرف اخلاقی طور پر تھا کہ تم اس کا پیشہ اختیات مت کرو؛ کیونکہ بسا اوقات سینگی لگاتے وقت منہ میں خون بھی آجاتا تھا؛ ورنہ کوئی ممنوع چیز بار بار درخواست کرنے پر حلال نہیں ہوسکتی۔

لیکن جب انہوں نے بار بار درخواست کی اور اپنی حاجتِ شدید کو رکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی؛ لیکن ساتھ میں یہ بھی فرمایا کہ جو اُجرت ملے تم خود مت کھانا؛ بلکہ اپنے اونٹوں اور غلاموں پر خرچ کردینا۔

علامہ باجیؒ فرماتے ہیں کہ پہلے آپ صلی اللہ علیہ نے منع فرمایا، پھر اجازت دے دی، اس سے معلوم ہوگیا کہ ممانعت کا حکم منسوخ ہوگیا۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اجازت اس لیے نہیں دے رہے تھے کہ قریش اس کو مکرم و معزز سمجھتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وہم کو دُور کرنے کے لیے منع فرمایا، یا پھر مخصوص وجہ سے منع فرمایا۔

لغت: ناضح: هو الحمل الذي يسقى به الماء.

يعني رقيقك: بعض نسخوں میں اس سے پہلے أطعمه کا اضافہ ہے۔

''الحمد الله الذي وفقني''

مصادر و مراجع

قرآنِ کریم	تفسیر معارف القرآن
فتح الباری	عمدۃ القاری
بذل المجہود	اوجز المسالک
شرح زرقانی	تحفۃ الالمعی
تحفۃ القاری	عون الترمذی
الموسوعۃ الفقہیہ	درمختار
ہدایہ	فتح القدیر
فتح الملہم	نفائس الفقہ